از تحقیقات وتعلیقات

الشیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ
الشیخ المحدث شعیب ارنؤوط حفظہ اللہ
الشیخ عبد الرزاق مہدی حفظہ اللہ
الشیخ مصطفیٰ السید محمد حفظہ اللہ
الشیخ محمد فضل عجماوی حفظہ اللہ
الشیخ حسن عباس قطب حفظہ اللہ
الشیخ محمد السید رشاد حفظہ اللہ
الشیخ علی احمد الباقی حفظہ اللہ
الشیخ زبیر علی زئی حفظہ اللہ
الشیخ مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ





عصر حاضر کی تقریباً تمام تحقیقات سے استفادہ شدہ

تفسیر ابن کثیر

6	5	4	3	2	1



تالیف
حافظ عماد الدین ابن کثیر الدمشقی رحمہ اللہ

ترجمہ
مولانا محمد جوناگڑھی رحمہ اللہ

اہتمام
تخریج وتحقیق
حافظ عمران ایوب لاہوری حفظہ اللہ

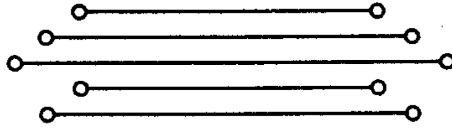


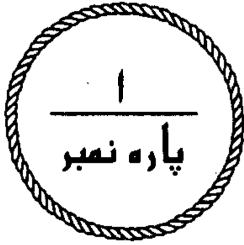
ناشر
فقہ الحدیث پبلیکیشنز
0300-4206199
Fiqh-ul-Hadith Publications Lahore Pakistan
E-mail: editor@fiqhulhadith.com, Website: www.fiqhulhadith.com



ڈسٹری بیوٹر
نعمانی کتب خانہ
042-7321865, 0334-4229127
Nomani Kutab Khana Lahore Pakistan
E-mail: nomania2000@hotmail.com, Web: www.nomanibooks.com

تفسیر ابن کثیر





چند اہم مضامین کی فہرست

حمد وثناء کے حقوق کا واحد مالک	۲۳	الحمد کا تعارف ومفہوم	۶۲
حجت تمام رسول اللہ ﷺ	۲۴	آمین اور سورۂ فاتحہ	۶۳
بیوپاری علماء کا حشر	۲۴	اس مبارک سورت کے فضائل کا بیان	۶۵
تفسیر کا بہترین طریقہ	۲۵	سات لمبی سورتوں کی فضیلت	۶۸
اہمیت حدیث	۲۵	حروف مقطعات اور ان کے معنی	۶۹
اپنی رائے اور تفسیر قرآن	۲۸	تحقیقات کتاب	۷۳
قرآن حکیم سے متعلق کچھ معلومات	۳۰	متقین کی تعریف	۷۴
آیت کے لفظی معنی	۳۱	ہدایت کی وضاحت	۷۴
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور مختلف اقوال اور سورۂ فاتحہ	۳۳	ایمان کی تعریف	۷۵
سورۂ فاتحہ کی فضیلت	۳۴	قیام صلوٰۃ کیا ہے؟	۷۷
بسم اللہ با آواز بلند یا دبی آواز سے؟	۴۲	ہدایت یافتہ لوگ	۸۰
رسول اللہ ﷺ کا انداز قرات	۴۳	منافقت کی قسمیں	۸۳
فصل بسم اللہ کی فضیلت کا بیان	۴۴	شک وشبہ بیماری ہے	۸۵
اللہ نے اپنے تمام (صفاتی) نام خود تجویز فرمائے ہیں	۴۶	شک، کفر اور نفاق کیا ہے؟	۹۱
اللہ کے مترادف المعنی کوئی نام نہیں!	۴۶	منافقین کی ایک اور پہچان	۹۴
الرحمٰن اور الرحیم کے معنی	۴۸	تعارف الہ بزبان الہ	۹۷
الحمد للہ کی تفسیر	۵۰	اثبات وجود الہ العلمین	۹۹
حمد کی تفسیر اقوال سلف سے	۵۱	تصدیق نبوت اعجاز قرآن	۱۰۱
بہت بخشش کرنے والا بڑا مہربان!	۵۳	خلافت آدم کا مفہوم	۱۱۴
حقیقی وارث ومالک کون ہے؟	۵۴	خلیفہ کے فرائض اور خلافت کی نوعیت	۱۱۶
عبادت کا مفہوم	۵۵	تعارف ابلیس	۱۲۲
عبادت اور طلب	۵۶	اعزاز آدم علیہ السلام	۱۲۴
حصول مقصد کا بہترین طریقہ	۵۷	جنت کے حصول کی شرائط	۱۲۷
صراط مستقیم کیا ہے؟	۵۸	بنی اسرائیل سے خطاب	۱۲۷
انعام یافتہ کون؟	۶۰	دوغلا پن اور یہودی	۱۳۰
مغضوب کون؟	۶۰	مبلغین کے لئے خصوصی ہدایات	۱۳۰

• صبر کا مفہوم ١٣٢
• حشر کا منظر ١٣٤
• یہود پہ احسانات الٰہیہ کی تفصیل ١٤٠
• احسان فراموش یہود ١٤٤
• یہود کون ہیں؟ ١٤٦
• عہد شکن یہود ١٤٨
• حجت بازی کا انجام ١٥٣
• بلاوجہ تجسس موجب عتاب ہے ١٥٤
• یہودی کردار کا تجزیہ ١٥٦
• امی کا مفہوم اور ویل کے معنی ١٥٩
• اوس وخزرج اور دیگر قبائل کو دعوت اتحاد ١٦٣
• خود پسند یہودی مورد عتاب ١٦٨
• مباہلہ اور یہودی مع نصاریٰ ١٦٩
• خصومت جبرئیل علیہ السلام موجب کفر وعصیان ١٧٠
• سلیمان علیہ السلام جادوگر نہیں تھے ١٧٤
• جادو کی اقسام ١٨٢
• جادو اور شعر ١٨٥
• مسلمانو کافروں کی صورت لباس اور زبان میں مشابہت سے بچو! ١٨٧
• تبدیلی یا تنسیخ۔ اللہ تعالیٰ مختار کل ہے ١٨٨
• کثرت سوال حجت بازی کے مترادف ہے! ١٩٠
• قومی عصبیت باعث شقاوت ہے ١٩٢
• شیطان صفت مغرور یہودی ١٩٣
• نصاریٰ اور یہودی مکافات عمل کا شکار! ١٩٤
• کعبہ صرف علامت وحدت وسمت ہے اللہ کا جمال وجلال غیر محدود ہے ١٩٦
• اللہ ہی مقتدر اعلیٰ ہے کے دلائل ١٩٩
• طلب نظارہ۔ ایک حماقت ٢٠١
• آپ نصیحت کی حد تک مسئول ہیں ٢٠٢
• دین حق کا باطل سے سمجھوتہ جرم عظیم ہے ٢٠٣
• امام توحید ٢٠٥
• مکمل اسلام ٢٠٥
• شوق زیارت اور بڑھتا ہے ٢٠٧
• عہد جو مترادف حکم ہے ٢٠٩
• مدینہ منورہ افضل یا مکہ مکرمہ؟ ٢١١
• دعائے ابراہیم علیہ السلام کا ماحصل ٢٢١
• توحید کے دعوے اور مشرکین کا ذکر ٢٢٢
• ازلی اور ابدی مستحق عبادت اللہ وحدہ لاشریک ٢٢٤
• اہل کتاب کی تصدیق یا تکذیب! ٢٢٥
• شرط نجات ٢٢٦
• مشرکین کے اعمال سے بیزاری ٢٢٧

ہے اور جگہ ارشاد ہے ﴿وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا﴾ (الحجر/١٦) الخ یعنی ہم نے آسمان میں برج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لیے زینت دی اور اسے ہر راندے ہوئے شیطان سے ہم نے محفوظ کرلیا مگر جو کسی بات کو چرالے جائے اس کے پیچھے چمکتا ہوا شعلہ لگتا ہے۔ اسی طرح کی اور آیتیں بھی ہیں رجیم کے ایک معنی راجم کے بھی کیے گئے ہیں چونکہ شیطان لوگوں کو وسوسوں سے اور گمراہیوں سے رجم کرتا ہے اس لیے اسے رجیم یعنی راجم کہتے ہیں۔

اب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر پڑھیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والے مہربان کے نام سے شروع کرتا ہوں○

بسم اللہ کے متعلق کچھ تفصیل: صحابہ رضی اللہ عنہم نے اللہ کی کتاب کو اسی کے ساتھ شروع کیا۔ علماء کا اتفاق ہے کہ (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) سورۂ نمل کی ایک آیت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ وہ ہر سورت کے شروع میں خود مستقل آیت ہے؟ یا ہر سورت کی ایک مستقل آیت ہے جو اس کے شروع میں لکھی گئی ہے؟ یا ہر سورت کی آیت کا جزو ہے؟ یا صرف سورۂ فاتحہ ہی کی آیت ہے اور دوسری سورتوں کی نہیں؟ صرف ایک سورت کو دوسری سورت سے علیحدہ کرنے کے لیے لکھی گئی ہے؟ اور خود آیت نہیں ہے؟ علماء سلف اور خلف کا ان آراء میں اختلاف چلا آتا ہے اور اپنی جگہ پر اس کی تفصیل موجود ہے۔

سنن ابی داود میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سورتوں کی جدائی نہیں جانتے تھے جب تک آپ پر ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ نازل نہیں ہوتی تھی۔[1] یہ حدیث مستدرک حاکم میں بھی ہے[2] ایک مرسل حدیث میں یہ روایت حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ چنانچہ صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ الخ کو سورۂ فاتحہ کے شروع میں نماز میں پڑھا اور اسے ایک آیت شمار کیا[3] لیکن اس کے ایک راوی عمر بن ہارون بلخی ضعیف ہیں اسی مفہوم کی ایک روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[4] حضرت علی، حضرت ابن عباس،

---

[1] [**صحیح:** شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح الجامع الصغیر (٤٨٦٤)] مزید دیکھئے: ابو داؤد: کتاب الصلوة: باب من جهر بها (٧٨٨) بزار (٢١٨٧) مستدرك حاكم (٢٣١/١) طحاوى فى مشكل الاثار (١٣٧٦) عبد الرزاق (٢٦١٧) حميدى (٥٢٨) ابو نعيم فى اخبار اصبهان (٢٥٥/٢)] حافظ زبیر علی زئی نے بھی اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

[2] [مستدرك حاكم (٢٣١/١)]

[3] [**ضعیف:** ابن خزيمه (٤٩٣) دارقطنى (٣٠٧/١)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس میں عمر بن ہارون راوی ہے، امام ابن معین رحمہ اللہ نے اسے کذاب کہا ہے اور دیگر متعدد اہل علم نے اسے متروک اور ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے اس روایت کو سخت ضعیف کہا ہے۔]

[4] [دارقطنى (٣١٢/١، ٣١٣)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس روایت کی تمام اسناد ضعیف ہیں۔ حافظ زبیر علی زئی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم حضرت عطاؒ حضرت طاؤسؒ حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت مکحول اور حضرت زہری رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ بسم اللہ الخ ہر سورت کے آغاز میں ایک مستقل آیت ہے سوائے سورۂ برات کے۔ ان صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ امام شافعیؒ امام احمد کے ایک قول میںؒ اور اسحاق بن راہویہ اور ابوعبید قاسم بن سلام رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے البتہ امام مالک امام ابوحنیفہ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں۔ کہ بسم اللہ الخ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے نہ کسی اور سورت کی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ الخ سورۂ فاتحہ کی تو ایک آیت ہے لیکن کسی اور سورۃ کی نہیں۔ ایک قول ان کا یہ بھی ہے کہ ہر سورت کے اول کی آیت کا حصہ ہے لیکن یہ دونوں قول غریب ہیں۔ داود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ہر سورت کے اوّل میں ایک مستقل آیت ہے سورت میں داخل نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی یہی روایت ہے اور ابوبکر رازی رحمہ اللہ نے ابوحسن کرخی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب بیان کیا ہے۔ جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بڑے پایہ کے ساتھی تھے۔ یہ تو تھی بحث ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ کے سورۂ فاتحہ کی آیت ہونے یا نہ ہونے کی۔ (صحیح مذہب یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کہیں قرآن پاک میں یہ آیت شریفہ ہے وہاں مستقل آیت ہے۔ واللہ اعلم۔ مترجم)

بسم اللہ اونچی آواز سے یا آہستہ آواز سے؟: اب اس میں بھی اختلاف ہے کہ آیا اسے با آواز بلند پڑھنا چاہیے یا پست آواز سے؟ جو لوگ اسے سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں کہتے وہ تو اسے بلند آواز سے پڑھنے کے بھی قائل نہیں۔ اسی طرح جو لوگ اسے سورۂ فاتحہ سے الگ ایک آیت مانتے ہیں وہ بھی اس کے پست آواز سے پڑھنے کے قائل ہیں۔ رہے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہ ہر سورت کے اول سے ہے۔ ان میں اختلاف ہے۔ شافعی رحمہ اللہ کا تو مذہب ہے کہ سورۂ فاتحہ اور ہر سورت سے پہلے اسے اونچی آواز سے پڑھنا چاہیے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تابعین رحمہم اللہ کی اور مسلمانوں کے مقدم و موخر اماموں کی جماعتوں کا یہی مذہب ہے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اسے اونچی آواز سے پڑھنے والے حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابن عمرؓ ابن عباسؓ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ بیہقی رحمہ اللہ اور ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے بھی غریب سند سے امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تابعین میں سے حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت عکرمہؒ حضرت ابوقلابہؒ حضرت زہریؒ حضرت علی بن حسن ان کے لڑکے محمدؒ سعید بن مسیّبؒ عطاءؒ طاؤسؒ مجاہدؒ سالمؒ محمد بن کعب قرظیؒ عبیدؒ ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزمؒ ابووائل ابن سیرین محمد بن منکدر علی بن عبداللہ بن عباس ان کے صاحبزادے محمد نافع ابن عمر کے مولیٰ زید بن اسلمؒ عمر بن عبدالعزیزؒ ازرق بن قیسؒ حبیب بن ابی ثابتؒ ابوشعثاءؒ مکحولؒ عبداللہ بن معقل بن مقرن اور بروایت بیہقیؒ عبداللہ بن صفوانؒ محمد بن حنفیہ اور بروایت ابن عبدالبر عمرو بن دینار رحمہم اللہ سب کے سب ان نمازوں میں جن میں قرات اونچی آواز سے پڑھی جاتی ہے۔ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بھی بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ ایک دلیل تو اس کی یہ ہے کہ جب یہ آیت سورۂ فاتحہ میں سے ہے تو پھر پوری سورت کی طرح یہ بھی اونچی آواز سے

ہی پڑھنی چاہیے۔ علاوہ ازیں سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم میں مروی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھائی اور قرات میں اونچی آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بھی پڑھی اور فارغ ہونے کے بعد فرمایا میں تم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں مشابہ ہوں۔ (1) اس حدیث کو دارقطنی خطیب اور بیہقی وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا کرتے تھے۔ (2) امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث ایسی زیادہ صحیح نہیں۔ مستدرک حاکم میں انہی سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔ (3) امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

قراءت کا نبوی اسلوب: صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرات کس طرح تھی۔ فرمایا کہ ہر کھڑے لفظ کو آپ لمبا کرکے پڑھتے تھے پھر ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھ کر سنائی بسم اللہ پر مد کیا الرحمٰن پر مد کیا الرحیم پر مد کیا۔ (4) مسند احمد، سنن ابی داؤد، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر ہر آیت پر رکتے تھے اور آپ کی قرات الگ الگ ہوتی تھی جیسے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پھر ٹھہر کر ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ پھر ٹھہر کر ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پھر ٹھہر کر ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ دارقطنی اسے صحیح بتاتے ہیں۔ (5) امام شافعی رحمہ اللہ امام

---

(1) [**صحیح**: نسائی: کتاب الافتتاح باب قراءة بسم الله الرحمن الرحيم (٩٠٦) بیهقی (٤٦/٢) ابن الجارود (١٨٤) ابن خزیمه (٤٩٩) حاکم (٢٣٢/١) دارقطنی (٣٠٥/١) ابن حبان (١٧٩٧) شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

(2) [**ضعیف**: ترمذی: کتاب الصلوة: باب من رای الجهر بسم الله الرحمن الرحيم (٢٤٥) المزی فی التحفة (٢٦٥/٥) دارقطنی (٣٠٤/١) بیهقی (٤٧/٢) العقیلی (٨٠/١) ابن عدی (٣٠٥/١)] شیخ البانیؒ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ شیخ عبد الرزاق مہدی، شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد، شیخ حسن عباس، مولانا مبشر احمد ربانی اور حافظ زبیر علی زئی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔]

(3) [**ضعیف جدا**: مستدرك حاکم (٢٠٨/١)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس کے مطابق یہ روایت سخت ضعیف ہے۔ کیونکہ اس کی سند میں عبد اللہ بن عمرو بن حسان راوی ہے جسے امام دارقطنیؒ نے کذاب کہا ہے، امام ابن مدینیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا، امام عقیلیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی احادیث مقلوب ہیں، امام ابو حاتمؒ نے اسے ضعیف الحدیث کہا ہے۔ [دیکھئے: میزان الاعتدال (٤٦٨/٢) الجرح (١١٩/٥)] امام زیلعیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ روایت نہ تو صریح ہے اور نہ ہی صحیح۔ حافظ زبیر علی زئی نے اسے باطل کہا ہے۔]

(4) [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن: باب مد القراءة (٥٠٤٦) ابن حبان (٦٣١٧)]

(5) [**صحیح**: ابو داؤد: کتاب الحروف والقراءات (٤٠٠١) ترمذی: کتاب القراءت: باب فی فاتحة الكتاب (٢٩٢٧) دارقطنی (٣١٢/١) حاکم (٢٣٢/٢) مسند احمد (٣٠٢/٦)] امام حاکمؒ، امام ذہبیؒ اور امام دارقطنیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ شیخ البانیؒ بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔]

حاکم رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں نماز پڑھائی اور بسم اللہ نہ پڑھی تو جو مہاجر اصحاب رضی اللہ عنہم وہاں موجود تھے انہوں نے ٹوکا۔ چنانچہ پھر وہ جب نماز پڑھانے کو کھڑے ہوئے تو بسم اللہ پڑھی۔ [1]
غالباً اتنی ہی احادیث و آثار اس مذہب کی حجت کے لیے کافی ہیں۔ باقی رہے اس کے خلاف آثار روایات ان کی سندیں ان کی تعلیل ان کا ضعف اور ان کی تقاریر وغیرہ ان کا دوسرے مقام پر ذکر اور ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ نماز میں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ کو زور سے نہ پڑھنا چاہیے۔ خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم سے اور عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے تابعین رحمہم اللہ اور بعد والوں کی جماعتوں سے یہ ثابت ہے۔ امام ابوحنیفہ ثوری امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ سرے سے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ پڑھے ہی نہیں نہ تو آہستہ نہ بلند۔ ان کی دلیل ایک تو صحیح مسلم والی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کو تکبیر سے اور قرات کو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ سے ہی شروع کیا کرتے تھے۔ [2] صحیحین میں ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی یہ سب ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ سے شروع کرتے تھے۔ [3] مسلم میں ہے کہ بسم اللہ الخ نہیں پڑھتے تھے نہ تو قرات کے شروع میں نہ اس قرات کے آخر میں۔ [4]

سنن میں حضرت مغفل رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مروی ہے۔ [5] یہ ہے دلیل ان ائمہ کی بسم اللہ آہستہ پڑھنے کی۔ یہ خیال رہے کہ یہ کوئی بڑا اختلاف نہیں ہر ایک فریق دوسرے کی نماز کی صحت کا قائل ہے فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ (بسم اللہ کا مطلق نہ پڑھنا تو ٹھیک نہیں۔ بلند و پست پڑھنے کی احادیث میں اس طرح تطبیق ہو سکتی ہے کہ دونوں جائز ہیں۔ گو پست پڑھنے کی احادیث قدرے زوردار ہیں۔ واللہ اعلم۔ مترجم)

فصل: بسم اللہ کی فضیلت: تفسیر ابن ابی حاتم میں ہے کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

[1] [حسن: مسند شافعی (۱/ ۸۰) حاکم (۱/ ۲۳۳)] حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔]

[2] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الصلوة: باب یجمع صفة الصلوة وما یفتتح به (۴۹۸) ابن ماجه: کتاب اقامة الصلوة: باب افتتاح القراءة (۸۱۲) ابو داؤد: کتاب الصلوة: باب من لم یر الجهر بسم الله الرحمن الرحیم (۷۸۳) صحیح ابن حبان (۱۷۶۸) مسند احمد (۶/ ۳۸)]

[3] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الاذان: باب ما یقول بعد التکبیر (۷۴۳) صحیح مسلم: کتاب الصلوة: باب حجة من قال لا یجهر بالبسملة (۳۹۹) ابو داؤد: کتاب الصلوة: باب من لم یر الجهر بسم الله الرحمن الرحیم (۷۸۲)]

[4] [صحیح: صحیح مسلم (۳۹۹)]

[5] [ضعیف: ترمذی: کتاب الصلوة: باب ما جاء فی ترك الجهر بسم الله الرحمن الرحیم (۲۴۴) ابن ماجه: کتاب اقامة الصلوة: باب افتتاح القراءة (۸۱۵) نسائی: کتاب الافتتاح: باب ترك الجهر بسم الله الرحمن الرحیم (۹۰۹) مسند احمد (۴/ ۸۵) طحاوی فی شرح معانی الآثار (۱/ ۲۰۲) بیهقی (۲/ ۵۰)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف ترمذی (۳۹)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت ابن فضل کی جہالت کی وجہ سے ضعیف ہے۔ تاہم مولانا مبشر احمد ربانی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

بسم اللہ کی نسبت سوال کیا آپ نے فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بڑے نام ہیں اور اس میں اس قدر نزدیکی ہے جیسے آنکھ کی سیاہی اور سفیدی میں۔ [1] ابن مردویہ میں بھی اس طرح کی روایت ہے۔ اور یہ روایت بھی ابن مردویہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی والدہ نے معلم کے پاس بٹھایا تو اس نے کہا لکھئے بسم اللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا بسم اللہ کیا ہے؟ استاد نے جواب دیا میں نہیں جانتا۔ آپ نے فرمایا: ''ب'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا ''بہا'' یعنی بلندی ہے اور ''س'' سے مراد اس کی سنا یعنی نور اور روشنی ہے اور ''م'' سے مراد اس کی مملکت یعنی بادشاہی ہے اور ﴿ اللہ ﴾ کہتے ہیں معبودوں کے معبود کو اور ﴿ رحمن ﴾ کہتے ہیں دنیا اور آخرت میں رحم کرنے والے کو ﴿ رَحِیْمٌ ﴾ کہتے ہیں آخرت میں کرم و رحم کرنے والے کو۔ [2] ابن جریر میں بھی یہی روایت ہے [3] لیکن سند کی رو سے یہ بے حد غریب ہے۔ ممکن ہے کسی صحابی وغیرہ سے مروی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بنی اسرائیل کی روایتوں میں سے ہو۔ مرفوع حدیث نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

ابن مردویہ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر ایک ایسی آیت اتری ہے جو کسی اور نبی پر سوائے حضرت سلیمان علیہ السلام کے نہیں اتری۔ وہ آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب یہ آیت ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اتری بادل مشرق کی طرف چھٹ گئے۔ ہوائیں ساکن ہو گئیں۔ سمندر ٹھہر گیا جانوروں نے کان لگا لیے۔ شیاطین پر آسمان سے شعلے گرے اور پروردگار عالم نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر فرمایا کہ جس چیز پر میرا یہ نام لیا جائے گا اس میں ضرور برکت ہو گی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جہنم کے انیس داروغوں سے جو بچنا چاہے۔ وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے اس کے بھی انیس حروف ہیں ہر حرف ہر فرشتے سے بچاؤ بن جائے گا۔ اسے ابن عطیہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے اس کی تائید ایک اور حدیث سے بھی کی ہے۔ جس

---

[1] [موضوع و باطل: العقیلی فی الضعفاء (۲/۱۶۲) تفسیر ابن ابی حاتم (۱۲/۱) الخطیب فی تاریخه (۳۱۳/۷) الحاکم فی مستدرکه (۵۵۲/۱) بیهقی فی الشعب (۲۱۲۳)] امام ذہبیؒ نے اس روایت کو جھوٹی خبر قرار دیا ہے۔ [میزان الاعتدال (۱۸۲/۲)] امام عقیلیؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں سلام بن وہب راوی ہے جس کی کسی دوسرے نے متابعت نہیں کی۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس روایت کو موضوع کہا ہے۔ ابو اسحاق حوینی نے اسے باطل کہا ہے۔ [النافلة فی الاحادیث الضعیفة والباطلة (ص: ۵۴)] حافظ زبیر علی زئی نے بھی اسے موضوع ہی کہا ہے۔]

[2] [موضوع و باطل: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۲۱/۱) الکامل لابن عدی (۳۰۳/۱)] امام ابن عدیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث باطل الاسناد ہے، اسے صرف اسماعیل نے ہی روایت کیا ہے اور اسماعیل ثقہ راویوں سے باطل روایتیں بیان کیا کرتا تھا۔ امام ابن جوزیؒ نے اس روایت کو موضوعات میں ذکر کیا ہے اور اسے موضوع کہا ہے۔ [۱۸۶] اس میں اسماعیل بن عیاش راوی ضعیف اور اسماعیل بن یحییٰ متہم بالوضع ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے موضوع کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے فرمایا ہے کہ یہ روایت سخت ضعیف و باطل ہے۔]

[3] [موضوع و باطل: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۴۰، ۱۴۱) الکامل ابن عدی (۳۰۳/۱)] اس کی سند میں عبد الکریم ابو امیہ راوی ضعیف ہے جیسا کہ تقریب میں ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے ضعیف کہا ہے۔]

میں آپ نے فرمایا میں نے تیس سے اوپر اوپر فرشتوں کو دیکھا کہ وہ جلدی کر رہے تھے یہ حضور ﷺ نے اس وقت فرمایا تھا جب ایک شخص نے ﴿رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيهِ﴾ پڑھا تھا[1] اس میں بھی تیس سے اوپر حروف ہیں اتنے ہی فرشتے اترے اسی طرح بسم اللہ میں بھی انیس حروف ہیں اور وہاں فرشتوں کی تعداد بھی انیس ہے وغیرہ وغیرہ۔

مسند احمد میں ہے آنحضرت ﷺ کی سواری پر آپ ﷺ کے پیچھے جو صحابی سوار تھے' ان کا بیان ہے کہ حضور کی اونٹنی ذرا پھسلی تو میں نے کہا شیطان کا ستیاناس ہو' آپ ﷺ نے فرمایا یہ نہ کہو اس سے شیطان پھولتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ گویا اس نے اپنی قوت سے گرایا۔ ہاں بسم اللہ کہنے سے وہ مکھی کی طرح ذلیل و پست ہو جاتا ہے۔[2] نسائی نے اپنی کتاب عمل الیوم واللیلہ میں اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں بھی اسے نقل کیا ہے اور صحابی کا نام اسامہ بن عمیر بتایا ہے اس میں یہ لکھا ہے کہ بسم اللہ کہہ کہ بسم اللہ کی برکت سے شیطان ذلیل ہو گا۔[3] اسی لیے ہر کام اور ہر بات کے شروع میں بسم اللہ کہہ لینا مستحب ہے۔ خطبہ کے شروع میں بھی بسم اللہ کہنی چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ جس کام کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکتا ہوتا ہے۔[4]

بیت الخلاء (پاخانہ) میں جانے کے وقت بسم اللہ پڑھ لے۔[5]

حدیث میں یہ بھی ہے کہ وضو کے وقت بھی پڑھ لے۔ مسند احمد اور سنن میں ابو ہریرہ' سعید بن زید اور ابو سعید رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص وضو میں اللہ کا نام نہ لے اس کا وضو نہیں ہوتا''[6]۔ یہ حدیث

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الاذان (۷۹۹) مسند احمد (۳٤۰/٤)]

[2] [حسن بالشواهد: مسند احمد (۵۹/۵) ابوداؤد: کتاب الادب (٤۹۸٤) شیخ البانی ؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح الترغیب (۳۱۲۹)] حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔]

[3] [صحیح بالشواهد: النسائی فی عمل الیوم واللیة (۵۵۹)] شیخ البانی ؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح الترغیب (۳۱۷۸)] حافظ زبیر علی زئی نے فرمایا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے لیکن یہ شواہد کی وجہ سے صحیح ہے۔]

[4] [ضعیف جدا: ابن السبکی فی الطبقات الشافعیه (٦/۱) الخطیب فی الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع (۱۲۸/۲)] اس کی سند میں احمد بن محمد بن عمران ضعیف ہے۔ شیخ البانی ؒ نے اس روایت کو سخت ضعیف کہا ہے۔ [ارواء الغلیل (۱) ضعیف الجامع الصغیر (٤۲٤۵) تمام المنة (ص: ۳۳۳) ضعیف ابن ماجه (۱۸۹٤) ضعیف ابوداود (٤۸٤۰) ضعیف الترغیب (۹۵۸)] حافظ زبیر علی زئی نے اسے ضعیف کہا ہے۔]

[5] [صحیح: ترمذی: کتاب الطهارة: باب ما ذکر من التسمیة عند دخول الخلاء (٦۰٦) ابن ماجه: کتاب الطهارة: باب ما یقول الرجل اذا دخل الخلاء (۲۹۷) ابن السنی (ص: ۸)] شیخ البانی ؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [ارواء الغلیل (۵۰)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت اپنے تمام شواہد کے ساتھ ضعیف ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔]

[6] [حسن: ابن ماجه: کتاب الطهارة: باب ما جاء فی التسمیة فی الوضوء (۳۹۹) ابو داؤد: کتاب الطهارة باب فی التسمیة علی الوضوء (۱۰۱) مستدرك حاکم (۱٤٦/۱) دارقطنی (۷۹/۱)] شیخ البانی ؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحیح الترغیب (۲۰٤) صحیح الجامع الصغیر (۷۵۱٤) صحیح ابوداود (۹۰) ارواء الغلیل (۸۱) المشكاة (٤۰٤)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت شاہد کے ساتھ حسن ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی نے بھی اسے حسن کہا ہے۔]

حسن ہے بعض علماء تو وضو کے وقت آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا واجب بتاتے ہیں۔ بعض مطلق وجوب کے قائل ہیں۔

جانور کو ذبح کرتے وقت بھی اس کا پڑھنا مستحب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک جماعت کا یہی خیال ہے۔ بعض نے یاد آنے کے وقت اور بعض نے مطلقاً اسے واجب کہا ہے اس کا تفصیلی بیان عنقریب آئے گا ان شاءاللہ تعالیٰ۔

امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کی فضیلت میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔ ایک میں ہے کہ " جب تو اپنی بیوی کے پاس جائے اور بسم اللہ پڑھ لے اور اللہ کوئی اولاد بخشے تو اس کے اپنے اور اس کی اولاد کے سانسوں کی گنتی کے برابر تیرے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گی۔" لیکن یہ روایت بالکل بے اصل ہے، میں نے تو یہ کہیں کسی معتبر کتاب میں نہیں پائی۔ کھاتے وقت بھی بسم اللہ پڑھنی مستحب ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا (جو آپ کی پرورش میں حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے اگلے خاوند سے تھے) کہ بسم اللہ کہو اور اپنے داہنے ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنے سامنے سے نوالہ اٹھایا کرو۔"[1] بعض علماء اس وقت بھی بسم اللہ کا کہنا واجب بتلاتے ہیں۔

بیوی سے ملنے (جماع) کے وقت بھی بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔ صحیحین میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ملنے کا ارادہ کرے تو یہ پڑھے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا﴾ یعنی اے اللہ ہمیں اور جو ہمیں تو دے اسے شیطان سے بچا۔" فرماتے ہیں کہ اگر اس جماع سے حمل ٹھہر جائے تو اس بچہ کو شیطان کبھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔[2]

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ کی " ب " کا تعلق کس سے ہے نحویوں کے اس میں دو قول ہیں اور دونوں ہی تقریباً ہم خیال ہیں۔ بعض اسم کہتے ہیں اور بعض فعل، ہر ایک کی دلیل قرآن سے ملتی ہے جو لوگ اسم کے ساتھ متعلق بتاتے ہیں وہ تو کہتے ہیں کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ ابْتِدَائِیْ﴾ یعنی اللہ کے نام سے میری ابتداء ہے۔ قرآن میں ہے ﴿ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا﴾[3] الخ اس میں اسم یعنی مصدر ظاہر کر دیا گیا ہے اور جو لوگ فعل مقدر بتاتے ہیں چاہے وہ امر ہو یا خبر۔ جیسے کہ ﴿اِبْدَا بِسْمِ اللّٰهِ﴾ اور ﴿اِبْتَدَأْتُ بِسْمِ اللّٰهِ﴾ ان کی دلیل آیت ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ﴾[4] الخ ہے۔ دراصل دونوں ہی صحیح ہیں، اس لیے کہ فعل کے لیے بھی مصدر کا ہونا ضروری ہے تو اختیار ہے کہ فعل کو مقدر مانا جائے اور اس کے مصدر کو مطابق اس فعل کے جس کا نام پہلے لیا گیا

---

[1] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الاطعمۃ : باب التسمیۃ علی الطعام (٥٣٧٦) صحیح مسلم : کتاب الاشربۃ : باب آداب الطعام (٢٠٢٢) مسند احمد (٤/٢٦)]

[2] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الوضوء : باب التسمیۃ علیٰ کل حال (١٤١) و کتاب الدعوات : باب ما یقول اذا اتی اھلہ (٦٣٨٨) و کتاب النکاح : باب ما یقول اذا تی اھلہ (٥١٦٥) و کتاب بدء الخلق : باب صفۃ ابلیس و جنودہ (٣٢٧١) صحیح مسلم : کتاب النکاح : باب ما یستحب ان یقولہ عند الجماع (١٤٣٤) ترمذی : کتاب النکاح : باب ما یقول اذا دخل علی اھلہ (١٠٩٢) ابو داؤد : کتاب النکاح : باب فی حامع النکاح (٢١٦١) ابن ماجہ : کتاب النکاح : باب ما یقول الرحل اذا دخلت علیہ اھلہ (١٩١٩)]

[3] [سورہ ھود: آیت ٤١]

[4] [سورہ العلق: آیت ١]

ہے۔ کھڑا ہونا ہو بیٹھنا ہو کھانا پینا ہو قرآن کا پڑھنا ہو وضو اور نماز وغیرہ ہو ان سب کے شروع میں برکت حاصل کرنے کے لیے امداد چاہنے کے لیے اور قبولیت کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لینا مشروع ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم میں روایت ہے ”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب سب سے پہلے جبرئیل علیہ السلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تو فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! کہیے ﴿أَسْتَعِيذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ پھر کہا کہیے ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ مقصود یہ تھا کہ اٹھنا بیٹھنا پڑھنا سب اللہ کے نام سے شروع ہو۔“ [1]

کچھ اور تفصیل: اسم یعنی نام ہی مسمیٰ یعنی نام والا ہے یا کچھ اور اس میں اہل علم کے تین قول ہیں ایک تو یہ کہ اسم ہی مسمیٰ ہے۔ ابوعبیدہ کا اور سیبویہ کا بھی یہی قول ہے۔ باقلانی اور ابن فورک کی رائے بھی یہی ہے۔ ابن خطیب رازی اپنی تفسیر کے مقدمات میں لکھتے ہیں۔ حشویہ اور کرامیہ اور اشعریہ تو کہتے ہیں اسم نفس مسمیٰ ہے اور نفس تسمیہ کا غیر ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اسم مسمیٰ کا غیر ہے اور نفس تسمیہ ہے۔ ہمارے نزدیک اسم مسمیٰ کا بھی غیر ہے اور تسمیہ کا بھی۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر اسم سے مراد لفظ ہے جو آوازوں کے ٹکڑوں اور حروف کا مجموعہ ہے تو بالبداہت ثابت ہے کہ یہ مسمیٰ کا غیر ہے اور اگر اسم سے مراد ذات مسمیٰ ہے تو یہ وضاحت کو ظاہر کرتا ہے جو محض بیکار ہے۔ ثابت ہوا کہ اس بیکار بحث میں پڑنا ہی فضول ہے۔ اس کے بعد جو لوگ اسم اور مسمیٰ کے فرق پر اپنے دلائل لائے ہیں ان کا کہنا ہے محض اسم ہوتا ہے مسمیٰ ہوتا ہی نہیں۔ جیسے معدوم کا لفظ۔ کبھی ایک مسمیٰ کے کئی اسم ہوتے ہیں جیسے مترادف کبھی اسم ایک ہوتا ہے اور مسمیٰ کئی ایک ہوتے ہیں جیسے مشترک۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسم اور چیز ہے اور مسمیٰ اور چیز ہے۔ یعنی نام الگ ہے۔ اور نام والا الگ ہے۔ اور دلیل سنیے کہتے ہیں اسم تو لفظ ہے دوسرا عرض ہے۔ مسمیٰ کبھی ممکن یا واجب ذات ہوتی ہے۔ اور سنیے اگر اسم ہی کو مسمیٰ مانا جائے تو چاہیے کہ آگ کا نام لیتے ہی حرارت محسوس ہو اور برف کا نام لیتے ہی ٹھنڈک پہنچے۔ جبکہ کوئی عقل مند اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

اور دلیل سنیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ کے بہت سے بہترین نام ہیں تم ان ناموں سے اسے پکارو۔ [2] حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں [3] تو خیال کیجیے کہ نام کس قدر بکثرت ہیں حالانکہ مسمیٰ ایک ہی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک لہ ہے اسی طرح ”اَسْمَاء“ کو اللہ کی طرف اس آیت میں مضاف کرنا اور جگہ فرمانا: ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ﴾ [4] وغیرہ یہ اضافت بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے کہ اسم اور ہو اور مسمیٰ اور کیونکہ اضافت کا مقتضا مغائرت کا ہے۔ اسی طرح یہ حکم دیا کہ ﴿فَادْعُوهُ بِهَا﴾ [5] یعنی اللہ تعالیٰ کو اس

---

[1] [**ضعیف و منقطع:** تفسیر ابن جریر الطبری (۱۳۷۔۱۳۸)] اس میں بشر بن عمارہ راوی ضعیف ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس روایت کو ضعیف و منقطع کہا ہے۔]

[2] [سورۃ الاعراف: آیت ۱۸۰]

[3] [**صحیح:** صحیح مسلم: کتاب الذکر والدعاء: باب فی اسماء اللہ تعالی (۲۶۷۷)]

[4] [سورہ الواقعہ: آیت ۷۴] [5] [سورہ الاعراف: آیت ۱۸۰]

کے ناموں کے ساتھ پکارو۔ یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ نام اور ہے اور نام والا اور۔

اب ان کے دلائل بھی سنیئے جو اسم اور مسمی کو ایک ہی بتاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ﴾ (الرحمن/ ۷۸) الخ جلال واکرام والے تیرے رب کا بابرکت نام ہے۔ تو نام کو برکتوں والا فرمایا حالانکہ خود اللہ تعالیٰ برکتوں والا ہے۔ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ اس مقدس ذات کی وجہ سے اس کا نام بھی عظمتوں والا ہے ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص کہے کہ زینب پر طلاق ہے تو طلاق اس کی بیوی جس کا نام زینب ہے ہو جاتی ہے۔ اگر نام اور نام والے میں فرق ہوتا تو نام پر طلاق پڑتی' نام والے پر کیسے پڑتی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ اس ذات پر طلاق ہے جس کا نام زینب ہے۔ تسمیہ کا اسم سے الگ ہونا اس دلیل کی بنا پر ہے کہ تسمیہ کہتے ہیں کسی کا نام مقرر کرنے کو اور ظاہر ہے یہ اور چیز ہے اور نام والا اور چیز ہے۔ رازی کا قول یہی ہے یہ سب کچھ تو لفظ ''باسم'' کے متعلق تھا اب لفظ ''اللہ'' کے متعلق سنیئے۔ اللہ خاص نام ہے رب تبارک وتعالیٰ کا۔ کہا جاتا ہے کہ اسم اعظم یہی ہے اس لیے کہ تمام عمدہ صفتوں کے ساتھ ہی موصوف ہوتا ہے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں ہے ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ﴾ (الحشر/ ۲۲) الخ یعنی وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے' جو رحم کرنے والا مہربان ہے۔ وہی اللہ جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں' جو بادشاہ ہے پاک ہے' سلامتی والا ہے' امن دینے والا ہے' محافظ ہے' غلبہ والا ہے' زبردست ہے' بڑائی والا ہے' وہ ہر شرک سے اور شرک کی چیز سے پاک ہے۔ وہی اللہ پیدا کرنے والا' مادہ کو بنانے والا' صورت بخشنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین پاکیزہ نام ہیں' آسمان وزمین کی تمام چیزیں اس کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ وہ عزتوں اور حکمتوں والا ہے۔ ان آیتوں میں تمام نام صفاتی ہیں' اور لفظ اللہ ہی کی صفت ہیں یعنی اصلی نام اللہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ اللہ ہی کے لیے ہیں پاکیزہ اور عمدہ عمدہ نام۔

اللہ تعالیٰ کا اپنے تمام صفاتی نام خود تجویز فرمانا: پس تم اس کو ان ہی ناموں سے پکارو۔ اور فرماتا ہے۔ اللہ کو پکارو۔ یا رحمٰن کو پکارو۔ جس نام سے پکارو۔ اسی کے پیارے پیارے اور اچھے اچھے نام ہیں۔ [۱] بخاری ومسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں۔ ایک کم ایک سو' جو انہیں یاد کرلے جنتی ہے۔ [۲]

ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت میں ان ناموں کی تفصیل بھی آئی ہے [۳] اور دونوں کی روایتوں میں الفاظ کی

---

[۱] [سورۃ بنی اسرائیل: آیت ۱۱۰]

[۲] [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب التوحید: باب ان اللہ مائۃ اسم الاواحدۃ (۷۳۹۲) صحیح مسلم: کتاب الذکر والدعاء: باب فی اسماء اللّٰہ تعالی (۲۶۷۷)]

[۳] [**ضعیف**: ترمذی: کتاب الدعوات (۳۵۰۷) ابن ماجہ: کتاب الدعاء: باب اسماء اللّٰہ عزو جل (۳۸۶۱) بغوی (۱۲۵۷) حاکم (۱۲/۱) بیہقی (۲۷/۱۰) حاکم (۱۶/۱)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف ترمذی (۶۹۶)] حافظ زبیر علی زئی اور مولانا مبشر احمد ربانی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔]

کچھ تبدیلی کچھ کمی زیادتی بھی ہے۔ رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے روایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پانچ ہزار نام ہیں۔ ایک ہزار قرآن شریف اور صحیح حدیث میں ہیں اور ایک ہزار توراۃ میں اور ایک ہزار انجیل میں اور ایک ہزار زبور میں ہیں اور ایک ہزار لوح محفوظ میں۔

اللہ ہی وہ نام ہے جو سوائے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی اور کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عرب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا اشتقاق کیا ہے اس کا باب کیا ہے بلکہ ایک بہت بڑی نحویوں کی جماعت کا خیال ہے کہ یہ اسم جامد ہے اور اس کا کوئی اشتقاق ہے ہی نہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ نے علماء کرام کی ایک بڑی جماعت کا یہی مذہب نقل کیا ہے جن میں سے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ امام خطابی رحمہ اللہ امام الحرمین رحمہ اللہ امام غزالی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ خلیل اور سیبویہ سے روایت ہے کہ الف لام اس میں لازم ہے۔ امام خطابی نے اس کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ یا اللہ تو کہہ سکتے ہیں مگر یا الرحمٰن کہتے کسی کو نہیں سنا اگر لفظ اللہ میں الف لام اصل کلمہ کا نہ ہوتا تو اس پر ندا کا لفظ یا داخل نہ ہوسکتا کیونکہ قواعد عربی کے لحاظ سے حرف ندا کا لفظ لام والے اسم پر داخل ہونا جائز نہیں۔

بعض لوگوں کا یہ قول بھی ہے کہ یہ مشتق ہے اور اس پر روبہ بن عجاج کا ایک شعر دلیل لاتے ہیں جس میں مصدر تَأَلُّهٌ کا بیان ہے جس کا ماضی مضارع "أَلِهَ يَأْلَهُ أَلْهَةً" اور "تَأَلُّهًا" ہے جیسے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ "وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ" پڑھتے تھے۔ مراد اس سے عبادت ہے۔ یعنی اس کی عبادت کی جاتی ہے اور وہ کسی کی عبادت نہیں کرتا۔ مجاہد وغیرہ کہتے ہیں۔ بعض نے اس پر اس آیت سے دلیل پکڑی ہے کہ ﴿وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ﴾ (1) اور آیت میں ہے ﴿وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ (2) یعنی وہی اللہ ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے۔ سیبویہ خلیل سے نقل کرتے ہیں کہ اصل میں یہ "اِلٰهٌ" تھا جیسے "فِعَالٌ" پھر ہمزہ کے بدلے الف ولام لایا گیا جیسے "النَّاس" کہ اس کی اصل "اُنَاسٌ" ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس لفظ کی اصل "لَاهٌ" ہے الف لام حرف تعظیم کے طور پر لایا گیا ہے۔ سیبویہ کا بھی پسندیدہ قول یہی ہے۔ عرب شاعروں کے شعروں میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ کسائی اور فرا کہتے ہیں کہ اس کی اصل اَلْاِلٰه تھی ہمزہ کو حذف کیا اور پہلے لام کو دوسرے میں ادغام کیا جیسے کہ ﴿لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ﴾ (3) میں "لٰكِنْ اَنَا" کا "لٰكِنَّا" ہوا ہے۔ چنانچہ حسن کی قرات میں "لٰكِنْ اَنَا" ہی ہے اور اس کا اشتقاق وَلِهَ سے ہے اور اس کے معنی "تَحَيَّرَ" ہیں "وَلَهٌ" عقل کے چلے جانے کو کہتے ہیں۔ عربی میں "رَجُلٌ وَالِهٌ" اور "اِمْرَأَةٌ وَلْهٰى" اور "مَوْلُوْهَةٌ" اس وقت کہتے ہیں جب وہ جنگل میں بھیج دیا جائے۔ چونکہ ذات باری تعالیٰ میں اور اسکی صفتوں کی تحقیق میں عقل حیران وپریشان ہو جاتی ہے اس لیے اس پاک ذات کو اللہ کہا جاتا ہے۔ اس بنا پر اصل میں یہ لفظ "وِلَاهٌ" تھا۔ واؤ کو ہمزہ سے بدل دیا گیا جیسے کہ "وِشَاحٌ" اور "وِسَادَةٌ" میں اشاح اور اسادہ کہتے ہیں۔

---

(1) [سورۃ الانعام: آیت ۳] (2) [سورۃ الزخرف: آیت ۸۴]

(3) [سورۃ الکهف: آیت ۳۸]

رازی کہتے ہیں کہ یہ لفظ "اَلِهْتُ اِلٰى فُلَانٍ" سے مشتق ہے جو کہ معنی میں "سَكَنْتُ" کے ہے یعنی میں نے فلاں سے سکون اور راحت حاصل کی۔ چونکہ عقل کا سکون صرف ذات باری تعالیٰ کے ذکر سے ہے اور روح کی حقیقی خوشی اسی کی معرفت میں ہے اس لیے کہ علی الاطلاق کامل وہی ہے' اس کے سوا اور کوئی نہیں اسی وجہ سے اللہ کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (1) الخ یعنی ایمانداروں کے دل صرف اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہی اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ لَاهَ يَلُوْهُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی چھپ جانے اور حجاب کرنے کے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلِهَ الْفَصِيْلُ سے ہے چونکہ بندے اسی کی طرف تضرع اور زاری سے جھکتے ہیں اسی کے دامن رحمت کا پلہ ہر حال میں تھامتے ہیں' اس لیے اسے اللہ کہا گیا ایک قول یہ بھی ہے کہ عرب "اَلِهَ الرَّجُلُ يَأْلَهُ" اس وقت کہتے ہیں جب کسی اچانک امر سے کوئی گھبرا اٹھے اور دوسرا اسے پناہ دے اور بچالے چونکہ تمام مخلوق کو ہر مصیبت سے نجات دینے والا اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے' اس لیے اس کو اللہ کہتے ہیں۔ جیسے کہ قرآن کریم میں ہے: ﴿وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ (2) یعنی وہی بچاتا ہے اور اس کے مقابل میں کوئی نہیں بچایا جاتا۔ (وَهُوَ مُنْعِمٌ) حقیقی منعم وہی ہے فرماتا ہے تمہارے پاس جتنی نعمتیں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں' (3) وہی ﴿مُطْعِمٌ﴾ ہے فرمایا ہے وہ کھلاتا ہے اور اسے کوئی نہیں کھلاتا۔ (4) وہی موجد ہے فرماتا ہے ہر چیز کا وجود اللہ کی طرف سے ہے۔ (5) رازی رحمہ اللہ کا مختار مذہب یہی ہے کہ لفظ اللہ مشتق نہیں ہے۔ خلیل' سیبویہ اکثر اصولیوں اور فقہاء کا یہی قول ہے' اس کی بہت سی دلیلیں بھی ہیں اگر یہ مشتق ہوتا تو اس کے معنی میں بہت سے افراد کی شرکت ہوتی حالانکہ ایسا نہیں۔

پھر اس لفظ کو موصوف بنایا جاتا ہے اور بہت سی اس کی صفتیں آتی ہیں جیسے رحمٰن' رحیم' مالک' قدوس وغیرہ تو معلوم ہوا کہ یہ مشتق نہیں۔ قرآن میں ایک جگہ ﴿عَزِيْزِ الْحَمِيْدِ اللّٰهِ﴾ (6) الخ جو آتا ہے وہاں یہ عطف بیان ہے۔ ایک دلیل اس کے مشتق نہ ہونے کی یہ بھی ہے "هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا" (7) یعنی کیا اس کا ہم نام بھی کوئی جانتے ہو؟ لیکن یہ غور طلب ہے۔ واللہ اعلم۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے لیکن رازی رحمہ اللہ نے اس قول کو ضعیف کہا ہے اور فی الواقع ضعیف ہے بھی۔ رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "مخلوق کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو معرفت الٰہی کے کنارے پر پہنچ گئے دوسرے وہ جو اس سے محروم ہیں جو حیرت کے اندھیروں میں اور جہالت کی پرخار وادیوں میں پڑے ہیں وہ تو عقل کھو بیٹھے اور روحانی کمالات کو کھو بیٹھے ہیں لیکن جو ساحل معرفت پر پہنچ چکے ہیں جو نورانیت کے وسیع باغوں میں جا ٹھہرے جو کبریائی اور جلال کی وسعت کا اندازہ کر چکے ہیں وہ بھی یہاں تک پہنچ کر حیران و ششدر رہ گئے ہیں۔

---

(1) [سورۃ الرعد : آیت ۲۸] (2) [سورۃ المومنون : آیت ۸۸] (3) [سورۃ النمل: آیت ۵۳]
(4) [سورۃ الانعام: آیت ۱۴] (5) [سورۃ النساء : آیت ۷۸] (6) [ابراھیم: آیت ۱–۲]
(7) [سورۃ مریم : آیت ۶۵]

غرض ساری مخلوق اس کی پوری معرفت سے عاجز اور سرگشتہ وحیران ہے۔ ان معانی کی بناء پر اس پاک ذات کا نام اللہ ہے۔ ساری مخلوق اس کی محتاج‘ اس کے سامنے جھکنے والی اور اس کی تلاش کرنے والی ہے۔ اس حقیقت کی وجہ سے اسے اللہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ خلیل کا قول ہے عرب کے محاورے میں ہر اونچی اور بلند چیز کو ''لاہ'' کہتے ہیں۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تب بھی وہ کہتے ہیں ''لَاهَتِ الشَّمْسُ'' چونکہ پروردگار عالم بھی سب سے بلند و بالا ہے اس کو بھی اللہ کہتے ہیں۔ اور اِلٰہَ کے معنی عبادت کرنے اور تَاَلَّہَ کے معنی حکم برداری اور قربانی کرنے کے ہیں اور رب عالم کی عبادت کی جاتی ہے اور اس کے نام پر قربانیاں کی جاتی ہیں اس لیے اسے اللہ کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی قرات میں ہے ''وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ'' اس کی اصل اَلْاِلٰہُ ہے پس صرف کلمہ کی جگہ پر جو ہمزہ ہے وہ حذف کی گئی۔ پھر نفس کلمہ کا لام زائد لام سے جو تعریف کے لیے لایا گیا ہے مل گیا اور پھر ایک کو دوسرے میں مدغم کر دیا گیا تو ایک لام مشدد رہ گیا اور تعظیماً اللہ کہا گیا۔ یہ تو تفسیر لفظ ''اللہ'' کی تھی۔

الرحمٰن اور الرحیم کی تشریح: ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ یہ دونوں نام رحمت سے مشتق ہیں۔ دونوں میں مبالغہ ہے الرحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے۔ علامہ ابن جریر رحمہ اللہ کے قول سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی ان معنوں سے متفق ہیں گویا اس پر اتفاق ہے۔ بعض سلف کی تفسیروں سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے ان معنوں پر مبنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول بھی پہلے گذر چکا ہے کہ رحمٰن سے مراد دنیا اور آخرت میں رحم کرنے والا اور رحیم سے مراد آخرت میں رحم کرنے والا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن مشتق نہیں ہے اگر یہ اس طرح ہوتا تو مرحوم کے ساتھ ملتا۔ حالانکہ قرآن میں ﴿بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾ (الاحزاب/ ٤٣) آیا ہے۔ مبرد کہتے ہیں رحمٰن عبرانی نام ہے عربی نہیں۔ ابو اسحاق زجاج معانی القرآن میں کہتے ہیں کہ احمد بن یحییٰ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ رحیم عربی لفظ ہے اور رحمٰن عبرانی ہے دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ لیکن ابو اسحاق فرماتے ہیں ''اس قول کو دل نہیں مانتا۔'' قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''اس لفظ کے مشتق ہونے کی یہ دلیل ہے کہ ترمذی کی صحیح حدیث میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں رحمٰن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا اور اپنے نام میں سے ہی اس کا نام مشتق کیا۔ اس کے ملانے والے کو میں ملاؤں گا اور اس کے توڑنے والے کو کاٹ دوں گا۔''[1]

اب اس صریح حدیث کے ہوتے ہوئے مخالفت اور انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ رہا کفار عرب کا اس نام سے انکار کرنا یہ محض ان کی جہالت کا ایک کرشمہ تھا۔ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رحمٰن اور رحیم کے ایک ہی معنی ہیں اور جیسے ''نَدْمَانٌ'' اور ''نَدِيْمٌ'' ابوعبید کا بھی یہی خیال ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ''فَعْلَانٌ فَعِيْلٌ'' کی طرح نہیں۔ فعلان میں مبالغہ ضروری ہوتا ہے جیسے غَضْبَانٌ اسی شخص کو کہہ سکتے ہیں۔ جو بہت ہی غصہ والا ہو اور فعیل

---

[1] [صحیح: ابو داؤد: کتاب الزکاۃ: باب فی صلۃ الرحم (١٦٩٤) ترمذی: کتاب البر و الصلۃ: باب ما جآء فی قطعیۃ الرحم (١٩٠٧) ابن ابی شیبہ (٨/ ٥٣٥) حاکم (٤/ ١٥٧) مسند احمد (١/ ١٩٤) حمیدی (٦٥) الادب المفرد (٥٣) عبدالرزاق (٢٠٢٣٤)] شیخ البانی ؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح الترغیب (٢٥٢٨) السلسلۃ الصحیحۃ (١٩/٢) صحیح الجامع الصغیر (٤٣١٤)] مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

صرف فاعل اور صرف مفعول کے لیے بھی آتا ہے جو مبالغہ سے خالی ہوتا ہے۔ ابو علی فارسی کہتے ہیں کہ "رحمٰن عام اسم ہے جو ہر قسم کی رحمتوں کو شامل ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ رحیم باعتبار مومنوں کے ہے فرمایا ہے ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾ (الاحزاب / ٤٣) مومنون کے ساتھ رحیم ہے۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "یہ دونوں نام رحمت ورحم والے ہیں، ایک میں دوسرے سے زیادہ رحمت ورحم ہے۔" ① حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت میں لفظ اَرَقُّ ہے اس کے معنی خطابی وغیرہ اَرْفَقُ کرتے ہیں جیسے کہ حدیث میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ رفیق یعنی شفیق اور مہربانی والا ہے وہ ہر کام میں نرمی اور آسانی کو پسند کرتا ہے وہ نرمی اور آسانی کرنے والے پر وہ نعمتیں مرحمت فرماتا ہے جو سختی کرنے والے پر عطا نہیں فرماتا۔" ② ابن المبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رحمٰن اسے کہتے ہیں کہ جب اس سے جو مانگا جائے عطا فرمائے اور رحیم وہ ہے کہ جب اس سے نہ مانگا جائے وہ غضبناک ہو۔" ترمذی کی حدیث میں ہے "جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوتا ہے۔" ③ بعض شاعروں کا قول ہے کہ

اَللّٰهُ يَغْضَبُ اِنْ تَرَكْتَ سُؤَالَهُ
وَبُنَيُّ آدَمَ حِيْنَ يُسْئَالُ يَغْضَبُ

یعنی اللہ تعالیٰ سے نہ مانگو تو وہ ناراض ہوتا ہے اور بنی آدم سے مانگو تو وہ بگڑتے ہیں۔ عزرمی فرماتے ہیں کہ رحمٰن کے معنی تمام مخلوق پر رحم کرنے والا اور رحیم کے معنی مومنوں پر رحم کرنے والا ہے۔ ④ دیکھئے قرآن کریم کی دو آیتوں ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ ⑤ اور ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ ⑥ میں استویٰ کے ساتھ رحمٰن کا لفظ ذکر کیا تا کہ تمام مخلوق کو یہ لفظ اپنے عام رحم وکرم کے معنی سے شامل ہو سکے اور مومنوں کے ذکر کے ساتھ لفظ رحم فرمایا: ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾ ⑦ پس معلوم ہوا کہ رحمٰن میں مبالغہ بہ نسبت رحیم کے بہت زیادہ ہے۔ لیکن حدیث کی ایک دعا میں ﴿يَا رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

---

① [تفسیر قرطبی (١/١٠٥)]

② [صحیح: صحیح مسلم: کتاب البر و الصلة (٢٥٩٣) ابو داود: کتاب الادب: باب فی الرفق (٤٨٠٧) ابن ماجه (٣٦٨٨)]

③ [حسنه الالبانی: شیخ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحیح ترمذی (٢٦٨٦) السلسلة الصحیحة (٣٦٥٤) صحیح الأدب المفرد (٢٥٦) تحقیق شرح العقیدة الطحاویة (٥١٩)] مزید دیکھئے: ترمذی: کتاب الدعوات: (٣٣٧٣) ابن ماجه: کتاب الدعاء: باب فضل الدعاء (٣٨٢٧) مسند ابو یعلی (٦٦٥٥) مستدرك حاكم (١/٤٩١) مسند احمد (٤٧٧/٥) الادب المفرد (٦٥٨) بغوی فی شرح السنة (١٨٨/٥) مسند بزار (٢٣٢/٢) الكامل لابن عدی (٢٧٥٠/٧)] شیخ ابو اسحاق حوینی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ [الفتاوی الحدیثیة (١٩٣/١)] حافظ زبیر علی زئی نے فرمایا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں ابو صالح خوزی لین الحدیث راوی ہے۔]

④ [تفسیر ابن جریر الطبری (١/١٢٧)] ⑤ [سورہ الفرقان: آیت ٥٩]

⑥ [سورہ طه: آیت ٥] ⑦ [سورہ الاحزاب: آیت ٤٣]

﴿وَرَحِيمَهُمَا﴾ (1) بھی آیا ہے۔ رحمٰن یہ نام بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اس کے سوا کسی دوسرے کا نام نہیں۔ جیسے کہ فرمان ہے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو جس نام سے چاہو اسے پکارو اس کے بہت اچھے اچھے نام ہیں۔ ایک اور آیت میں ہے ﴿وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا﴾ (2) الخ یعنی ان سے پوچھ لو کہ تجھ سے پہلے ہم نے جو رسول بھیجے تھے کیا انہوں نے رحمٰن کے سوا کسی کو معبود کہا تھا کہ ان کی عبادت کی جائے جب مسیلمہ کذاب نے بڑھ چڑھ کر دعوے شروع کیے اور اپنا نام رحمٰن الیمامہ رکھا تھا تو پروردگار نے اسے بے انتہا رسوا اور برباد کیا' وہ جھوٹ اور کذب کی علامت مشہور ہو گیا۔ آج اسے مسیلمہ کذاب کہا جاتا ہے اور ہر جھوٹے دعویدار کو اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ ہر دیہاتی اور شہری ہر کچے پکے گھر والا اسے بخوبی جانتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ رحیم میں رحمٰن سے زیادہ مبالغہ ہے اس لیے کہ اس لفظ کے ساتھ اگلے لفظ کی تاکید کی گئی ہے اور تاکید بہ نسبت اس کے کہ جس کی تاکید کی جائے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تاکید ہے ہی نہیں بلکہ یہ تو صفت ہے اور صفت میں یہ قاعدہ نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا جس نام میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں' سب سے پہلے اس کی صفت رحمٰن بیان کی گئی ہے اور یہ نام رکھنا بھی دوسروں کو ممنوع ہے جیسے فرمادیا کہ اللہ کو یا رحمٰن کو پکارو جس نام سے چاہو پکارو اس کے لیے اسماء حسنٰی بہت سارے ہیں۔ مسیلمہ نے بدترین جرات کی لیکن برباد ہوا اور اس کے گمراہ ساتھیوں کے سوا اس کی قدر کسی کے دل میں نہ آئی۔

رحیم کے وصف کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو بھی موصوف کیا ہے۔ فرماتا ہے ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ﴾ (3) الخ اس آیت میں اپنے نبی کو رحیم کہا' اسی طرح اپنے بعض ایسے ناموں سے دوسروں کو بھی اس نے یاد کیا ہے جیسے آیت ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ﴾ (4) الخ میں انسان کو سمیع اور بصیر کہا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعض نام تو ایسے ہیں کہ دوسروں پر بھی ہم معنی ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ نہیں ہو سکتا جیسے اللہ اور رحمٰن' خالق اور رازق وغیرہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنا پہلا نام اللہ پھر اس کی صفت رحمٰن سے کی۔ اس لیے کہ رحیم کی نسبت یہ زیادہ خاص ہے اور زیادہ مشہور ہے۔ قاعدہ ہے کہ اول سب سے زیادہ بزرگ نام لیا جاتا ہے' اس لیے سب سے پہلے سب سے زیادہ خاص نام لیا گیا پھر اس سے کم۔ پھر اس سے کم۔ اگر کہا جائے کہ جب رحمٰن میں رحیم

---

(1) [موضوع: شیخ البانیؒ نے اسے موضوع کہا ہے۔ [ضعیف الترغیب (۱۱٤۳) السلسلة الضعیفة (۵۲۸۷)] علامہ عبدالحی لکھنوی نے اسے موضوعات کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ [الآثار المرفوعة فی الأخبار الموضوعة (ص: ۸٦)] امام شوکانیؒ، امام سیوطیؒ، امام ابن جوزیؒ، علامہ طاہر پٹنیؒ اور علامہ ابو اسحٰق حوینی نے بھی اسے موضوع کہا ہے۔ [الفوائد المجموعة (ص: ۵۲) اللآلی المصنوعة (۱/۱۵۸) الموضوعات (۱/۲۰٤) تذکرة الموضوعات (ص: ۵۳) النافلة فی الاحادیث الضعیفة والباطلة (ص: ۵٤)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت حکم بن عبداللہ الدیلی کی وجہ سے ضعیف ہے۔]

(2) [سورہ الزخرف: آیت ٤۵]

(3) [سورہ التوبہ: آیت ۱۲۸]

(4) [سورہ الدھر: آیت ۲]

سے زیادہ مبالغہ موجود ہے پھر اسی پر اکتفا کیوں نہ کیا گیا؟ تو اس کے جواب میں حضرت عطا خراسانی کا یہ قول پیش کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ کافروں نے رحمٰن کا نام بھی غیروں کا رکھ لیا تھا اس لیے رحیم کا لفظ بھی ساتھ لگایا گیا تا کہ کسی قسم کا وہم ہی نہ رہے۔ رحمٰن ورحیم صرف اللہ تعالیٰ ہی کا نام ہے۔ ابن جریر نے تاہم اس قول کی تصدیق کی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے کے عرب رحمٰن سے واقف ہی نہ تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی آیت ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ﴾ (الاسراء/ ١١٠) الخ نازل فرما کر ان کی تردید کی۔ حدیبیہ والے سال جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ لکھو تو کفار نے کہا تھا کہ ہم رحمٰن اور رحیم کو نہیں جانتے۔ بخاری میں یہ روایت موجود ہے۔ [1] بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم رحمٰن یمامہ کو جانتے ہیں کسی اور رحمٰن کو نہیں جانتے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ہے ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ﴾ (الفرقان/ ٦٠) الخ یعنی جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کے سامنے سجدہ کرو تو حیران زدہ ہو کر جواب دیتے ہیں کہ رحمٰن کون ہے؟ جسے ہم تیرے قول کی وجہ سے سجدہ کریں۔ درحقیقت یہ بدکار لوگ صرف عناد، تکبر، سرکشی اور دشمنی کی بنا پر رحمٰن سے انکار کرتے تھے نہ کہ وہ اس نام سے ناآشنا تھے۔ اس لیے کہ جاہلیت کے زمانے کے پرانے اشعار میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام رحمٰن موجود ہے جو انہی کے شاعروں کے شعر ہیں۔ سلامہ اور دوسرے شعراء کے اشعار میں ملاحظہ ہو۔ تفسیر ابن جریر میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہ رحمٰن فعلان کے وزن پر رحمت سے ماخوذ ہے اور کلام عرب سے ہے۔ وہ اللہ رفیق اور رقیق ہے جس پر رحم کرنا چاہے اور جس سے غصے ہو اس سے بہت دور اور اس پر بہت سخت گیر بھی ہے اسی طرح اس کے تمام نام ہیں۔ حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں رحمٰن کا نام دوسروں کے لیے منع ہے۔ خود اللہ تعالیٰ کا نام ہے لوگ اس نام پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا والی حدیث جس میں ہے کہ ہر آیت پر حضور ﷺ ٹھہرا کرتے تھے۔ [2] پہلے گذر چکی ہے اور ایک جماعت اسی طرح بسم اللہ الخ کو آیت قرار دے کر آیت الحمد کو الگ پڑھتی ہے اور بعض ملا کر پڑھتے ہیں۔ میم کو دو ساکن جمع ہو جانے کی وجہ سے زیر دیتے ہیں۔ جمہور کا بھی یہی قول ہے کوفی کہتے ہیں کہ بعض عرب میم کے زیر سے پڑھتے ہیں، ہمزہ کی حرکت زبر میم کو دیتے ہیں۔ جیسے ﴿الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (البقرہ/ ٢٥٥) ابن عطیہ کہتے ہیں کہ زبر کی قرات کسی سے بھی میرے خیال میں مروی نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی تفسیر ختم ہوئی۔ اب آگے سنیے۔

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الشروط: باب الشروط فی الجهاد و المصالحة (٢٧٣١، ٢٧٣٢)]

[2] [صحیح: ابو داؤد: کتاب الحروف القراءات: (٤٠٠١) ترمذی: کتاب القراءات: باب فی فاتحة الکتاب (٢٩٢٧)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [ارواء الغلیل (٣٤٣)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت بلحاظ سند ضعیف ہے مگر مسند احمد (٢٧٠٠٣) کی صحیح روایت اس سے بے نیاز کرتی ہے۔]

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے ○

الحمد للہ پڑھنے کے مختلف انداز: ساتوں قاری ﴿اَلْحَمْدُ﴾ کو دال پر پیش سے پڑھتے ہیں اور ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کو مبتدا خبر مانتے ہیں۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ اور روبہ بن عجاج رحمہ اللہ کا قول ہے کہ دال پر زبر کے ساتھ ہے اور فعل یہاں مقدر ہے۔ ابن ابی عبلہ رحمہ اللہ ﴿اَلْحَمْدُ﴾ کی دال کو اور للہ کے پہلے لام دونوں کو پیش کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس لام کو پہلے کے تابع کرتے ہیں اگرچہ اس کی شہادت عربی زبان میں ملتی ہے، لیکن شاذ ہے۔ حسن رحمہ اللہ اور زید بن علی رحمہ اللہ ان دونوں حرفوں کو زیر سے پڑھتے ہیں اور لام کے تابع دال کو کرتے ہیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اس کے سوا کوئی اس کے لائق نہیں، خواہ وہ مخلوق میں سے کوئی بھی ہو اس وجہ سے کہ تمام نعمتیں جنہیں ہم گن بھی نہیں سکتے، اس مالک کے سوا اور کوئی ان کی تعداد کو نہیں جانتا اسی کی طرف سے ہیں۔ اسی نے اپنی اطاعت کرنے کے تمام اسباب ہمیں عطا فرمائے۔ اسی نے اپنے فرائض پورے کرنے کے لیے تمام جسمانی نعمتیں ہمیں بخشیں۔ پھر بے شمار دنیوی نعمتیں اور زندگی کی تمام ضروریات ہمارے کسی حق کے بغیر ہمیں بن مانگے بخشیں۔ اس کی لازوال نعمتیں، اس کے تیار کردہ پاکیزہ مقام جنت کو ہم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ بھی اس نے ہمیں سکھا دیا پس ہم تو کہتے ہیں کہ اول آخر اسی مالک کی پاک ذات ہر طرح کی تعریف اور حمد و شکر کے لائق ہے۔ (1)

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ یہ ثنا کا کلمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ثنا خود آپ کی ہے اور اسی ضمن میں گویا یہ فرما دیا ہے کہ تم کہو ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ بعض نے کہا کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کہنا اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ ناموں اور اس کی بلند و بالا صفتوں سے اس کی ثنا کرنا ہے۔ اور ﴿اَلشُّكْرُ لِلّٰهِ﴾ کہنا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے احسان کا شکر یہ ادا کرنا ہے۔ (2) لیکن یہ قول ٹھیک نہیں۔ اس لیے کہ عربی زبان کو جاننے والے علماء کا اتفاق ہے کہ شکر کی جگہ حمد کا لفظ اور حمد کی جگہ شکر کا لفظ بولتے ہیں۔ جعفر صادق رحمہ اللہ ابن عطا صوفی رحمہ اللہ بھی فرماتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہر شکر کرنے والے کا کلمہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ نے ابن جریر کے قول کو معتبر کرنے کے لیے یہ دلیل بھی بیان کی ہے کہ اگر کوئی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ شُكْرًا﴾ کہے تو جائز ہے۔ دراصل علامہ ابن جریر کے اس دعوی میں اختلاف ہے، پچھلے علماء میں مشہور ہے کہ ﴿حمد﴾ کہتے ہیں زبانی تعریف بیان کرنے کو خواہ جس کی حمد کی جاتی ہو اس کی لازم صفتوں پر ہو یا متعدی صفتوں پر اور شکر صرف متعدی صفتوں پر ہوتا ہے اور وہ دل زبان اور جملہ ارکان سے ہوتا ہے۔ عرب شاعروں کے اشعار بھی اس پر دلیل ہیں۔

ہاں اس میں اختلاف ہے کہ حمد کا لفظ عام ہے یا شکر کا اور صحیح بات یہ ہے کہ اس میں عموم اس حیثیت سے خصوص ہے کہ 'حمد' کا لفظ جس پر واقع ہو وہ عام طور پر شکر کے معنوں میں آتا ہے۔ اس لیے کہ وہ لازم اور متعدی

---

(1) [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۱۲۵)] (2) [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۱۳۷)]

دونوں اوصاف پر آتا ہے شہ سواری اور کرم دونوں پر ﴿حَمِدْتُهٗ﴾ کہہ سکتے ہیں لیکن اس حیثیت سے وہ صرف زبان سے ادا ہو سکتا ہے یہ لفظ خاص اور 'شکر' کا لفظ عام ہے کیونکہ وہ قول، فعل اور نیت تینوں پر بولا جاتا ہے اور صرف متعدی صفتوں پر بولے جانے کے اعتبار سے 'شکر' کا لفظ خاص ہے۔ شہ سواری کے حصول پر "شَكَرْتُهٗ" نہیں کہہ سکتے البتہ ((شَكَرْتُهٗ عَلٰى كَرَمِهٖ وَاِحْسَانِهٖ اِلَيَّ)) کہہ سکتے ہیں۔ یہ تھا خلاصہ متاخرین کے قول کا واللہ اعلم۔

ابونصر اسماعیل بن حماد جوہری کہتے ہیں "حمد" مقابل ہے "ذم" کے۔ لہٰذا یوں کہتے ہیں "حَمِدْتُ الرَّجُلَ اَحْمَدُهٗ حَمْدًا وَّمَحْمَدَةً فَهُوَ حَمِيْدٌ وَّمَحْمُوْدٌ" تحمید میں حمد سے زیادہ مبالغہ ہے۔ حمد شکر سے عام ہے۔ کسی محسن کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کی ثنا کرنے کو شکر کہتے ہیں۔ عربی زبان میں "شَكَرْتُهٗ" اور "شَكَرْتُ لَهٗ" دونوں طرح کہتے ہیں۔ لیکن لام کے ساتھ کہنا زیادہ فصیح ہے۔ مدح کا لفظ حمد سے بھی زیادہ عام ہے اس لیے کہ زندہ مردہ بلکہ جمادات پر بھی مدح کا لفظ بول سکتے ہیں۔ کھانے اور مکان کی اور ایسی اور چیزوں کی بھی مدح کی جاتی ہے احسان سے پہلے، احسان کے بعد، لازم صفتوں پر، متعدی صفتوں پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو اس کا عام ہونا ثابت ہوا۔ واللہ اعلم۔

اقوالِ سلف کی روشنی میں حمد: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ" اور "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اور بعض روایتوں میں ہے کہ "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" کو تو ہم جانتے ہیں لیکن یہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کا کیا مطلب؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس کلمہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے پسند فرما لیا ہے اور بعض روایتوں میں ہے کہ اس کا کہنا اللہ کو بھلا لگتا ہے۔ [1] ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ کلمہ شکر ہے اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میرا شکر کیا۔ [2] اس کلمہ میں شکر کے علاوہ اس کی نعمتوں، ہدایتوں اور احسان وغیرہ کا اقرار بھی ہے۔ کعب احبار رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہ کلمہ اللہ تعالیٰ کی ثنا ہے۔ ضحاک کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی چادر ہے۔ ایک حدیث میں بھی ایسا ہی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب تم ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کہہ لو گے تو تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر لو گے اب اللہ تعالیٰ تمہیں برکت دے گا [3] اسود بن سریع ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ میں نے ذات باری تعالیٰ کی حمد میں چند اشعار کہے ہیں اگر اجازت ہو تو سناؤں فرمایا اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد

---

[1] [**ضعیف**: تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۱۵)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس میں حجاج بن ارطاۃ راوی مدلس ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے بھی اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔]

[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱۵۱) تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۱۳)]

[3] [**ضعیف**: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۵۲)] اس کی سند میں عیسیٰ بن ابراہیم راوی ضعیف ہے۔ امام بخاریؒ اور امام نسائیؒ نے اسے منکر الحدیث کہا ہے۔ امام ابن معینؒ نے فرمایا ہے کہ یہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ امام ابوحاتمؒ نے اسے متروک الحدیث کہا ہے، اسی طرح امام نسائیؒ نے اسے متروک بھی کہا ہے اور امام ذہبیؒ نے بھی اسے متروک کہا ہے۔ [میزان الاعتدال (۳/۳۰۸)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو سخت ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت سخت ضعیف و مردود ہے۔]

بہت پسند ہے۔ [1] (مسند احمد و نسائی)

ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افضل ذکر "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" ہے اور افضل دعا "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" ہے۔ [2] امام ترمذی اس حدیث کو حسن غریب کہتے ہیں۔ ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نعمت دی اور وہ اس پر "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہے تو دی ہوئی نعمت لے لی ہوئی سے افضل ہوگی۔ [3]

فرماتے ہیں اگر میری امت میں سے کسی کو اللہ تعالیٰ تمام دنیا دے دے اور وہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہے تو یہ کلمہ ساری دنیا سے افضل ہوگا۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا دے دینا اتنی بڑی نعمت نہیں جتنی "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ" کہنے کی توفیق دینا ہے اس لیے کہ دنیا تو فانی ہے اور اس کلمہ کا ثواب باقی ہی باقی ہے۔ [4] جیسے کہ قرآن پاک میں ہے ﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ﴾ [5] الخ یعنی مال اور اولاد دنیا کی زینت ہے اور نیک اعمال ہمیشہ باقی رہنے والے ثواب والے اور نیک امید والے ہیں۔ ابن ماجہ میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک شخص نے ایک مرتبہ کہا "یَا رَبِّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِی لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ" تو فرشتے گھبرا گئے کہ ہم اس کا کتنا اجر لکھیں۔ آخر اللہ تعالیٰ سے انہوں نے عرض کی کہ تیرے ایک بندے نے ایک ایسا کلمہ کہا ہے کہ ہم نہیں جانتے اسے کس طرح لکھیں، پروردگار نے باوجود جاننے کے ان سے پوچھا کہ اس نے کیا کہا ہے؟ انہوں نے بیان کیا کہ اس نے یہ کلمہ کہا ہے، فرمایا تم یونہی اسے لکھ لو میں آپ

---

[1] [حسنه الالبانی: شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحیح الادب المفرد (ص: ۳۲۷)] دیکھئے: نسائی فی السنن الکبری (۷۷٤٥) مسند احمد (۳/٤۳٥) طحاوی فی شرح معانی الآثار (٤/۲۹۸) طبرانی کبیر (۱/۸٤٤) ابن عدی (٥/۱۷٦۳) ابو نعیم فی المعرفۃ (۸۹۷)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے شواہد کی وجہ سے حسن کا درجہ دیا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف ہے اور صحیح مسلم (۲۷٦۰) میں ہے کہ اللہ سے زیادہ کوئی بھی مدح پسند نہیں کرتا۔ اور یہی روایت کافی ہے۔]

[2] [حسن: ترمذی: کتاب الدعوات: باب ما جاء ان دعوۃ المسلم مستجابه (۳۳۸۳) ابن ماجه: کتاب الادب: باب فضل الحامدین (۳۸۰۰) مستدرك حاکم (۱/٤۹۸) نسائی فی السنن الکبری (۱۰٦٦۷) حاکم (۱/٤۹۸) ابن عبد البر فی التمهید (٦/٤۲)] امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ اور شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [السلسلة الصحیحة (۱٤۹۷)] حافظ زبیر علی زئی نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

[3] [حسن: ابن ماجه: کتاب الادب: باب فضل الحامدین (۳۸۰٥) الطبرانی فی الاوسط (۱۳۷۹)] حافظ بوصیری رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ [الزوائد (۳/۱۹۲)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ [کما فی السلسلة الضعیفة (٥/٢٤)]

[4] [موضوع: ابن عساکر (۱٥/۲۷٦)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے موضوع کہا ہے۔ [السلسلة الضعیفة (۲/۲٦۷)، (۸۷٥، ۸۷٦)] کیونکہ اس کی سند میں ابو مفضل محمد بن عبداللہ راوی متروک ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے موضوع کہا ہے۔]

[5] [سورہ الکھف: آیت ٤٦]

اسے اپنی ملاقات کے وقت اس کا اجر دے دوں گا۔ (۱)

قرطبی رحمہ اللہ ایک جماعت علماء سے نقل کرتے ہیں کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" سے بھی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ افضل ہے کیونکہ اس میں توحید اور حمد دونوں ہیں۔ اور علماء کا خیال ہے کہ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" افضل ہے اس لیے کہ ایمان و کفر میں یہی فرق کرتا ہے' اسی کے کہلوانے کے لیے کفار سے لڑائیاں کی جاتی ہیں۔ جیسے کہ صحیح بخاری صحیح مسلم کی حدیث میں ہے (۲) ایک اور مرفوع حدیث میں ہے کہ جو کچھ میں نے اور مجھ سے پہلے کے تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے کہا ہے ان میں سب سے افضل ذکر "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ" ہے۔ (۳) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ افضل ذکر "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" اور افضل دعا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" ہے۔ (۴) ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

الحمد میں الف لام استغراق کا ہے یعنی حمد کی تمام تر قسمیں سب کی سب صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہیں۔ جیسے کہ حدیث میں ہے کہ باری تعالیٰ تیرے ہی لیے تمام تعریفیں ہیں اور تمام ملک ہے۔ تیرے ہی ہاتھ تمام بھلائیاں ہیں اور تمام کام تیری ہی طرف لوٹتے ہیں۔ (۵)

لفظ رب کی توضیح: رب کہتے ہیں مالک اور متصرف کو لغت میں اس کا اطلاق سردار اور اصلاح کے لیے تبدیلیاں کرنے والے پر بھی ہوتا ہے اور ان سب معانی کے اعتبار سے ذات باری کے لیے یہ خوب جچتا ہے۔ رب کا لفظ بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے پر نہیں کہا جا سکتا ہاں اضافت کے ساتھ ہو تو اور بات ہے جیسے "رَبُّ الدَّارِ" یعنی گھر والا وغیرہ۔ بعض کا تو قول ہے کہ اسم اعظم یہی ہے۔

---

(۱) [**ضعیف**: ابن ماجه : كتاب الادب : باب فضل الحامدين (۳۸۰۱)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [التعليق الرغيب (۲/۲۵۳) ضعيف الترغيب (۹۶۱)] شیخ مصطفی السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اس کی سند کو ضعیف کہتے ہیں۔]

(۲) [**صحیح**: صحيح بخاری : كتاب الزكاة : باب وجوب الزكاة (۱۳۹۹) صحيح مسلم : كتاب الايمان : باب الامر بالقتال (۲۰)]

(۳) [**حسن**: ترمذی : كتاب الدعوات : باب في دعاء يوم عرفة (۳۵۸۵)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [السلسلة الصحيحة (۱۵۰۲)] شیخ مصطفی السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث شواہد کی وجہ سے حسن ہے۔ حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت اپنے تمام شواہد کے ساتھ ضعیف ہی ہے۔]

(۴) [**حسن**: ترمذی : كتاب الدعوات : باب ما جاء ان دعوة المسلم مستجابة (۳۳۸۳) ابن ماجه : كتاب الادب : باب فضل الحامدين (۳۸۰۰) النسائی فی عمل اليوم والليلة (۸۳۱) صحيح ابن حبان (۸۴۶)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [السلسلة الصحيحة (۱۴۹۷)] شیخ مصطفی السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے حسن کہتے ہیں۔]

(۵) [**ضعیف**: مسند احمد (۵/۳۴۶) مجمع الزوائد (۱۰/۹۵) بيهقی فی شعب الايمان (۴۴۰۰) الديلمی فی الفردوس (۶۸۱۷)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعيف الترغيب (۹۴۳)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرنے والا راوی مبہم ہے۔]

لفظ عالمین کی توضیح: ﴿عَالَمِيْنَ﴾ جمع ہے۔ ”عَالَم“ کی اللہ تعالیٰ کے سوا تمام مخلوق کو عالم کہتے ہیں۔ لفظ عالم بھی جمع ہے اور اس کا واحد لفظ ہے ہی نہیں۔ آسمان کی مخلوق خشکی اور تری کی مخلوقات کو بھی عوالم یعنی کئی عالم کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک ایک زمانے ایک ایک وقت کو بھی عالم کہا جاتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ اس سے مراد کل مخلوق ہے خواہ آسمانوں کی ہو یا زمینوں کی یا ان کے درمیان کی، خواہ ہمیں اس کا علم ہو یا نہ ہو۔ علی ہذا القیاس۔ اس سے جنات اور انسان بھی مراد لیے گئے ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ مجاہد رحمہ اللہ اور ابن جریج رحمہ اللہ سے بھی یہ مروی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی غیر معتبر سند سے یہی منقول ہے اس قول کی دلیل قرآن کی آیت ﴿لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيْرًا﴾ (الفرقان / ١) بھی بیان کی جاتی ہے یعنی تا کہ وہ ﴿عَالَمِيْنَ﴾ یعنی جن اور انس کے لیے ڈرانے والا ہو جائے۔ فراء اور ابو عبید کا قول ہے کہ سمجھدار کو عالم کہا جاتا ہے لہٰذا انسان، جنات، فرشتے، شیاطین کو عالم کہا جائے گا۔ جانوروں کو نہیں کہا جائے گا۔ زید بن اسلم رضی اللہ عنہ ابو محیص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر روح والی چیز کو عالم کہا جاتا ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں۔ ہر قسم کو ایک عالم کہتے ہیں۔ مروان بن محمد عرف جعد جن کا لقب حمار تھا جو بنو امیہ میں سے اپنے زمانے کے خلیفہ تھے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سترہ ہزار عالم پیدا کیے ہیں۔ آسمانوں والے ایک عالم، زمینوں والے سب ایک عالم اور باقی کو اللہ ہی جانتا ہے مخلوق کو ان کا علم نہیں۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں انسان کل ایک عالم ہیں، سارے جنات کا ایک عالم ہے اور ان کے سوا اٹھارہ ہزار یا چودہ ہزار عالم اور ہیں۔ فرشتے زمین پر ہیں اور زمین کے چار کونے ہیں، ہر کونے میں ساڑھے تین ہزار عالم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ قول بالکل غریب ہے اور ایسی باتیں جب تک کسی صحیح دلیل سے ثابت نہ ہوں ماننے کے قابل نہیں ہوتیں۔ حمیری رحمہ اللہ کہتے ہیں ایک ہزار امتیں ہیں، چھ سو تری میں اور چار سو خشکی میں۔ سعید بن مسیب سے یہ بھی مروی ہے۔ ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانے میں ایک سال ٹڈیاں نہ نظر آئیں بلکہ تلاش کرنے کے باوجود پتہ نہ چلا۔ آپ غمگین ہو گئے۔ یمن، شام اور عراق کی طرف سوار دوڑائے کہ کہیں بھی ٹڈیاں نظر آتی ہیں یا نہیں تو یمن والے سوار تھوڑی سی ٹڈیاں لے کر آئے اور امیر المومنین کے سامنے پیش کیں آپ نے انہیں دیکھ کر تکبیر کہی اور فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ فرماتے تھے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار امتیں پیدا کی ہیں جن میں سے چھ سو تری میں ہیں اور چار سو خشکی میں ان میں سے سب سے پہلے جو امت ہلاک ہو گی وہ ٹڈیاں ہوں گی بس ان کی ہلاکت کے بعد پے در پے اور سب امتیں ہلاک ہو جائیں گی جس طرح کہ تسبیح کا دھاگا ٹوٹ جائے اور ایک کے بعد ایک سب موتی جھڑ جاتے ہیں۔ [1] اس

---

[1] [باطل موضوع: مجمع الزوائد (٣٢٢/٧) ، (١٢٤٣٣) الکامل لابن عدی (١٩٩٠/٥) البدایۃ والنہایۃ (٣٠/١) بیہقی فی شعب الایمان (٣٢/٧) تاریخ بغداد للخطیب (٢١٧/١١)] امام ابن جوزیؒ نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے۔[١٤٠١٣/٣] امام ابن حبانؒ نے فرمایا ہے کہ بلاشبہ یہ من گھڑت بات ہے، نبوی کلام نہیں۔ امام سیوطیؒ نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔[الدر المنثور (٣٦/١)] اہل علم کے نزدیک اس کی سند میں عبید بن واقد قیسی اور محمد بن عیسیٰ ہلالی دونوں راوی ضعیف ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے اسے سخت ضعیف کہا ہے۔]

حدیث کے راوی محمد بن عیسیٰ ہلالی ضعیف ہیں۔سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے بھی یہ قول مروی ہے۔وہب بن منبہ فرماتے ہیں اٹھارہ ہزار عالم ہیں' دنیا کی ساری کی ساری مخلوق ان میں سے ایک عالم ہے۔حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں چالیس ہزار عالم ہیں ساری دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔زجاج کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے دنیا آخرت میں جو کچھ پیدا کیا ہے وہ سب عالم ہے۔قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول صحیح ہے اس لیے کہ یہ تمام عالمین پر مشتمل لفظ ہے۔جیسے فرعون کے اس سوال کے جواب میں کہ رب العالمین کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آسمانوں زمینوں اور دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا رب۔ (1) عالم کا لفظ علامت سے مشتق ہے اس لیے کہ عالم یعنی مخلوق اپنے پیدا کرنے والے اور بنانے والے پر نشان اور اس کی وحدانیت پر علامت ہے (2) جیسے کہ ابن معتز شاعر کا قول ہے:

فَيَا عَجَبًا كَيْفَ يُعْصَى الإِلٰهُ ... أَمْ كَيْفَ يَجْحَدُهُ الْجَاحِدُ

وَفِي كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ ... تَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ وَاحِدُ

یعنی تعجب ہے کس طرح اللہ کی نافرمانی کی جاتی ہے اور کس طرح اُس سے انکار کیا جاتا ہے حالانکہ ہر چیز میں نشانی ہے جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔

اَلْحَمْدُ الخ کے بعد اب "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کی تفسیر پڑھیے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲

بہت بخشش کرنے والا بڑا مہربان ۝

اللہ کے کچھ صفاتی نام: اس کی تفسیر پہلے پوری گذر چکی ہے اب اعادہ کی ضرورت نہیں۔قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کے وصف کے بعد ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کا وصف ترہیب یعنی ڈراوے کے بعد ترغیب یعنی امید ہے۔جیسے فرمایا ﴿نَبِّئْ عِبَادِيْ﴾ (الحجر/٤٩) الخ میرے بندوں کو خبر دو کہ میں ہی بخشنے والا مہربان ہوں اور میرے عذاب بھی دردناک عذاب ہیں۔ (3) اور فرمایا تیرا رب جلد سزا کرنے والا اور مہربان اور بخشش بھی کرنے والا ہے۔ (4) رب کے لفظ میں ڈراوا ہے اور رحمٰن اور رحیم کے لفظ میں امید ہے۔صحیح مسلم شریف میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر ایماندار اللہ کے غضب وغصہ سے اور اس کے سخت عذاب سے پورا واقف ہوتا (تو اس وقت) اس کے دل سے جنت کی طمع ہٹ جاتی اور اگر کافر

---

(1) [سورة الشعرآء: آيت ٢٣_٢٤]

(2) [تفسير قرطبی (١٣٩/١)]

(3) [تفسير قرطبی (١٣٩/١)]

(4) [سورة الانعام: آيت ١٦٥]

(5) [صحيح: صحيح بخاری: كتاب الرقاق: باب الرجاء مع الخوف (٦٤٦٩) صحيح مسلم: كتاب التوبة: باب فی سعة رحمة الله تعالى (٢٧٥٥) ترمذی (٣٥٤٢) مسند احمد (٣٣٤/٢)]

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی رحمتوں کو پوری طرح جان لیتا تو کبھی ناامید نہ ہوتا۔ ⑤

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

بدلے کے دن (یعنی قیامت) کا مالک ○

حقیقی مالک کون؟ بعض قاریوں نے "مَلِكِ" پڑھا ہے اور باقی سب نے۔ "مَالِكِ" اور دونوں قراتیں صحیح اور متواتر ہیں اور سات قراتوں میں سے ہیں اور مالك کے لام کے زیر اور اس کے سکون کے ساتھ۔ اور "مَلِيْكِ" اور مَلِكِي بھی پڑھا گیا ہے پہلے کی دونوں قراتیں معانی کی رو سے ترجیح والی ہیں اور دونوں صحیح ہیں اور اچھی بھی۔ زمخشری نے مَلِكِ کو ترجیح دی ہے اس لیے کہ حرمین والوں کی یہ قرات ہے۔ اور قرآن میں بھی ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ (غافر/١٦) اور ﴿قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ﴾ ① ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی حکایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے "مَلِكِ" پڑھا اس بنا پر کہ فَعِلٌ اور فَاعِلٌ اور مَفْعُوْلٌ آتا ہے لیکن یہ شاذ اور بے حد غریب ہے۔ ابوبکر بن داود رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک غریب روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے تینوں خلفاء رضی اللہ عنہم اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے لڑکے مالک پڑھتے تھے۔ ابن شہاب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مروان نے "مَلِكِ" پڑھا۔ میں کہتا ہوں مروان کو اپنی اس قرات کی صحت کا علم تھا جو راوی حدیث ابن شہاب رحمہ اللہ کو علم نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن مردویہ نے کئی سندوں سے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ مَالِكِ پڑھتے تھے۔ مَالِكِ کا لفظ مِلْكٌ سے ماخوذ ہے جیسے کہ قرآن میں ہے ﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ﴾ (مریم/ ٤٠) الخ یعنی زمین اور اس کے اوپر کی تمام مخلوق کے مالک ہم ہی ہیں اور ہماری ہی طرف سب لوٹا کر لائے جائیں گے۔ اور فرمایا ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ○ مَلِكِ النَّاسِ﴾ (الناس/ ١-٢) یعنی کہہ کہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب اور لوگوں کے مالک کی۔ اور مَلِكَ کا لفظ مُلْكٌ سے ماخوذ ہے جیسے فرمایا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ (غافر/١٦) الخ یعنی آج ملک کس کا ہے صرف اللہ واحد غلبہ والے کا۔ اور فرمایا: ﴿قَوْلُهُ الْحَقُّ﴾ الخ اسی کا فرمان حق ہے اور اسی کا سب ملک ہے۔ اور فرمایا آج ملک رحمٰن ہی کا ہے اور آج کا دن کافروں پر بہت سخت ہے۔ ② اس فرمان میں قیامت کے دن کے ساتھ ملکیت کی تخصیص کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے، اس لیے کہ پہلے اپنا وصف ﴿رَبُّ الْعَالَمِيْنَ﴾ ہونا بیان کر چکا ہے دنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔ قیامت کے دن کے ساتھ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس دن تو کوئی ملکیت کا دعویدار بھی نہ ہوگا۔ بلکہ بغیر اس حقیقی مالک کی اجازت کے زبان تک نہ ہلا سکے گا۔ جیسے فرمایا جس دن روح القدس اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے اور کوئی کلام نہ کر سکے گا۔ یہاں تک کہ رحمٰن اسے اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔ ③ دوسری جگہ ارشاد ہے سب

---

① [سورہ الانعام : آیت ٧٣]
② [سورۃ الفرقان : آیت ٢٦]
③ [سورۃ النبآء : آیت ٣٨]
④ [سورۃ طٰہٰ : آیت ١٠٨]

پورا پورا بدلہ دے گا اور وہ جان لیں گے [6] اور جگہ ہے ﴿اَئِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ﴾ [7] کیا ہم کو بدلہ دیا جائے گا؟ حدیث میں ہے ''دانا وہ ہے جو اپنے نفس سے خود حساب لے اور موت کے بعد کام آنے والے اعمال کرے۔'' [1] جیسے کہ حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ تم خود اپنی جانوں سے حساب لو اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کا خود وزن کرلو اس سے پہلے کہ وہ ترازو میں رکھے جائیں اور اس بڑی پیشی کے لیے تیار ہو جاؤ جب تم اس اللہ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں جیسے خود رب عالم نے فرمایا جس دن تم پیش کیے جاؤ گے کوئی ڈھکی بات چھپے گی نہیں۔ [2]

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝

صرف تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں ○

عبادت کی حقیقت: ساتوں قاریوں اور جمہور نے اسے ﴿اِيَّاكَ﴾ پڑھا ہے۔ عمرو بن فائد رحمہ اللہ نے "اِيَاكَ" پڑھا ہے۔ لیکن یہ قراۃ شاذ اور مردود ہے۔ اس لئے کہ ''اِيَا'' کے معنی سورج کی روشنی کے ہیں اور بعض نے "أَيَّاكَ" پڑھا اور بعض نے "أَيَـاكَ" پڑھا ہے۔ اور بعض نے "هَيَّـاكَ" پڑھا ہے۔ عرب شاعروں کے شعر میں بھی "هَيَّاكَ" ہے۔ ﴿نَسْتَعِيْنُ﴾ کی یہی قرات تمام کی ہے۔ سوائے یحییٰ بن وثاب اور اعمش کے۔ یہ دونوں پہلے نون کو زیر سے پڑھتے ہیں۔ قبیلہ بنو اسد، ربیعہ، بنو تمیم کی لغت اسی طرح پر ہے۔ لغت میں عبادت کہتے ہیں ذلت اور پستی کو طریق معبد اس راستے کو کہتے ہیں جو ذلیل ہو۔ اسی طرح "بَعِيْرٌ مُّعَبَّدٌ" اس اونٹ کو کہتے ہیں جو بہت دبا اور جھکا ہوا ہو اور شریعت میں عبادت نام ہے محبت، خشوع، خضوع اور خوف کے مجموعے کا۔ لفظ "اِيَّـاكَ" کو جو مفعول ہے پہلے لائے اور پھر اسی کو دہرایا تا کہ اس کی اہمیت ہو جائے اور عبادت اور طلب مدد اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہو جائے تو اس جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور نہ کریں گے۔ اور تیرے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے اور نہ کریں گے۔ کامل اطاعت اور پورے دین کا حاصل صرف یہی دو چیزیں ہیں۔

بعض سلف کا فرمان ہے کہ سارے قرآن کا راز سورۂ فاتحہ میں ہے اور پوری سورت کا راز اس آیت ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ میں ہے آیت کے پہلے حصہ میں شرک سے بیزاری کا اعلان ہے اور دوسرے جملہ

---

[1] [ضعیف: ترمذی: کتاب صفۃ القیامۃ (۲٤٥۹) ابن ماجہ: کتاب الزھد (٤۲٦۰) مسند احمد (١٢٤/٤) مستدرک حاکم (٥٧/١) طیالسی (١١٢٢) بیہقی فی الکبری (٣٦٩/٣) وفی شعب الایمان (١٠٥٤٦) ابو نعیم فی الحلیۃ (٢٦٧/١)] امام حاکم نے اسے بخاری کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ امام ذہبی نے فرمایا ہے کہ اس میں ابوبکر بن ابی مریم راوی ضعیف ہے۔ امام ابن عدی نے فرمایا ہے کہ یہ ایسا راوی ہے جس کی روایت قابل حجت نہیں ہوتی۔ ابن طاہر مقدسی نے بھی اس راوی کو ضعیف کہا ہے۔ [ذخیرۃ الحفاظ (٤٤١٩)] امام ترمذی نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ جبکہ شیخ البانی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف ترمذی (٤٣٦) السلسلۃ الضعیفۃ (٥٣١٩) ضعیف الترغیب (١٩٠٩) ضعیف ابن ماجہ (٩٣٠) ضعیف الجامع (٤٣٠٥)] مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

[2] [سورۃ الحاقۃ: آیت ١٨]

میں اپنی طاقتوں اور قوتوں کے کمال کا انکار ہے اور اللہ عزوجل کی طرف اپنے تمام کاموں کی سپردگی ہے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ جیسے فرمایا ﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ (ھود/ ۱۲۳) الخ یعنی اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو تمہارا رب تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔ فرمایا ﴿قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ﴾ (الملک/ ۲۹) الخ کہہ دے کہ وہی رحمٰن ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور اسی پر ہم نے توکل کیا فرمایا ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا﴾ (المزمل/ ۹) یعنی مشرق مغرب کا رب وہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز سمجھ۔ یہی مضمون اس آیۃ کریمہ میں ہے اس سے پہلے کی آیات میں تو خطاب نہ تھا لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کیا گیا ہے جو نہایت لطافت اور مناسبت رکھتا ہے اس لیے کہ جب بندے نے اللہ تعالیٰ کی صفت وثنا بیان کی تو قرب الٰہی میں حاضر ہو گیا اور اللہ جل جلالہ کے حضور میں پہنچ گیا' اب اس مالک کو خطاب کر کے اپنی ذلت اور مسکینی کا اظہار کرنے لگا اور کہنے لگا کہ الٰہ ہم تو تیرے ذلیل غلام ہیں اور اپنے تمام کاموں میں تیرے ہی محتاج ہیں۔ اس آیت میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس سے پہلے کے تمام جملوں میں خبر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی بہترین صفات پر اپنی ثناء آپ کی تھی اور بندوں کو اپنی ''ثنا'' انہی الفاظ کے ساتھ بیان کرنے کا ارشاد فرمایا تھا اسی لیے اس شخص کی نماز صحیح نہیں جو اس سورت کو پڑھنا جانتا ہو اور پھر نہ پڑھے۔ جیسے کہ بخاری مسلم کی حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں جو نماز میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ ① صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان نصف نصف بانٹ لیا ہے اس کا آدھا حصہ میرا اور آدھا حصہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ طلب کرے۔ جب بندہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی۔ جب کہتا ہے ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب وہ کہتا ہے ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔ جب وہ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ مانگے۔ پھر وہ آخر سورت تک پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرا بندہ جو مجھ سے مانگے اس کے لیے ہے۔ ② حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے رب ہم خاص تیری ہی توحید مانتے ہیں اور تجھ سے ڈرتے ہیں اور تیری اسی ذات سے امید رکھتے ہیں تیرے سوا کسی اور کی نہ ہم عبادت کریں' نہ ڈریں' نہ امید رکھیں۔ اور ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ سے یہ مراد

---

① [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الاذان: باب وجوب القراۃ للامام والماموم (۷۵۶) صحیح مسلم: کتاب الصلوۃ: باب وجوب قراءۃ فاتحۃ فی کل رکعۃ (۳۹۴)]

② [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الصلوۃ: باب وجوب قراءۃ فاتحۃ فی کل رکعۃ (۳۹۵)]

③ [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۱۹)]

ہے کہ ہم تیری تمام اطاعت اور اپنے تمام کاموں میں تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔[3] قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے کہ تم سب اسی کی خالص عبادت کرو اور اپنے تمام کاموں میں اسی سے مدد مانگو[1] ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کو پہلے لانا اس لیے ہے کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی ہے اور مدد کرنا یہ عبادت کا وسیلہ اور اہتمام اور اس پر پختگی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زیادہ اہمیت والی چیز کو مقدم کیا جاتا ہے اور اس سے کمتر کو اس کے بعد لایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں جمع کے صیغہ کو لانے کی یعنی ہم کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ جمع کے لیے ہے تو کہنے والا تو ایک ہے اور اگر تعظیم کے لیے ہے تو اس مقام پر نہایت نامناسب ہے کیونکہ یہاں تو مسکینی اور عاجزی ظاہر کرنا مقصود ہے اس کا جواب یہ ہے کہ گویا ایک بندہ تمام بندوں کی طرف سے خبر دے رہا ہے بالخصوص جبکہ وہ جماعت میں کھڑا ہو یا امام بنا ہوا ہو۔ پس گویا وہ اپنی اور اپنے سب مومن بھائیوں کی طرف سے اقرار کر رہا ہے کہ وہ سب اس کے بندے ہیں اور اسی کی عبادت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور یہ ان کی طرف سے بھلائی کے لیے آگے بڑھا ہوا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ تعظیم کے لیے ہے گویا کہ بندہ جب عبادت میں داخل ہوتا ہے تو اسی کو کہا جاتا ہے کہ تو شریف ہے اور تیری عزت ہمارے دربار میں بہت زیادہ ہے تو اب ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کہا یعنی اپنے تئیں عزت سے یاد کر۔ ہاں اگر عبادت سے الگ ہو تو اس وقت ہم نہ کہے چاہے ہزاروں لاکھوں میں ہو کیونکہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محتاج اور اس کے دربار کے فقیر ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں جو تواضع اور عاجزی ہے وہ "إِيَّاكَ عَبَدْنَا" میں نہیں اس لیے کہ اس میں اپنے نفس کی بڑائی اور اپنی عبادت کی اہلیت پائی جاتی ہے حالانکہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی پوری عبادت اور جیسی چاہیے ویسی ثنا وصفت بیان کرنے پر قدرت ہی نہیں رکھتا۔

کسی شاعر کا قول ہے (ترجمہ) کہ مجھے اس کا غلام کہہ کر ہی پکارو کیونکہ میرا سب سے اچھا نام یہی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام عبد یعنی غلام ان ہی جگہوں پر لیا جہاں اپنی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر کیا ہے جیسے قرآن نازل کرنا، نماز میں کھڑے ہونا، معراج کرانا وغیرہ۔ فرمایا ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ﴾ (الکہف/ ۱) الخ فرمایا ﴿وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ﴾ (الجن/ ۱۹) الخ فرمایا ﴿سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ﴾ (الاسراء/ ۱) ساتھ ہی قرآن پاک نے یہ تعلیم دی کہ اے نبی جس وقت تمہارا دل مخالفین کے جھٹلانے کی وجہ سے تنگ ہو تو تم میری عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ فرمان ہے ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ﴾ (الحجر/ ۹۷) الخ یعنی ہم جانتے ہیں کہ مخالفین کی باتیں تیرا دل دکھاتی ہیں تو ایسے وقت اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کر اور سجدہ کر اور موت کے وقت تک اپنے رب کی عبادت میں لگا رہ۔ رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے نقل کیا ہے کہ عبودیت کا مقام رسالت کے مقام سے افضل ہے کیونکہ عبادت کا تعلق مخلوق سے خالق کی طرف ہوتا اور رسالت کا تعلق حق سے خلق کی طرف ہوتا ہے اور اس دلیل سے بھی کہ عبد کی کل اصلاح کے کاموں کا متولی

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۲۰)]

خود اللہ تبارک وتعالیٰ ہوتا ہے اور رسول اپنی امت کی مصلحتوں کا والی ہوتا ہے لیکن یہ قول غلط ہے اور اس کی یہ دونوں دلیلیں بھی بودی اور لا حاصل ہیں۔ افسوس رازی رحمہ اللہ نے نہ تو اس کو ضعیف کہا نہ اسے رد کیا۔ بعض صوفیوں کا قول ہے کہ عبادت یا تو ثواب حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے یا عذاب دفع کرنے کے لیے وہ کہتے ہیں یہ کوئی فائدے کی بات نہیں اس لیے کہ اس وقت مقصود خود اپنی مراد کا حاصل کرنا ٹھہرا۔ اس کی تکالیف کے لیے آمادگی کرنا یہ بھی ضعیف ہے۔ اعلیٰ مرتبہ عبادت کا یہ ہے کہ انسان اس مقدس ذات کی جو تمام کامل صفتوں سے موصوف ہے محض اس کی ذات کے لیے عبادت کرے اور مقصود کچھ نہ ہو۔ اسی لیے نمازی کی نیت نہ نماز پڑھنے کی ہوتی ہے اگر وہ ثواب پانے اور عذاب سے بچنے کے لیے ہو تو باطل ہے۔ دوسرا گروہ ان کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عبادت کا اللہ تعالیٰ کے لیے ہونا کچھ اس کے خلاف نہیں کہ ثواب کی طلب اور عذاب کا بچاؤ مطلوب نہ ہو اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک اعرابی نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا حضور ﷺ میں نہ تو آپ جیسا پڑھنا جانتا ہوں نہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جیسا میں تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور جہنم سے نجات چاہتا ہوں حضور ﷺ نے فرمایا اسی کے قریب قریب ہم بھی پڑھتے ہیں۔ (1)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دکھا ○

اللہ سے دعا مانگنے کا طریقہ: جمہور نے تو ﴿صِرَاطَ﴾ پڑھا ہے۔ بعض نے "سِرَاطَ" کہا ہے اور زے کی بھی ایک قراۃ ہے۔ فراء کہتے ہیں بنی عذرہ اور بنی کلب کی قراۃ یہی ہے چونکہ پہلے ثنا وصفت بیان کی تو اب مناسب تھا کہ اپنی حاجت طلب کرے۔ جیسے کہ پہلے حدیث میں گذر چکا ہے کہ اس کا آدھا حصہ میرے لیے ہے اور آدھا میرے بندے کے لیے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جو وہ طلب کرے۔ خیال کیجیے کہ اس میں کس قدر لطافت اور عمدگی ہے کہ پہلے پروردگار عالم کی تعریف وتوصیف کی، پھر اپنی اور اپنے بھائیوں کی حاجت طلب کی۔ یہ وہ لطیف انداز ہے جو مقصود کو حاصل کرنے اور مراد کو پالینے کے لیے تیر بہدف ہے، اس کامل طریقہ کو پسند فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی ہدایت کی۔

کبھی سوال اس طرح ہوتا ہے کہ سائل اپنی حالت اور حاجت کو ظاہر کر دیتا ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا ﴿رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ﴾ (القصص / ٢٤) پروردگار جو بھلائیاں تو میری طرف نازل فرمائے میں ان کا محتاج ہوں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے بھی اپنی دعا میں کہا ﴿لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ

---

(1) [صحیح: ابو داؤد: کتاب الصلوۃ: باب تخفیف الصلوۃ (٧٩٢) ابن ماجہ: کتاب الدعاء: باب الجوامع من الدعاء (٣٨٤٧) مسند احمد (٤٧٤/٣) ابن حبان (الموارد ـ ٥١٤)] حافظ بوصیری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند صحیح اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔ شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح ابو داود (٧١٠) صحیح ابن ماجہ (٧٤٢)] مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

﴿كُنْتُ مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الانبیاء/۸۷) الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے میں ظالموں میں سے ہوں کبھی سوال اس طرح بھی ہوتا ہے کہ سائل صرف تعریف اور بزرگی بیان کر کے چپ ہو جاتا ہے جیسے کسی شاعر کا قول ہے کہ مجھے اپنی حاجت کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تیری مہربانیوں بھری بخشش مجھے کافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ داد و دہش تیری پاک عادتوں میں داخل ہے لیکن تیری پاکیزگی بیان کر دینا' تیری حمد و ثنا کرنا ہی مجھے اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے کافی ہے۔ ہدایت کے معنی یہاں پر ارشاد اور توفیق کے ہیں۔

کبھی تو ہدایت بنفسہٖ متعدی ہوتی ہے جیسے یہاں ہے تو معنی "اَلْهِمْنَا وَفِّقْنَا اُرْزُقْنَا" اور "اَعْطِنَا" یعنی ہمیں عطا فرمائے ہوں گے اور جگہ ہے۔ ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (البلد/۱۰) یعنی ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے بھلائی اور برائی دونوں کے۔ اور کبھی ہدایت "الٰی" کے ساتھ متعدی ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا ﴿اِجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (النحل/۱۲۱) اور فرمایا ﴿فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ﴾ (الصافات/۲۳) یہاں "ہدایت" ارشاد اور دلالت کے معنی میں ہے۔ اسی طرح فرمان ہے ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ﴾ (الشوری/۵۲) الخ یعنی تو البتہ سیدھی راہ دکھاتا ہے اور کبھی ہدایت لام کے ساتھ متعدی ہوتی ہے جیسے جنتیوں کا قول قرآن کریم میں ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا﴾ (الاعراف/۴۳) یعنی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس کی راہ دکھائی یعنی توفیق دی اور ہدایت والا بنایا۔

صراط مستقیم کا مفہوم: صراط مستقیم کے معنی پڑھیے۔ امام ابو جعفر بن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں مراد اس سے واضح اور صاف راستہ ہے جو کہیں سے ٹیڑھا نہ ہو۔ عرب کی لغت میں اور شاعروں کے شعر میں یہ معنی صاف طور پر پائے جاتے ہیں اور اس پر بے شمار شواہد موجود ہیں۔ صراط کا استعمال بطور استعارہ کے قول اور فعل پر بھی آتا ہے اور پھر اس کا وصف استقامت اور ٹیڑھ پن کے ساتھ بھی آتا ہے۔ سلف اور متاخرین مفسرین سے اس کی بہت سی تفسیریں منقول ہیں اور ان سب کا خلاصہ ایک ہی ہے اور وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور تابعداری ہے۔ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ صراط مستقیم کتاب اللہ ہے۔ [1] (ابن ابی حاتم) اور اسی طرح ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی روایت کی ہے فضائل قرآن کے بارے میں پہلے حدیث گذر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی' حکمتوں والا ذکر اور سیدھی راہ یعنی صراط مستقیم یہی اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے۔ [2] (مسند احمد ترمذی) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بھی یہی ہے اور مرفوع حدیث کا بھی موقوف ہونا ہی زیادہ مشابہ ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت عبداللہ سے بھی یہی روایت ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾

---

[1] [ضعیف جدا: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۷۴) تفسیر ابن ابی حاتم (۲۰/۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند سخت ضعیف ہے کیونکہ اس میں ابن ابی حارث اعور راوی مجہول ہے۔]

[2] [ضعیف جدا: ترمذی: کتاب فضائل القران: باب ما جاء فی فضل القرآن (۲۹۰۶) دارمی (۴۳۵/۲) مسند احمد (۹۱/۱)] شیخ البانی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [المشکاۃ (۲۱۳۸)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند بھی سابقہ حدیث کی طرح سخت ضعیف ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

کہیے یعنی ہمیں ہدایت والے راستہ کا الہام کر اور اس دین قیم کی سمجھ دے جس میں کوئی کجی نہیں۔ آپ سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو ہر اس چیز سے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے زیادہ وسعت والا ہے۔ ابن حنفیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جس کے سوا اور دین مقبول نہیں۔ عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ کا قول ہے کہ صراط مستقیم اسلام ہے۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی کہ صراط مستقیم کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں، ان میں کئی ایک کھلے ہوئے دروازے ہیں، اور دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں، صراط مستقیم کے دروازے پر ایک پکارنے والا مقرر ہے، جو کہتا ہے اے لوگو! تم سب کے سب اسی سیدھی راہ پر چلے جاؤ، ٹیڑھی ترچھی ادھر ادھر کی راہوں کو نہ دیکھو نہ ان پر جاؤ۔ اور اس راستے سے گزرنے والا کوئی شخص جب ان دروازوں میں سے کسی ایک کو کھولنا چاہتا ہے تو ایک پکارنے والا کہتا ہے خبردار اسے نہ کھولنا۔ اگر کھولا تو اس راہ لگ جائے گا، اور صراط مستقیم سے ہٹ جائے گا۔ پس صراط مستقیم تو اسلام ہے، اور دیواریں اللہ کی حدیں ہیں اور کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں، اور دروازے پر پکارنے والا قرآن کریم ہے، اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا زندہ ضمیر ہے، جو ہر ایماندار کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور واعظ کے ہوتا ہے۔ [1] یہ حدیث ابن ابی حاتم ابن جریر ترمذی اور نسائی میں بھی ہے اور اس کی اسناد حسن صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس سے مراد حق ہے۔ ان کا قول سب سے زیادہ مقبول ہے اور مذکورہ اقوال کا کوئی مخالف نہیں۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد کے آپ کے دونوں خلیفہ رضی اللہ عنہما ہیں۔ حسن رحمہ اللہ اس قول کی تصدیق اور تحسین کرتے ہیں دراصل یہ سب اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دونوں خلفاء صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کا تابعدار حق کا تابع ہے اور حق کا تابع اسلام کا تابع ہے اور اسلام کا تابع قرآن کا مطیع ہے اور قرآن اللہ کی کتاب اس کی طرف سے مضبوط رسی اور اس کی سیدھی راہ ہے۔ لہٰذا صراط مستقیم کی تفسیر میں یہ تمام اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔ فالحمدللہ۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: صراط مستقیم وہ ہے جس پر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا۔ امام ابو جعفر بن جریر رحمہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں سب سے اولیٰ یہ ہے کہ ہم کو توفیق دی جائے اس کی جو اللہ کی مرضی کی ہو اور جس پر چلنے کی وجہ سے اللہ اپنے بندوں سے راضی ہوا ہو اور ان پر انعام کیا ہو، صراط مستقیم یہی ہے۔ اس لیے کہ جس شخص کو اس کی توفیق مل جائے، جس کی توفیق اللہ کے نیک بندوں کو تھی جن پر اللہ تعالیٰ کا

---

[1] [صحیح: ترمذی: کتاب الامثال: باب ما جاء فی مثل اللہ لعبادہ (۲۸۵۹) مسند احمد (۱۸۲/۴) نسائی فی السنن الکبری (۱۱۲۳۳)] حاکم (۷۳/۱) تفسیر ابن ابی حاتم (۲۱/۱) تفسیر ابن جریر الطبری (۱۷۶/۱) طحاوی فی مشکل الآثار (۴۲۳/۲)] شیخ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔ [ظلال الجنۃ (۱۸)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اس سے صحیح کہا ہے۔]

انعام ہوا تھا جو نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگ تھے انہوں نے اسلام کی اور رسولوں کی تصدیق کی، کتاب اللہ کو مضبوط تھامے رکھا، اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالائے۔ اس کے منع کیے ہوئے کاموں سے رک گئے اور نبی کریم ﷺ اور آپ کے چاروں خلیفوں رضی اللہ عنہم اور تمام نیک بندوں کی راہ کی توفیق مل جائے گی تو یہی صراط مستقیم ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مومن کو تو اللہ کی طرف سے ہدایت حاصل ہو چکی ہے پھر نماز اور غیر نماز میں ہدایت مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اس سے ہدایت پر ثابت قدمی اور رسوخ اور بینائی اور ہمیشہ کی طلب ہے اس لیے کہ بندہ ہر ساعت اور ہر حالت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا محتاج ہے وہ خود اپنی جان کے نفع نقصان کا مالک نہیں بلکہ دن رات اپنے اللہ کا محتاج ہے اسی لیے اللہ نے اسے سکھایا کہ ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتا رہے اور ثابت قدمی اور توفیق چاہتا رہے۔ بھلا اور نیک بخت انسان وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے در کا بھکاری بنالے وہ اللہ ہر پکارنے والے کی پکار کے قبول کرنے کا کفیل ہے۔ بالخصوص بے قرار محتاج اور اس کے سامنے اپنی حاجت دن رات پیش کرنے والے کی ہر پکار کو قبول کرنے کا ضامن ہے۔ اور جگہ قرآن کریم میں ہے: ﴿يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ﴾ (1) الخ اے ایمان والو! اللہ پر، اس کے رسولوں پر، اس کی اس کتاب پر، جو اس نے اپنے رسول کی طرف نازل فرمائی اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئیں، سب پر ایمان لاؤ۔

اس آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا اور ہدایت والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا ایسا ہی ہے جیسے یہاں ہدایت والوں کو ہدایت طلب کرنے کا حکم دینا۔ مراد دونوں جگہ ثابت قدمی اور استمرار ہے اور ایسے اعمال پر ہیشگی کرنا جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں مدد پہنچائیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ حاصل شدہ چیز کا حاصل کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور دیکھئے اللہ رب العزت نے اپنے ایمان دار بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کہیں ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (2) یعنی اے ہمارے رب ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما تو بہت بڑا دینے والا اور عطا کرنے والا ہے۔ یہ بھی وارد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نماز مغرب کی تیسری رکعت سورۂ فاتحہ کے بعد اس آیت کو پوشیدگی سے پڑھا کرتے تھے۔ پس ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ ہمیں صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھ اور اس سے ہمیں نہ ہٹا۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۧ

راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا نہ ان کی جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی ○

انعام کے مستحق وہی جو صراط مستقیم پر چلے: اس کا بیان پہلے گذر چکا ہے کہ بندے کے اس قول پر اللہ کریم فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کے لیے ہے جو کچھ وہ مانگے۔ یہ آیت صراط مستقیم کی تفسیر ہے

(1) [سورۃ النسآء : آیت ۱۳۶] (2) [سورۃ آل عمران : آیت ۸]

اور نحویوں کے نزدیک یہ اس سے بدل ہے اور عطف بیان بھی ہوسکتی ہے واللہ اعلم۔ اور جن پر اللہ کا انعام ہوا ان کا بیان سورۂ نساء میں آ چکا ہے فرمان ہے ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ (النساء/٦٩) الخ یعنی اللہ اور اس رسول ﷺ کے کہے پر عمل کرنے والے ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا انعام ہے جو نبی، صدیق، شہید، صالح لوگ ہیں، یہ بہترین ساتھی اور اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل ربانی ہے اور اللہ جاننے والا کافی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ تو مجھے ان فرشتوں، نبیوں، صدیقوں، شہیدوں اور صالحین کی راہ پر چلا جن پر تو نے اپنی اطاعت وعبادت کی وجہ سے انعام نازل فرمایا۔ یہ آیت ٹھیک ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ﴾ الخ کی طرح ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں اس سے مراد انبیاء علیہم السلام ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں مومن ہیں۔ وکیع رحمہ اللہ کہتے ہیں مسلمان۔ عبدالرحمٰن رحمہ اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم مراد ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول زیادہ معقول اور قابل تسلیم ہے واللہ اعلم۔

جمہور کی قرات میں "غَيْرِ" رے کی زیر کے ساتھ ہے اور صفت ہے۔ زمخشری کہتے ہیں رے کی زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور حال ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی قرات یہی ہے اور ابن کثیر رحمہ اللہ سے بھی یہی روایت کی گئی ہے۔ ﴿عَلَيْهِمْ﴾ میں جو ضمیر ہے وہ اس کا ذوالحال ہے اور ﴿اَنْعَمْتَ﴾ عامل ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اللہ جل شانہ تو ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ جو ہدایت اور استقامت والے تھے اور اللہ رسول ﷺ کے اطاعت گزار، اس کے حکموں پر عمل کرنے والے، اس کے منع کیے ہوئے کاموں سے رک رہنے والے تھے۔

مغضوب لوگ: ان کی راہ سے بچا، جن پر غضب وغصہ کیا گیا، جن کے ارادے فاسد ہو گئے، حق کو جان کر پھر اس سے ہٹ گئے اور گم گشتہ راہ لوگوں کے طریقے سے بھی ہمیں بچا لے جو سرے سے علم نہیں رکھتے مارے مارے پھرتے ہیں راہ سے بھٹکے ہوئے حیران وسرگرداں ہیں اور راہ حق کی طرف رہنمائی نہیں کیے جاتے "لا" کو دوبارہ لا کر کلام کی تاکید کرنا اس لیے ہے کہ معلوم ہو جائے کہ یہاں دو غلط راستے ہیں، ایک یہود کا دوسرا نصاریٰ کا۔ بعض نحوی کہتے ہیں کہ "غَيْرِ" کا لفظ یہاں پر استثناء کے لیے ہے تو استثناء منقطع ہوسکتا ہے کیونکہ جن پر انعام کیا گیا ہے ان میں سے استثناء ہونا تو درست ہوتا ہے مگر یہ لوگ انعام والوں میں داخل ہی نہ تھے لیکن ہم نے جو تفسیر کی ہے یہ بہت اچھی ہے۔ عرب شاعروں کے شعر میں ایسا پایا جاتا ہے کہ وہ موصوف کو حذف کر دیتے ہیں اور صرف صفت بیان کر دیا کرتے ہیں۔ اسی طرح اس آیت میں بھی صفت کا بیان ہے اور موصوف محذوف ہے۔ ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ﴾ سے مراد "غَيْرِ صِرَاطِ الْمَغْضُوْبِ" ہے۔ مضاف الیہ کے ذکر سے کفایت کی گئی اور مضاف بیان نہ کیا گیا اس لیے کہ نشست الفاظ ہی اس پر دلالت کر رہی ہے۔ پہلے دو مرتبہ یہ لفظ آ چکا ہے۔ بعض کہتے ہیں ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ میں "لا" زائد ہے اور ان کے نزدیک تقدیر کلام اس طرح ہے "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْنَ" اور اس کی شہادت عرب شاعروں کے شعر سے بھی ملتی ہے لیکن صحیح بات وہی ہے جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے "غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ غَيْرِ الضَّآلِّيْنَ" پڑھنا صحیح سند سے مروی ہے اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے اور یہ محمول ہے اس پر کہ ان بزرگوں سے یہ بطور تفسیر صادر ہوا۔ تو ہمارے قول کی تائید ہوئی کہ لا نفی کی تاکید کے لیے ہی لایا گیا ہے تاکہ یہ وہم ہی نہ ہو کہ یہ ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ پر عطف ہے اور اس لیے بھی کہ دونوں راہوں کا فرق معلوم ہو جائے تاکہ ہر شخص ان دونوں سے بھی بچتا رہے۔ اہل ایمان کا طریقہ تو یہ ہے کہ حق کا علم بھی ہو اور حق پر عمل بھی ہو۔ یہودیوں کے ہاں علم نہیں اور نصاریٰ کے ہاں عمل نہیں اسی لیے یہودیوں پر غضب ہوا اور نصرانیوں کو گمراہی ملی۔ اس لیے کہ علم کے باوجود عمل کو چھوڑنا غضب کا سبب ہے اور نصرانی گو ایک چیز کا قصد تو کرتے ہیں مگر اس کے باوجود صحیح راستہ کو نہیں پا سکتے اس لیے کہ ان کا طریقہ کار غلط ہے اور اتباع حق سے ہٹے ہوئے ہیں یوں تو غضب اور گمراہی ان دونوں جماعتوں کے حصہ میں ہے لیکن یہودی غضب کے حصہ میں پیش پیش ہیں۔ جیسے کہ اور جگہ قرآن کریم میں ہے ﴿مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ﴾ [1] اور نصرانی ضلالت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے: ﴿قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ [2] یعنی یہ پہلے ہی سے گمراہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر بھی چکے ہیں اور سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اس کی تائید میں بہت سی حدیثیں اور روایتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مسند احمد میں ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر نے میری پھوپھی اور چند اور لوگوں کو گرفتار کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تو میری پھوپھی نے کہا میری خبر گیری کرنے والا غائب ہے اور میں عمر رسیدہ بڑھیا ہوں جو کسی خدمت کے لائق نہیں آپ مجھ پر احسان کیجیے اور مجھے رہائی دیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بھی احسان کرے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ تیری خیر خبر لینے والا کون ہے؟ اس نے کہا عدی بن حاتم آپ نے فرمایا وہی جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بھاگتا پھرتا ہے؟ پھر آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ جب لوٹ کر آپ آئے تو آپ کے ساتھ ایک شخص تھے اور غالباً وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے آپ نے فرمایا لو ان سے سواری مانگ لو۔ میری پھوپھی نے ان سے درخواست کی جو منظور ہوئی اور سواری مل گئی۔ وہ یہاں سے آزاد ہو کر میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت نے تیرے باپ حاتم کی سخاوت کو بھی ماند کر دیا۔ آپ کے پاس جو آتا ہے وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ یہ سن کر میں بھی حضور کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ چھوٹے بچے اور بڑھیا عورتیں بھی آپ کی خدمت میں آتی جاتی ہیں اور آپ ان سے بھی بے تکلفی کے ساتھ بولتے چالتے ہیں۔ اس بات نے مجھے یقین دلا دیا کہ آپ قیصر و کسریٰ کی طرح بادشاہت اور وجاہت کے طلب کرنے والے نہیں۔ آپ نے مجھے دیکھ کر فرمایا عدی "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہنے سے کیوں بھاگتے ہو؟ کیا اللہ کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق ہے؟ "اَللّٰهُ اَكْبَرُ" کہنے سے کیوں منہ موڑتے ہو؟ کیا اللہ عزوجل سے بھی بڑا کوئی ہے؟ مجھ پر ان کلمات نے آپ کی سادگی اور بے تکلفی نے ایسا اثر کیا کہ میں فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ جس سے آپ

---

[1] [سورۃ المائدہ : آیت ۶۰]　[2] [سورۃ المائدہ : آیت ۷۷]

بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد یہود ہیں اور ﴿اَلضَّآلِّيْنَ﴾ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ [1] ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عدی رضی اللہ عنہ کے سوال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ [2] اس حدیث کی بہت سی سندیں ہیں اور مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ بنوقین کے ایک شخص نے وادی القریٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال کیا آپ نے جواب میں یہی فرمایا۔ [3] بعض روایتوں میں ان کا نام عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہے واللہ اعلم۔

ابن مردویہ میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت ابن مسعود اور بہت سے صحابیوں رضی اللہ عنہم سے بھی یہ تفسیر منقول ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں بلکہ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں مفسرین میں اس بارے میں کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ان ائمہ کی اس تفسیر کی دلیل ایک تو وہ حدیث ہے جو پہلے گذری۔ دوسری سورۂ بقرہ کی یہ آیت جس میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے کہا گیا ہے ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ﴾ (البقرۃ / ۹۰) الخ اس آیت میں ہے کہ ان پر غضب پر غضب نازل ہوا۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت ﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ﴾ (المائدہ / ۶۰) الخ میں بھی ہے کہ ان پر غضب الٰہی نازل ہوا اور جگہ فرمان الٰہی ہے ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (المائدہ / ۷۸) الخ یعنی بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ان پر لعنت کی گئی۔ داود علیہ السلام اور عیسیٰ بن مریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ ان کی نافرمانی اور حد سے گذر جانے کی وجہ سے ہے۔ یہ لوگ کسی برائی کے کام سے آپس میں روک ٹوک نہیں کرتے تھے یقیناً ان کے کام بہت برے تھے اور تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل جو کہ دین خالص کی تلاش میں اپنے ساتھیوں سمیت نکلے اور ملک شام میں آئے تو ان سے یہودیوں نے کہا کہ آپ ہمارے دین میں تب تک داخل نہیں ہوسکتے جب تک غضب الٰہی کا ایک حصہ نہ پالو۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس سے بچنے کے لیے تو دین حق کی تلاش میں نکلے ہیں پھر اسے کیسے قبول کرلیں؟ پھر نصرانیوں سے ملے انہوں نے کہا جب تک اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مزہ نہ چکھ لو تب تک آپ ہمارے دین میں نہیں آسکتے۔ انہوں نے کہا ہم یہ بھی نہیں کرسکتے چنانچہ وہ اپنی فطرت پر ہی رہے۔ بتوں کی عبادت اور قوم کا دین چھوڑ دیا لیکن یہودیت یا نصرانیت اختیار نہ کی۔ البتہ زید کے ساتھیوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ اس لیے کہ یہودیوں کے مذہب سے یہ ملتا جلتا تھا۔ انہی میں حضرت ورقہ بن نوفل

---

[1] [حسن: ترمذی: کتاب تفسیر القرآن: باب ومن سورۃ الفاتحۃ (۲۹۵۳) مسند احمد (۴/۳۷۸) صحیح ابن حبان (۷۲۰۶) طبرانی کبیر (۱۷/۲۳۷) المزی فی تہذیب الکمال (۱۴/۱۱۰) بیہقی فی الدلائل (۵/۳۳۹)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [السلسلۃ الصحیحۃ (۳۲۶۳)] حافظ زبیر علی زئی نے بھی اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی فرماتے ہیں کہ یہ روایت شواہد کے ساتھ صحیح ہے۔]

[2] [حسن: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۹۵، ۲۰۹)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں اس کی سند حسن ہے۔]

[3] [حسن بالشواهد: تفسیر عبدالرزاق (۱/۳۷) تفسیر ابن جریر الطبری (۱۹۸) مسند احمد (۵/ ۳۲، ۳۳)] امام ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ [مجمع الزوائد (۶/۳۱۱)]

تھے انہیں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا زمانہ ملا اور ہدایت الٰہی نے ان کی رہبری کی اور یہ حضور ﷺ پر ایمان لائے اور جو وحی اس وقت تک اتری تھی اس کی تصدیق کی رضی اللہ عنہ۔

مسئلہ: ضاد اور ظاء کی قرات میں بہت باریک فرق ہے اور ہر ایک کے بس کا نہیں۔ اس لیے علمائے کرام کا صحیح مذہب یہ ہے کہ یہ فرق معاف ہے' ضاد کا صحیح مخرج تو یہ ہے کہ زبان کا اول کنارہ اور اس کے پاس کی داڑھیں اور ظآء کا مخرج زبان کا ایک طرف اور سامنے والے اوپر کے دو دانت کے کنارے۔ دوسرے یہ کہ یہ دونوں حرف مجہورہ اور رخوہ اور مطبقہ ہیں پس اس شخص کو جسے ان دونوں میں تمیز کرنی مشکل معلوم ہو' اسے معاف ہے کہ ضاد کو ظآء کی طرح پڑھ لے۔ ایک حدیث میں ہے کہ میں ضاد کو سب سے زیادہ صحیح پڑھنے والا ہوں [1] لیکن یہ حدیث بالکل بے اصل اور لاپتہ ہے۔

فصل: یہ مبارک سورت نہایت کارآمد مضامین کا مجموعہ ہے ان سات آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد' اس کی بزرگی' اس کی ثنا وصفت اور اس کے پاکیزہ ناموں اور اس کی بلند و بالا صفتوں کا بیان ہے ساتھ ہی قیامت کے دن کا ذکر ہے اور بندوں کو ارشاد ہے کہ وہ اس مالک سے سوال کریں اس کی طرف تضرع وزاری کریں اپنی مسکینی اور بے کسی اور بے بسی کا اقرار کریں اور اس کی عبادت خلوص کے ساتھ کریں اور اس کی توحید الوہیت کا اقرار کریں۔ اسے شریک' نظیر اور مثل سے پاک اور برتر جانیں۔ صراط مستقیم اور اس پر ثابت قدمی اس سے طلب کریں تا کہ یہی ہدایت انہیں قیامت والے دن پل صراط سے بھی پار اتارے اور نبیوں' صدیقوں' شہیدوں اور صالحوں کے پڑوس میں جنت الفردوس میں جگہ دلائے۔ ساتھ ہی اس سورت میں نیک اعمال کی ترغیب ہے تا کہ قیامت کے دن نیکوں کا ساتھ ملے اور باطل راہوں پر چلنے سے ڈراوا پیدا ہے تا کہ قیامت کے دن بھی یہ باطل پرست یہود ونصاریٰ کی جماعت سے دور ہی رہیں۔

باریک نکتہ: اس باریک نکتہ پر بھی غور کیجیے کہ انعام کی اسناد تو اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی اور "اَنْعَمْتَ" کہا گیا لیکن غضب کی اسناد اللہ کی طرف نہیں کی گئی یہاں فاعل حذف کر دیا اور ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ کہا گیا اس میں پروردگار عالم کی جناب میں ادب کیا گیا ہے در اصل حقیقی فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ (الفتح/٦) اور اسی طرح ضلالت کی اسناد بھی ان کی طرف کی گئی جو گمراہ ہیں حالانکہ اور جگہ ہے ﴿وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ﴾ (الاسراء/٩٧) الخ یعنی اللہ جسے راہ دکھائے وہ راہ یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے اس کا رہنما کوئی نہیں۔ اور جگہ فرمایا ﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ﴾ (الاعراف/١٨٦) الخ یعنی جسے اللہ گمراہ کر دے اس کا ہادی کوئی نہیں وہ تو اپنی سرکشی میں بہکے رہتے ہیں۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ راہ دکھانے والا گمراہ کرنے والا صرف سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے۔

---

[1] [لا اصل له: كشف الخفاء (١/ ٢٠٠) المقاصد الحسنه (ص: ١٨٥)] شیخ حوتؒ نے فرمایا ہے کہ اس کا معنی صحیح ہے مگر اس کی کوئی اصل نہیں۔ [أسنى المطالب (ص: ٢٩)] ملا علی قاریؒ نے بھی اسے بے اصل کہا ہے۔ [الاسرار المرفوعة (ص: ١١٦)] امام زرکشیؒ نے فرمایا ہے کہ ہمارے شیخ ابن کثیرؒ نے اسے بے اصل کہا ہے البتہ اس کا معنی صحیح ہے۔ [التذكرة في الاحاديث المشتهرة (ص: ١٦٠)] امام شوکانیؒ نے بھی اسے بے اصل کہا ہے۔ [الفوائد المجموعة (ص: ٣٢٧)] مزید دیکھئے: تذكرة الموضوعات (ص: ٨٧) النخبة البهية (ص: ٤) المصنوع (ص: ٦١)]

قدریہ فرقہ جو ادھر ادھر کی متشابہ آیتوں کو دلیل بنا کر کہتا ہے کہ بندے خود مختار ہیں وہ خود جو پسند کرتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ صریح اور صاف صاف آیتیں ان کے رد میں موجود ہیں لیکن باطل پرست فرقوں کا یہی قاعدہ ہے کہ صراحت کو چھوڑ کر متشابہ کے پیچھے لگا کرتے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے۔ کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو متشابہ آیتوں کے پیچھے لگتے ہیں تو سمجھ لو کہ انہی لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا ہے تم ان کو چھوڑ دو۔ [1] حضور ﷺ کا اشارہ اس فرمان میں اس آیت شریف کی طرف ہے ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ﴾ (آل عمران / ۷) الخ یعنی جن لوگوں کے دل میں کجی ہے وہ متشابہ کے پیچھے لگتے ہیں فتنوں اور تاویل کو ڈھونڈنے کے لیے۔ پس الحمد للہ بدعتی لوگوں کے لیے قرآن پاک میں صحیح دلیل کوئی نہیں۔ قرآن کریم تو حق و باطل ہدایت وضلالت میں فرق کرنے کے لیے آیا ہے اس میں تناقض اور اختلاف نہیں۔ یہ تو اللہ حکیم وحمید کا نازل کردہ ہے۔

فصل: آمین کی فضیلت اور مسائل: سورۂ فاتحہ کو ختم کر کے آمین کہنا مستحب ہے۔ آمین مثل یاسین کے ہے اور اٰمین بھی کہا گیا ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اے اللہ تو قبول فرما۔ آمین کہنے کے مستحب ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جو مسند احمد، ابوداود اور ترمذی میں وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں میں نے سنا رسول اللہ ﷺ ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ کہہ کر ﴿آمین﴾ کہتے تھے اور آواز دراز کرتے تھے۔ [2] ابوداؤد میں ہے آواز بلند کرتے تھے۔ امام ترمذی اس حدیث کو حسن کہتے ہیں۔ حضرت علیؓ حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آمین پہلی صف والے لوگ جو آپ کے قریب ہوتے سن لیتے۔ ابوداود اور ابن ماجہ میں یہ حدیث ہے۔ [3] ابن ماجہ میں یہ بھی ہے کہ آمین کی آواز سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔ دارقطنی میں بھی یہ حدیث ہے [4] اور دارقطنی بتاتے ہیں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ رسول اللہ ﷺ

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب التفسیر: باب منه آیات محکمات (٤٥٤٧) صحیح مسلم: کتاب العلم: باب النهی عن متشابه القرآن (٢٦٦٥)]

[2] [صحیح: ترمذی: کتاب الصلوة: باب ما جآء فی التامین (٢٤٨) ابو داؤد: کتاب الصلوة: باب التامین وراء الامام (٩٣٣) مسند احمد (٣١٨/٤) دراقطنی (٣٣٤/١، ٤٣٥) نسائی فی السنن الکبری (٩١٤) دارمی (١٢٥٠)] امام ترمذیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ امام دارقطنیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [المشکاة (٨٤٥)]

[3] [ضعیف: ابو داؤد: کتاب الصلوة: باب التامین وراء الامام (٩٣٤) ابن ماجه: کتاب اقامة الصلوة: باب الجهر بامین (٨٥٣) ابن ابی حاتم فی العلل (٢٥١/١)] حافظ بوصیریؒ نے اسے ضعیف کہا ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں ابن ابی لیلیٰ راوی ہے جسے جمہور نے ضعیف کہا ہے۔ امام ابوحاتمؒ نے اسے سیئ الحفظ کہا ہے۔ شیخ البانیؒ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ [کما فی السلسلة الصحیحة (٨٣٢/١)] حافظ زبیر علی زئی نے بھی اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔]

[4] [حسن: دارقطنی (٣٣٥/١) بیهقی (٥٨/٢) حاکم (٢٢٣/١) ابن حبان (١٨٠٦)] اس کو دارقطنی نے حسن حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے۔

[5] [ضعیف و منقطع: ابو داؤد: کتاب الصلوة: باب التامین وراء الامام (٩٣٧) ابن خزیمة (٥٧٣/١) مسند احمد (١٢/٦، ١٥)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف ابوداود (١٩٨)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے منقطع کہا ہے۔ البتہ حافظ زبیر علی زئی نے اسے صحیح کہا ہے۔]

سے کہتے تھے۔ مجھ سے پہلے آمین نہ کہا کیجیے (ابوداود) ⑤ حسن بصری رحمہ اللہ اور جعفر صادق رحمہ اللہ سے آمین کہنا مروی ہے۔ جیسے کہ ﴿آمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ﴾ (المائدہ/۲) قرآن میں ہے۔

ہمارے اصحاب وغیرہ کہتے ہیں جو نماز میں نہ ہو اسے بھی آمین کہنا چاہیے۔ ہاں جو نماز میں ہو اس پر تاکید زیادہ ہے۔ نمازی خواہ اکیلا ہو، خواہ مقتدی ہو، خواہ امام ہو، ہر حالت میں آمین کہے۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام آمین کہے تم بھی آمین کہو جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل جائے اس کے تمام سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ① مسلم شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنی نماز میں آمین کہتا ہے اور فرشتے آسمان میں آمین کہتے ہیں۔ اور ایک کی آمین دوسرے کی آمین سے مل جاتی ہے تو اس کے تمام پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ② مطلب یہ ہے کہ اس کی آمین کا اور فرشتوں کی آمین کا وقت ایک ہی ہو جائے یا موافقت سے مراد قبولیت میں موافق ہونا ہے یا اخلاص میں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب امام ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہے تو آمین کہو اللہ قبول فرمائے گا۔ ③

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا آمین کے کیا معنی ہیں۔ آپ نے فرمایا اے اللہ تو قبول کر۔ ④ جوہری رحمہ اللہ کہتے ہیں اس کے معنی ''اسی طرح ہو'' ہیں۔ ترمذی رحمہ اللہ کہتے ہیں اس کے معنی ہیں کہ ہماری امیدوں کو نہ توڑ۔ اکثر علماء فرماتے ہیں اس کے معنی ''اے اللہ تو ہماری دعا قبول فرما'' کے ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ جعفر صادق رحمہ اللہ ہلال بن سیاف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آمین اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بھی یہ مروی ہے لیکن صحیح نہیں۔ ⑤ امام مالک رحمہ اللہ کے اصحاب کا مذہب ہے کہ امام آمین نہ کہے مقتدی آمین کہیں کیونکہ موطا مالک کی حدیث میں ہے کہ جب امام ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہے تو تم آمین کہو۔ ⑥ اسی طرح ان کی دلیل کی تائید میں صحیح مسلم والی ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی آتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

① [صحیح : صحیح بخاری : كتاب الاذان : باب جهر الماموم بالتامين (۷۸۲) و كتاب التفسير : باب غير المغضوب عليهم ولا الضالين (٤٤٧٥) صحيح مسلم : كتاب الصلة : باب التسميع والتحميد والتامين (٤١٠) نسائی : كتاب الافتتاح : باب جهر الامام بامين (٩٢٧) ترمذی : كتاب الصلوة : باب ما جاء فی فضل التامين (٢٥٠) ابو داؤد : كتاب الصلوة : باب التامين وراء الامام (٩٣٥)]

② [صحیح : صحیح مسلم (٤١٠، ٧٥)]

③ [صحیح : صحیح مسلم : كتاب الصلوة : باب التشهد فی الصلوة (٤٠٤) ابو داؤد : كتاب الصلوة : باب التشهد (٩٧٢) نسائی (٨٢٩)]

④ [ضعیف : تفسير كشاف (١٧/١) الدرالمنثور (٤٤/١، ٤٥)] جویبر اور ضحاک کا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند سخت ضعیف ہے۔]

⑤ [عبدالرزاق (٢٦٥١)]

⑥ [صحیح : موطا (٨٧/١) كتاب الصلوة : باب ما جاء فی التامين خلف الامام (٤٥) بخاری (٧٩٦) مسلم (٤٠٩)]

⑦ [صحیح : صحیح مسلم : كتاب الصلوة : باب التشهد فی الصلوة (٤٠٤)]

جب امام ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہے تو تم آمین کہو۔ [5] لیکن بخاری ومسلم کی حدیث پہلے بیان ہو چکی ہے کہ جب آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ اور یہ بھی حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھ کر آمین کہتے تھے۔

جہری نمازوں میں مقتدی اونچی آواز سے آمین کہے یا نہ کہے اس میں ہمارے ساتھیوں کا اختلاف ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر امام آمین کہنی بھول گیا ہو تو مقتدی با آواز بلند آمین کہیں۔ اگر امام نے خود اونچی آواز سے آمین کہی ہو تو نیا قول یہ ہے کہ مقتدی با آواز بلند نہ کہیں۔ امام ابو حنیفہ ؒ کا یہی مذہب ہے۔ اور ایک روایت میں امام مالک ؒ سے بھی مروی ہے اس لیے کہ نماز کے اور اذکار کی طرح یہ بھی ایک ذکر ہے تو نہ وہ صرف بلند آواز سے پڑھے جاتے ہیں نہ یہ بلند آواز سے پڑھا جائے۔ لیکن پہلا قول یہ ہے کہ آمین بلند آواز سے کہی جائے۔ حضرت امام احمد بن حنبل ؒ کا بھی یہی مذہب ہے اور حضرت امام مالک ؒ کا بھی دوسری روایت کے اعتبار سے یہی مذہب ہے اور اس کی دلیل وہی حدیث ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ آمین کی آواز سے مسجد گونج اٹھتی تھی۔ ہمارے یہاں پر ایک تیسرا قول بھی ہے کہ اگر مسجد چھوٹی ہو تو مقتدی با آواز بلند آمین نہ کہیں اس لیے کہ وہ امام کی قرات سنتے ہیں اور اگر بڑی ہو تو اونچی آواز سے آمین کہیں تاکہ مسجد کے کونے کونے میں آمین پہنچ جائے۔ واللہ اعلم۔ (صحیح مسئلہ یہ ہے کہ جن نمازوں میں اونچی آواز سے قرات پڑھی جاتی ہے ان میں اونچی آواز سے آمین کہنی چاہیے۔ خواہ مقتدی ہو خواہ امام ہو خواہ منفرد۔ مترجم)

مسند احمد میں حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس یہودیوں کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ ہماری تین چیزوں پر یہودیوں کو اتنا بڑا حسد ہے کہ کسی اور چیز پر نہیں۔ ایک تو جمعہ پر کہ اللہ نے ہمیں اس کی ہدایت کی اور یہ بہک گئے دوسرے قبلہ تیسرے ہمارا امام کے پیچھے آمین کہنا۔ [1] ابن ماجہ کی حدیث میں یوں ہے کہ یہودیوں کو سلام پر اور آمین پر جتنی چڑ ہے اتنی کسی اور چیز پر نہیں۔ [2] اور حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا جس قدر حسد یہودی آمین پر کرتے ہیں اس قدر حسد اور امر پر نہیں کرتے تم بھی آمین بکثرت کہا کرو۔ [3] اس کی اسناد میں طلحہ بن عمرو راوی ضعیف ہیں۔ ابن مردویہ میں بروایت حضرت ابو ہریرہ ؓ مروی ہے کہ آپ نے فرمایا آمین اللہ تعالیٰ کی مہر ہے اپنے مومن بندوں پر۔ [4] حضرت

---

[1] [صحیح بالشواهد : مسند احمد (٦/١٣٥) التعلیق الرغیب (١/٢٧٨) السلسلة الصحیحه (٦٩١) صحیح ابن ماجه (٨٥٦) صحیح ابن خزیمه (١٥٨٥)]

[2] [صحیح : ابن ماجه (٨٥٦)] حافظ بوصیری ؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [الزوائد (١/٢٩٧)]

[3] [ضعیف جدا : ابن ماجه : کتاب اقامة الصلوة : باب الجهر بامین (٨٥٧)] حافظ بوصیری ؒ نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے کیونکہ اس میں موجود طلحہ بن عمرو راوی اہل علم کے اتفاق کے ساتھ ضعیف ہے۔ [الزوائد (١/٢٩٨)] شیخ البانی ؒ فرماتے ہیں کہ یہ سخت ضعیف ہے۔ [ضعیف الترغیب (٢٧٠)]

[4] [ضعیف : الطبرانی فی الدعاء (٢١٩) الدر المنثور (١/٤٤)] شیخ البانی ؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [السلسلة الضعیفة (١٤٨٧)] اس کی سند میں مؤمل بن عبدالرحمٰن ثقفی اور اسماعیل بن یعلی ثقفی دونوں راوی ضعیف ہیں۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے سخت ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔

انس رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے کہ نماز میں آمین کہنی اور دعا پر آمین کہنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے عطا کی گئی ہے جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی۔ ہاں اتنا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ایک خاص دعا پر حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے۔ تم اپنی دعاؤں کو آمین پر ختم کیا کرو۔ اللہ تعالیٰ انہیں تمہارے حق میں قبول فرمایا کرے گا۔ [1]

اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر قرآن کریم کے ان الفاظ کو دیکھئے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا ﴿رَبَّنَا اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ﴾ [2] الخ ہے یعنی الٰہی تو نے فرعون اور فرعونیوں کو دنیا کی زینت اور مال دنیا زندگانی میں عطا فرمایا ہے جس سے وہ تیری راہ سے دوسروں کو بہکا رہے ہیں اللہ ان کے مال برباد کر اور ان کے دل سخت کر، جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں یہ ایمان نہ لائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا کی قبولیت کا اعلان ان الفاظ میں ہوتا ہے ﴿قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ (یونس/۸۹) الخ یعنی تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ تم مضبوط رہو اور بے علموں کی راہ نہ جاؤ۔ دعا صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کرتے تھے اور حضرت ہارون صرف آمین کہتے تھے لیکن قرآن نے دعا کی نسبت دونوں کی طرف کی۔ اس سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ جو شخص کسی دعا پر آمین کہے وہ گویا خود وہ دعا کر رہا ہے۔ اس استدلال کو سامنے رکھ کر وہ قیاس کرتے ہیں کہ مقتدی قرات نہ کرے، اس لیے کہ اس کا سورۂ فاتحہ کے بعد آمین کہنا پڑھنے کے قائم مقام ہے اور اس حدیث کو بھی دلیل میں لاتے ہیں کہ جس کا امام ہو تو امام کی قرات اس کی قرات ہے (مسند احمد) حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آمین میں مجھ سے سبقت نہ کیا کیجئے اس کھینچا تانی سے مقتدی پر جہری نمازوں میں ﴿اَلْحَمْدُ﴾ کا نہ پڑھنا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ (یہ یاد رہے کہ اس کی مفصل بحث پہلے گذر چکی ہے) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ کہہ کر آمین کہتا ہے آسمانوں والوں کی آمین زمین والوں کی آمین سے مل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ بندے کے تمام پہلے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ آمین نہ کہنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ایک قوم کے ساتھ مل کر غزوہ کرے، غالب آئے مال غنیمت جمع کرے اب قرعہ ڈال کر حصہ لینے لگے تو اس شخص کے نام قرعہ نکلے ہی نہیں اور کوئی حصہ نہ ملے وہ کہے "یہ کیوں؟" تو جواب ملے تیرے آمین نہ کہنے کی وجہ سے۔ [3]

سورہ بقرہ کی تفسیر

سورۂ بقرہ کی فضیلت: حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سورۂ بقرہ قرآن

---

[1] [ضعیف: ابن خزیمہ (۱۵۸٦) ابن عدی فی الضعفاء (۳/ ۲٤۰)] شیخ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ [ضعیف الترغیب (۲٦۷)] اس میں زربی بن عبداللہ ضعیف ہے۔ [میزان الاعتدال (۱/ ٦۹)]

[2] [سورۃ یونس: آیت ۸۸]

[3] [ضعیف: ابو یعلی فی مسندہ (٦٤۱۱)، (۱۱/ ۲۹٦)] اس کی سند میں لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ [الجرح والتعدیل (۷/ ۱٦۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔]

کی کوہان ہے اور اس کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ اس کی ایک ایک آیت کے ساتھ اسّی اسّی (۸۰) فرشتے نازل ہوتے تھے اور بالخصوص آیت الکرسی تو خاص عرش تلے نازل ہوئی اور اس سورت میں شامل کی گئی۔'' سورۂ یٰسین قرآن کا دل ہے جو شخص اسے اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور آخرت طلبی کے لیے پڑھے اسے بخش دیا جاتا ہے۔''اس سورت کو مرنے والوں کے سامنے پڑھا کرو۔'' [1] (مسند احمد) اس حدیث کی سند میں ایک جگہ عَنْ رَّجُلٍ ہے تو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس سے مراد کون ہیں؟ لیکن مسند احمد ہی کی دوسری روایت میں اس کا نام ابوعثمان آیا ہے۔ [2] یہ حدیث اسی طرح ابوداؤد نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ہے۔ [3] ترمذی کی ایک ضعیف سند والی حدیث ہے کہ ہر چیز کی ایک بلندی ہوتی ہے اور قرآن پاک کی بلندی سورۂ بقرہ ہے۔ اس سورت میں ایک آیت ہے جو تمام آیتوں کی سردار ہے اور وہ آیت ''آیت الکرسی'' ہے۔ [4] مسند احمد، صحیح مسلم، ترمذی اور نسائی میں حدیث ہے کہ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہاں شیطان داخل نہیں ہوسکتا۔ [5] امام ترمذی رحمہ اللہ اسے حسن صحیح بتلاتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہاں سے

---

[1] [ضعیف : مسند احمد (۲٦/۵)، (۱۹۷۸۹) طبرانی کبیر (۲۲۰/۲۰)، (۲۳۱،۲۳۰/۲۰) النسائی فی عمل الیوم واللیلة (۱۰۷۵) طیالسی (۹۳۱)] امام ہیثمیؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے۔[مجمع الزوائد (۳۱۱/٦)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[ضعیف الترغیب (۸۷۸)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ابوعثمان اور اس کے والد غیر معروف ہیں۔ مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

[2] [ضعیف : مسند احمد (۲٦/۵)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے ضعیف کہا ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

[3] [ضعیف : ابو داؤد : کتاب الجنائز : باب القراءة عند المیت (۳۱۲۱) ابن ماجه : کتاب الجنائز : باب ما جاء فیما یقال عند المریض اذا حضر (۱٤٤۸) النسائی فی الکبری فی کتاب عمل الیوم واللیلة (۱۰۱۹۳)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[ارواء الغلیل (٦۸۸)] اس کی سند میں ابوعثمان راوی ہے جسے امام ذہبیؒ، امام ابن مدینیؒ اور دیگر اہل علم نے مجہول کہا ہے۔ امام دارقطنیؒ نے اس روایت کو ضعیف الاسناد، مجہول المتن کہا ہے اور فرمایا ہے کہ اس مسئلے میں کوئی بھی حدیث ثابت نہیں۔[کما فی التلخیص الحبیر] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔]

[4] [ضعیف : ترمذی : کتاب فضائل القرآن : باب ما جاء فی فضل سورة البقرة وآیة الکرسی (۲۸۷۸) عبد الرزاق (٦۰۱۹) حمیدی (۹۹٤) مستدرك حاکم (٥٦۰/۱)] امام ہیثمیؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں سعید بن خالد خزاعی مدنی راوی ضعیف ہے۔[مجمع الزوائد (۲۱/۷)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[السلسلة الضعیفة (۱۳٤۸) ضعیف الجامع الصغیر (٤۷۲۵) ضعیف ترمذی (۵۳۹)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔]

[5] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب صلوة المسافرین : باب استحباب الصلوة النافلة فی بیته (۷۸۰) ترمذی : کتاب فضائل القرآن (۲۸۷۷) مسند احمد (۳۷۸/۲)]

[6] [ضعیف : ابو عبید فی فضائل القرآن (۳٤/۹)] اس کی سند میں ابن لھیعہ راوی ضعیف ہے، تاہم سابقہ صحیح مسلم کی حدیث سے اس کی تائید ہوجاتی ہے۔]

شیطان بھاگ جاتا ہے۔ [2] اس حدیث کے ایک راوی کو امام یحیٰی بن معین رحمہ اللہ تو ثقہ بتاتے ہیں لیکن امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ ان کی حدیث کو منکر کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔ اسے نسائی رحمہ اللہ نے "عمل الیوم واللیلہ" میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے اور اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ [1]

ابن مردویہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم میں سے کسی کو ایسا نہ پاؤں کہ وہ پیر پر پیر چڑھائے پڑھتا چلا جائے لیکن سورۂ بقرہ نہ پڑھے۔ سنو! جس گھر میں یہ مبارک سورت پڑھی جاتی ہے وہاں سے شیطان بھاگ کھڑا ہوتا ہے، سب گھروں میں بدترین اور ذلیل ترین گھر وہ ہے جس میں کتاب اللہ کی تلاوت نہ کی جائے امام نسائی رحمہ اللہ نے "عمل الیوم واللیلہ" میں بھی اسے وارد کیا ہے [2] مسند دارمی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے اس گھر سے شیطان گوز مارتا ہوا بھاگ جاتا ہے۔ ہر چیز کی اونچائی ہوتی ہے اور قرآن کی اونچائی سورۂ بقرہ ہے۔ ہر چیز کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اور قرآن کا خلاصہ مفصل سورتیں ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ جو شخص سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیتیں اور آیت الکرسی اور دو آیتیں اس کے بعد کی اور تین آیتیں سب سے آخر کی، یہ سب دس آیتیں رات کے وقت پڑھ لے اس گھر میں شیطان اس رات نہیں جا سکتا اور اسے اور اس کے گھر والوں کو اس دن شیطان یا کوئی اور بری چیز ستا نہیں سکتی۔ یہ آیتیں مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کا دیوانہ پن بھی دور ہو جاتا ہے۔ [3] حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "جس طرح ہر چیز کی بلندی ہوتی ہے، قرآن کی بلندی سورۂ بقرہ ہے جو شخص رات کے وقت اسے اپنے گھر میں پڑھے تین راتوں تک شیطان اس گھر میں نہیں جا سکتا اور دن کو اگر گھر میں پڑھ لے تو تین دن تک شیطان اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتا۔" [4] (طبرانی۔ ابن حبان۔ ابن مردویہ) ترمذی۔ نسائی اور ابن ماجہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چھوٹا سا لشکر ایک جگہ بھیجا اور اس کی سرداری آپ نے انہیں دی جنہوں نے فرمایا تھا کہ مجھے سورۂ بقرہ یاد ہے، اس وقت ایک شریف شخص نے کہا میں بھی اسے یاد کر لیتا لیکن ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس پر عمل نہ کر سکوں۔

---

[1] [صحیح: النسائی فی السنن الکبری (۱۰۸۰۰) مستدرك حاكم (۲/۲۶۰) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [السلسلة الصحيحة (۲٦/٤)]

[2] [ضعیف: النسائی فی الیوم واللیة (۹٦۹)] امام ہیثمی رحمہ اللہ کے بیان کے مطابق اس کی سند صحیح نہیں کیونکہ اس میں ابن اسحاق راوی کی تدلیس موجود ہے۔ [مجمع الزوائد (۳۱۲/٦)]

[3] [ضعیف: دارمی (٤٤۸/۲) طبرانی (۸٦٤٤) بیهقی (۲۳۷٦)] امام ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس میں عاصم بن بھدلہ راوی ہے، اس میں کچھ ضعف ہے۔ [مجمع الزوائد (۱۰۹/۷)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت ابو اسحاق کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔]

[4] [ضعیف: ابویعلی (۷۵۵٤) ابن حبان (۷۸۰) طبرانی کبیر (۵۸٦٤) العقیلی (٦/۲) ابو نعیم فی اخبار اصفهان (۱۰۱/۱) بیهقی فی شعب الایمان (۲۳۷۸)] امام ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس میں سعید بن خالد مدنی راوی ضعیف ہے۔ [مجمع الزوائد (۳۱۱/٦)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف الجامع الصغیر (۱۹۳۳)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

حضور ﷺ نے فرمایا قرآن سیکھو، قرآن پڑھو جو شخص اسے سیکھتا ہے، پڑھتا ہے پھر اس پر عمل بھی کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بھرا ہوا برتن جس کی خوشبو ہر طرف مہک رہی ہے۔ اسے سیکھ کر سو جانے والے کی مثال اس برتن کی سی ہے جس میں مشک تو بھرا ہوا ہے لیکن اوپر سے منہ بند کر دیا گیا ہے۔ [1] (امام ترمذی اسے حسن کہتے ہیں اور مرسل روایت بھی ہے) واللہ اعلم۔

صحیح بخاری شریف میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ رات کو سورۂ بقرہ کی تلاوت شروع کی، ان کا گھوڑا جوان کے پاس ہی بندھا ہوا تھا، اس نے اچھلنا کودنا اور بدکنا شروع کیا۔ آپ نے قرات چھوڑ دی گھوڑا بھی سیدھا ہو گیا۔ آپ نے پھر پڑھنا شروع کیا۔ گھوڑے نے بھی پھر بدکنا شروع کیا۔ آپ نے پھر پڑھنا موقوف کیا۔ گھوڑا بھی ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ تیسری مرتبہ بھی یہی ہوا چونکہ ان کے صاحبزادے یحییٰ گھوڑے کے پاس ہی لیٹے ہوئے تھے، اس لیے ڈر معلوم ہوا کہ کہیں بچے کو چوٹ نہ آ جائے، قرآن کا پڑھنا بند کر کے اسے اٹھا لیا۔ آسمان کی طرف دیکھا کہ جانور کے بدکنے کی کیا وجہ ہے؟ صبح حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر واقعہ بیان کرنے لگے آپ سنتے جاتے اور فرماتے جاتے ہیں پھر "اسید پڑھتے چلے جاؤ" حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے کہا حضور ﷺ تیسری مرتبہ کے بعد تو یحییٰ کی وجہ سے میں نے پڑھنا بالکل بند کر دیا۔ اب جو نگاہ اٹھی تو دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی چیز سایہ دار ابر کی طرح ہے اور اس میں چراغوں کی طرح کی روشنی ہے بس میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوپر کو اٹھ گئی۔ آپ نے فرمایا جانتے ہو یہ کیا چیز تھی؟ یہ فرشتے جو تمہاری آواز کو سن کر قریب آ گئے تھے اگر تم پڑھنا موقوف نہ کرتے تو وہ صبح تک یونہی رہتے اور ہر شخص انہیں دیکھ لیتا، کسی سے نہ چھپتے۔ [2] یہ حدیث کئی کتابوں میں کئی سندوں کے ساتھ موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

اس کے قریب قریب واقعہ حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ کا ہے کہ ایک مرتبہ لوگوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ گذشتہ رات ہم نے دیکھا، ساری رات حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کا گھر نور کا بقعہ بنا رہا اور چمکدار روشن چراغوں سے جگمگا تا رہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا شاید انہوں نے رات کو سورۂ بقرہ پڑھی ہو گی۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "سچ ہے رات کو میں سورۂ بقرہ کی تلاوت میں مشغول تھا۔" [3] اس کی اسناد تو بہت عمدہ ہے مگر اس میں ابہام ہے اور یہ مرسل بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے فضائل: نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔ "سورۂ بقرہ سیکھو، اس کو حاصل کرنا برکت ہے اور اس کا چھوڑنا حسرت ہے۔ جادوگر اس کی طاقت نہیں رکھتے۔" پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد فرمایا۔ "سورۂ

---

[1] [ضعیف: ترمذی: کتاب فضائل القرآن: باب ما جآء فی فضل سورۃ البقرۃ و آیۃ الکرسی (۲۸۷۶) ابن ماجہ: کتاب السنۃ: باب فی فضل من تعلم القرآن و علمہ (۲۱۷)] شیخ البانی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف ابن ماجہ (۳۹) ضعیف ترمذی (۵۴۱) ضعیف الجامع الصغیر (۲۴۵۲) المشکاۃ (۳۵)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ تاہم حافظ زبیر علی زئی اسے حسن کہتے ہیں۔]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن: باب نزول السکینۃ والملائکۃ عند قراءۃ القرآن (۵۰۱۸) صحیح مسلم: کتاب صلوۃ المسافرین: باب نزول السکینۃ لقراءۃ القرآن (۷۹۶)]

[3] [ضعیف: ابو عبیدہ فی فضائل القرآن (۳۴/۱۲)] حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔]

بقرہ اور سورۂ آل عمران سیکھو‘ یہ دونوں نورانی سورتیں ہیں اپنے پڑھنے والے پر سائبان یا بادل یا پرندوں کے جھنڈ کی طرح قیامت کے روز سایہ کریں گی‘ قرآن پڑھنے والا جب قبر سے اٹھے گا تو دیکھے گا کہ ایک نوجوان نورانی چہرے والا شخص اس کے پاس کھڑا ہوا کہتا ہے کہ کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟ یہ کہے گا نہیں تو وہ جواب دے گا کہ میں قرآن ہوں جس نے دن کو تجھے بھوکا پیاسا رکھا تھا اور راتوں کو بستر سے دور بیدار رکھا تھا۔ ہر تاجر اپنی تجارت کے پیچھے ہے لیکن آج سب تجارتیں تیرے پیچھے ہیں۔‘‘ اب اس کے رہنے کے لیے سلطنت اس کے داہنے ہاتھ میں دی جائے گی اور ہمیشہ کے فائدے اس کے بائیں ہاتھ میں‘ اس کے سر پر وقار و عزت کا تاج رکھا جائے گا‘ اس کے ماں باپ کو دو ایسے عمدہ قیمتی حلے پہنائے جائیں گے کہ ساری دنیا بھی اس کی قیمت کے سامنے ہیچ ہوگی‘ وہ حیران ہو کر کہیں گے کہ آخر اس رحم و کرم اور اس انعام و اکرام کی کیا وجہ ہے؟ تو انہیں جواب دیا جائے گا کہ تمہارے بچے کے قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی وجہ سے تم پر یہ نعمت انعام کی گئی۔ پھر اسے کہا جائے گا پڑھتا جا اور جنت کے درجے چڑھتا جا‘ چنانچہ وہ پڑھتا جائے گا اور درجے چڑھتا جائے گا خواہ ترتیل سے پڑھے یا بے ترتیل۔‘‘ [1]

ابن ماجہ میں بھی اس حدیث کا بعض حصہ مروی ہے [2] اس کی اسناد حسن‘ اور شرط مسلم پر ہے۔ اس کے راوی بشر بن مہاجر سے امام مسلم رحمہ اللہ بھی روایت لیتے ہیں اور امام ابن معین رحمہ اللہ اسے ثقہ کہتے ہیں۔ نسائی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہاں امام احمد رحمہ اللہ اسے منکر الحدیث بتاتے ہیں اور فرماتے ہیں میں نے تلاش کی تو دیکھا کہ وہ عجب عجب حدیثیں لاتا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کی بعض احادیث سے اختلاف کیا جاتا ہے۔ ابو حاتم رازی رحمہ اللہ کا فیصلہ ہے کہ اس کی حدیثیں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن ان سے دلیل نہیں پکڑی جا سکتی۔ ابن عدی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ان کی ایسی روایتیں بھی ہیں جن کی متابعت نہیں کی جاتی۔ دار قطنی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ قوی نہیں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس کی اس روایت کے بعض مضمون دوسری سندوں سے بھی آئے ہیں۔

مسند احمد میں ہے۔ قرآن پڑھا کرو یہ اپنے پڑھنے والوں کی قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔ دو نورانی سورتوں بقرہ اور آل عمران کو پڑھتے رہا کرو۔ یہ دونوں قیامت کے دن اس طرح آئیں گی کہ گویا یہ دو سائبان ہیں یا دو ابر ہیں یا پر کھولے پرندوں کی دو جماعتیں ہیں۔ اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں گی۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ’’سورۂ بقرہ پڑھا کرو۔ اس کا پڑھنا برکت ہے اور چھوڑنا حسرت ہے۔ اس کی

---

[1] [ضعیف : مسند احمد (۵/۳۴۸، ۳۶۱) ابن ابی شیبۃ (۱۰/۴۹۲) دارمی (۲/۴۵۰) حاکم (۱/۵۶۰)] امام بیہقیؒ نے نقل فرمایا ہے کہ امام عقیلیؒ فرماتے ہیں اس مسئلے میں کچھ بھی ثابت نہیں۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف مگر محتمل التحسین ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔]

[2] [حسن : ابن ماجہ : کتاب الادب : باب ثواب قراءۃ القرآن (۳۷۸۱)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف یحتمل التحسین کہا ہے۔ [ابن ماجہ بتحقیق الالبانی] حافظ زبیر علی زئی اسے حسن کہتے ہیں۔]

[3] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب صلوۃ المسافرین : باب فضل قراءۃ القرآن سورۃ البقرۃ (۸۰۴) مصنف عبدالرزاق (۵۹۹۱) مسند احمد (۵/۲۴۹) صحیح ابن حبان (۱۱۶)]

طاقت باطل والوں کو نہیں۔'' (۳) صحیح مسلم شریف میں بھی یہ حدیث ہے۔ مسند احمد کی ایک اور حدیث میں ہے۔ قرآن اور قرآن پڑھنے والوں کو قیامت کے دن بلوایا جائے گا۔ آگے آگے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ہوں گی' بادل کی طرح یا سائے اور سائبان کی طرح یا پر کھولے پرندوں کے جھرمٹ کی طرح۔ یہ دونوں پروردگار سے ڈٹ کر سفارش کریں گی۔'' (۱) مسلم اور ترمذی میں بھی یہ حدیث ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ اسے حسن غریب کہتے ہیں۔

ایک شخص نے اپنی نماز میں سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پڑھی اس کے فارغ ہونے کے بعد حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے ان میں اللہ کا وہ نام ہے کہ اس نام کے ساتھ جب کبھی اسے پکارا جائے' وہ قبول فرماتا ہے۔ اب اس شخص نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے عرض کی کہ مجھے بتایئے وہ نام کون سا ہے؟ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کیا اور فرمایا اگر میں بتادوں تو خوف ہے کہ کہیں تو اس نام کی برکت سے ایسی دعا نہ مانگ لے جو میری اور تیری ہلاکت کا سبب بن جائے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمہارے بھائی کو خواب میں دکھلایا گیا کہ گویا لوگ ایک بلند و بالا پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر دو سرسبز درخت ہیں اور ان میں سے آوازیں آ رہی ہیں کہ کیا تم میں کوئی سورۂ بقرہ کا پڑھنے والا ہے؟ کیا تم میں سے کوئی سورۂ آل عمران کا پڑھنے والا ہے؟ جب کوئی کہتا ہے کہ ''ہاں'' تو وہ دونوں درخت اپنے پھلوں سمیت اس کی طرف جھک جاتے ہیں اور یہ اس کی شاخوں پر بیٹھ جاتا ہے اور وہ اسے اوپر اٹھا لیتے ہیں۔

حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک قرآن پڑھے ہوئے شخص نے اپنے پڑوسی کو مار ڈالا پھر قصاص میں وہ بھی مارا گیا۔ پس قرآن کریم ایک ایک سورت ہو ہو کر الگ ہونا شروع ہوا یہاں تک کہ اس کے پاس سورہ آل عمران اور سورۂ بقرہ رہ گئیں۔ ایک جمعہ کے بعد سورۂ آل عمران چلی گئی پھر ایک جمعہ گذرا تو آواز آئی کہ میری باتیں نہیں بدلا کرتیں اور میں اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا (۲) چنانچہ یہ مبارک سورت یعنی سورۂ بقرہ بھی اس سے الگ ہوگئی مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں سورتیں اس کی طرف سے بلاؤں اور عذاب کی آڑ بنی رہیں اور اس کی قبر میں اس کی دلجوئی کرتی رہیں اور سب سے آخر اس کے گناہوں کی زیادتی کے سبب ان کی سفارش نہ چلی۔ یزید ابن اسود جرشی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کو دن میں پڑھنے والا دن بھر میں نفاق سے بری رہتا ہے اور رات کو پڑھنے والا ساری رات نفاق سے بری رہتا ہے خود حضرت یزید رحمہ اللہ اپنے معمولی وظیفہ قرآن کے علاوہ ان دونوں سورتوں کو صبح شام پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص ان دونوں سورتوں کو رات بھر پڑھتا رہے گا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ فرماں برداروں میں شمار ہوگا۔ اس کی سند منقطع ہے' بخاری و مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں سورتوں کو ایک رکعت میں پڑھا۔ (۳)

---

(۱) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب صلوۃ المسافرین : باب فضل قراۃ القرآن و سورۃ البقرۃ (۸۰۵) ترمذی : کتاب فضائل القرآن : باب ما جآء فی سورۃ ال عمران (۲۸۸۳)]

(۲) [سورۃ ق : آیت ۲۹]

(۳) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب صلوۃ المسافرین : باب استحباب تطویل القراءۃ فی صلوۃ اللیل (۷۷۲)]

سات طویل سورتوں کی فضیلت: رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں مجھ کو سات لمبی سورتیں تورات کی جگہ دی گئی ہیں اور انجیل کی جگہ مجھ کو دو دو سو آیتوں والی سورتیں ملی ہیں۔ اور زبور کے قائم مقام مجھ کو دو سو سے کم آیتوں والی سورتیں دی گئی ہیں اور پھر مجھے فضیلت میں خصوصاً سورۂ ق سے لے کر آخر تک کی سورتیں ملی ہیں [1] یہ حدیث غریب ہے اور اس کے ایک راوی سعید بن ابو بشیر کے بارہ میں کچھ کلام ہے۔ ابو عبید نے اسے دوسری سند سے بھی نقل کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک اور حدیث میں ہے جو شخص ان سات سورتوں کو حاصل کر لے وہ بہت بڑا عالم ہے یہ روایت بھی غریب ہے۔ مسند احمد میں بھی یہ روایت ہے [2] ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ایک لشکر بھیجا اور ان کا امیر انہیں بنایا' جنہیں سورۂ بقرہ یاد تھی حالانکہ وہ ان سب میں چھوٹی عمر کے تھے۔ [3] حضرت سعید بن جبیر تو ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ ﴾ (الحجر / ۸۷) کی تفسیر میں بھی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہی سات سورتیں ہیں۔ سورۂ بقرہ' سورۂ آل عمران' سورۂ نساء' سورۂ مائدہ' سورۂ انعام' سورۂ اعراف اور سورۂ یونس۔ حضرت مجاہد' مکحول' عطیہ بن قیس' ابو محمد فارسی' شداد بن اوس' یحییٰ بن حارث' ذماری ﷭ سے بھی یہی منقول ہے۔

فصل: نزول کا مقام اور کچھ مزید معلومات: سورۂ بقرہ ساری کی ساری مدینہ شریف میں نازل ہوئی ہے اور شروع شروع جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے البتہ اس کی ایک آیت ﴿ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ﴾ (البقرہ / ۲۸۱) الخ یہ سب سے آخر نازل شدہ بتائی جاتی ہے یعنی قرآن کریم میں سب سے آخر یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ نازل بعد میں ہوئی ہو لیکن اسی میں ہے۔ اور اسی طرح سود کی حرمت کی آیتیں بھی آخر میں نازل ہوئی ہیں۔ حضرت خالد بن معدان سورۂ بقرہ کو فسطاط القرآن یعنی قرآن کا خیمہ کہا کرتے تھے۔ بعض علماء کا فرمان ہے کہ اس میں ایک ہزار خبریں ہیں اور ایک ہزار حکم ہیں اور ایک ہزار کاموں سے ممانعت ہے۔ اس کی آیتیں دو سو ستاسی ہیں۔ اس کے کلمات چھ ہزار دو سو اکیس ہیں۔ اس کے حروف ساڑھے پچیس ہزار ہیں۔ واللہ اعلم۔

ابن عباس ﷠ فرماتے ہیں یہ سورت مدنی ہے۔ [4] حضرت عبداللہ بن زبیر ﷛ اور حضرت خارجہ بن ثابت ﷛ اور بہت سے ائمہ علماء اور مفسرین ﷭ سے بھی بلا اختلاف یہی مروی ہے۔ ابن مردویہ کی ایک حدیث

---

[1] [ضعیف: ابو عبید فی الفضائل (۱/۳٤) تفسیر ابن جریر الطبری (۱۲٦) طیالسی (۱۰۱۲)] اس کی سند میں سعید بن بشیر راوی ضعیف ہے۔ [میزان (۲/۱۲۸)] حافظ زبیر علی زئی نے اسی وجہ سے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ تاہم شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس کی تحقیق کے مطابق یہ روایت حسن ہے۔]

[2] [حسن: مسند احمد (٦/ ۷۲ ' ۷۳)، (۲۳۹۲۲) مستدرك حاكم (۱/ ٥٦٤)، (۲۰۷۰) بغوی فی شرح السنة (٤/٤٦۸) الخطیب فی تاریخ بغداد (۱۰/۱۰۸)]

[3] [حسن: ترمذی: کتاب فضائل القرآن: باب ما جاء فی فضل سورة البقره واية الكرسی (۲۸۷٦) ابن ماجه: کتاب السنة: باب فی فضل من تعلم القرآن و عمله (۲۱۷)] امام ترمذیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ امام ابن خزیمہؒ، امام ابن حبانؒ اور امام حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی اسے حسن کہتے ہیں۔]

[4] [الدر المنثور للسيوطی (۱/ ٤۷)]

میں ہے کہ سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ النساء وغیرہ نہ کہا کرو بلکہ یوں کہو کہ وہ سورت جس میں بقرہ کا ذکر ہے۔ وہ سورت جس میں آل عمران کا بیان ہے اور اسی طرح قرآن کی سب سورتوں کے نام لیا کرو۔ [1] لیکن یہ حدیث غریب ہے بلکہ اس کا فرمان رسول ﷺ ہونا ہی صحیح نہیں۔ اس کے راوی عیسیٰ بن میمون ابو سلمہ خواص ضعیف ہیں۔ ان کی روایت سے سند نہیں لی جا سکتی۔ اس کے برخلاف بخاری و مسلم میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بطن وادی سے شیطان پر کنکر پھینکے۔ بیت اللہ ان کی بائیں جانب تھا اور منیٰ دائیں طرف۔ اور فرمایا اسی جگہ سے کنکر پھینکے تھے رسول اللہ ﷺ نے جن پر سورۂ بقرہ اتری ہے' [2] گو اس حدیث سے صاف ثابت ہو گیا کہ سورۂ بقرہ وغیرہ کہنا جائز ہے لیکن مزید سنیئے۔ ابن مردویہ میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے اپنے اصحاب میں کچھ سستی دیکھی تو انہیں "یا اصحاب سورۂ بقرہ" کہہ کر پکارا۔ غالباً یہ غزوۂ حنین والے دن کا ذکر ہے جب لشکر کے قدم اکھڑ گئے تھے تو حضور ﷺ کے حکم سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے انہیں اے درخت والو یعنی اے بیعت الرضوان کرنے والو اور اے سورۂ بقرہ [3] والو کہہ کر پکارا تھا تا کہ ان میں خوشی اور دلیری پیدا ہو۔ چنانچہ اس آواز کے ساتھ ہی صحابہ ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ مسیلمہ جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا' اس کے ساتھ لڑنے کے وقت بھی جب قبیلہ بنو حنیفہ کی چیرہ دستیوں نے پریشان کر دیا اور قدم ڈگمگا گئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی طرح لوگوں کو پکارا "یا اصحاب سورۂ بقرہ" اے سورۂ بقرہ والو! اس آواز پر سب کے سب جمع ہو گئے اور جم کر لڑے یہاں تک کہ ان مرتدوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے لشکر کو فتح دی' [4] اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کے سب صحابہ سے خوش ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
الٓمّٓ ۝۱

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان رحم کرنے والا ہے ○

حروف مقطعات کی تفسیر میں اختلاف: ﴿الٓمّٓ﴾ جیسے حروف مقطعات ہیں جو سورتوں کے اول میں آئے

[1] [**باطل و منکر**: بیهقی فی شعب الایمان (۲۵۸۲) طبرانی اوسط (مجمع البحرین ـ ۳٤٥٠)] اس میں عیسیٰ بن میمون راوی ہے، اسے امام بیہقیؒ نے منکر الحدیث اور امام ہیثمیؒ نے متروک کہا ہے۔[مجمع الزوائد (۱۵۷/۷)] امام ابن جوزیؒ اور امام سیوطیؒ نے اس روایت کو ضعیف و موضوع روایات کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ [الموضوعات (۲۵۰/۱) اللآلی المصنوعة (۲۳۹/۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے منکر کہا ہے۔]

[2] [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب الحج: باب رمی الحمار من بطن الوادی (۱۷٤٧) صحیح مسلم: کتاب الحج: باب رمی جمرة العقبة من بطن الوادی (۱۲۹٦)]

[3] [**ضعیف**: طبرانی کبیر (۱۳۳/۱۷)] امام ہیثمیؒ نے نقل فرمایا ہے کہ اس میں علی بن قتیبہ راوی ضعیف ہے۔[مجمع الزوائد (۳۲۷/٥)، (۹٦٧٣)]

[4] [**ضعیف**: مجمع الزوائد (۱۸۰/٦) عبد الرزاق (۹٤٦٥/٥) ابن ابی شیبة (۵۰۲/۱۲)]

ہیں۔ان کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے بعض تو کہتے ہیں ان کے معنی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں اور کسی کو معلوم نہیں ۔اس لیے وہ ان حروف کی کوئی تفسیر نہیں کرتے ۔قرطبی رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان' حضرت علی' حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہی نقل کیا ہے ۔عامر' شعبی' سفیان ثوری' ربیع بن خثیم رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں ابوحاتم بن حبان رحمہ اللہ کو بھی اسی سے اتفاق ہے بعض لوگ ان حروف کی تفسیر بھی کرتے ہیں لیکن ان کی تفسیر میں بہت کچھ اختلاف ہے ۔عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ سورتوں کے نام ہیں ۔علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشری رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں اکثر لوگوں کا اسی پر اتفاق ہے ۔سیبویہ رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے کہ اوراس کی دلیل بخاری ومسلم کی وہ حدیث ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن صبح کی نماز میں ﴿ الٓمّٓ السجدۃ﴾ اور ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ﴾ (الدھر/ ۱) پڑھتے تھے۔[1] حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿ الٓمّٓ﴾ اور ﴿ حٰمٓ﴾ اور ﴿ الٓمٓصٓ﴾ اور ﴿ صٓ﴾ یہ سب سورتوں کی ابتداء ہے جن سے یہ سورتیں شروع ہوتی ہیں ۔انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ ﴿ الٓمّٓ﴾ قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے ۔حضرت قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے اور شاید اس قول کا مطلب بھی وہی ہے جو حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سورتوں کے نام ہیں اس لیے کہ ہر سورت کو قرآن کہہ سکتے ہیں اور یہ نہیں ہو سکتا کہ سارے قرآن کا نام ﴿ الٓمٓصٓ﴾ ہو کیونکہ جب کوئی شخص کہے کہ میں نے سورہ ﴿ الٓمٓصٓ﴾ پڑھی تو ظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے سورۂ اعراف پڑھی نہ کہ پورا قرآن ۔واللہ اعلم ۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نام ہیں ۔حضرت شعبی' سالم بن عبداللہ' اسماعیل بن عبدالرحمٰن' سدی کبیر رحمہم اللہ یہی کہتے ہیں ۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ﴿ الٓمّٓ﴾ اللہ تعالیٰ کا بڑا نام ہے ۔اور روایت میں ہے کہ ۔﴿ حٰمٓ﴾ ' ﴿ طٰسٓ﴾ اور ﴿ الٓمّٓ﴾ یہ سب اللہ تعالیٰ کے بڑے نام ہیں ۔حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم دونوں سے یہ مروی ہے ۔ایک اور روایت میں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قسم ہے اور اس کا نام بھی ہے ۔حضرت عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ قسم ہے ۔ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ اس کے معنی ﴿اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ﴾ ہیں یعنی میں ہی ہوں اللہ زیادہ جاننے والا ۔حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے بھی یہ مروی ہے ۔

ابن عباس' ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے الگ الگ حروف ہیں ۔ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تین حرف الف اور لام اور میم انتیس حرفوں میں سے ہیں جو تمام زبانوں میں آتے ہیں ۔ان میں سے ہر ہر حرف اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی بلا کا ہے اور اس میں قوموں کی مدت اور ان کے وقت کا بیان ہے ۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تعجب کرنے پر کہا گیا تھا کہ وہ لوگ کیسے کفر کریں گے ان کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کے نام ہیں ۔اس کی روزیوں پر وہ پلتے ہیں ۔الف سے اللہ کا نام اللہ شروع ہوتا ہے اور لام

---

[1] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الجمعة : باب ما یقراء فی صلوة الفجر یوم الجمعة (۸۹۱) صحیح مسلم : کتاب الجمعة : باب ما یقراء یوم الجمعة (۸۷۹)]

سے اس کا نام لطیف شروع ہوتا ہے اور میم سے اس کا نام مجید شروع ہوتا ہے اور الف سے مراد ﴿آلاء﴾ یعنی نعمتیں ہیں اور لام سے مراد اللہ تعالیٰ کا لطف اور میم سے مراد اللہ تعالیٰ کا مجد یعنی بزرگی ہے۔ الف سے مراد ایک سال ہے، لام سے تیس سال اور میم سے چالیس سال۔ [1] (ابن ابی حاتم)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان سب مختلف اقوال میں تطبیق دی ہے یعنی ثابت کیا ہے کہ ان میں ایسا اختلاف نہیں جو ایک دوسرے کے خلاف ہو۔ ہو سکتا ہے یہ سورتوں کے نام بھی ہوں اور اللہ تعالیٰ کے نام بھی ہوں، سورتوں کے شروع کے الفاظ بھی ہوں اور ان میں سے ہر ہر حرف سے اللہ تعالیٰ کے ایک ایک نام کی طرف اشارہ بھی، اور اس کی صفتوں کی طرف بھی اور مدت وغیرہ کی طرف بھی ہو۔ ایک ایک لفظ کئی کئی معنی میں آتا ہے۔ جیسے لفظ ﴿أُمَّة﴾ کہ اس کے ایک معنی ہیں دین جیسے قرآن میں آیا ہے ﴿إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَى أُمَّةٍ﴾ (الزخرف/۲۲) ہم نے اپنے باپ دادوں کو اسی دین پر پایا۔ دوسرے معنی ہیں اللہ کا اطاعت گزار بندہ۔ جیسے فرمایا ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً﴾ (النحل/۱۲۰) الخ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مطیع اور فرمانبردار اور مخلص بندے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ تیسرے معنی ہیں جماعت، جیسے فرمایا: ﴿وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً﴾ (القصص/۲۳) الخ یعنی ایک جماعت کو اس کنویں پر پانی پلاتے ہوئے پایا۔ اور جگہ ہے ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا﴾ (النحل/۳۶) یعنی ہم نے ہر جماعت میں رسول یقیناً بھیجا۔ چوتھے معنی ہیں مدت اور زمانہ۔ فرمان ہے ﴿وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ﴾ (یوسف/۴۵) یعنی ایک مدت کے بعد اسے یاد آیا۔ پس جس طرح یہاں ایک لفظ کے کئی معنی ہوئے اسی طرح ممکن ہے کہ ان حروف مقطعہ کے بھی کئی معنی ہوں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے اس فرمان پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابو العالیہ رحمہ اللہ نے جو تفسیر کی ہے اس کا مطلب تو یہ ہے کہ یہ ایک لفظ ایک ساتھ، ایک ہی جگہ ان سب معنی میں ہے اور لفظ امت وغیرہ جو کئی کئی معنی میں آتے ہیں جنہیں اصطلاح میں الفاظ مشترکہ کہتے ہیں۔ ان کے معنی ہر جگہ جدا جدا تو ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن ہر جگہ ایک ہی معنی ہوتے ہیں جو عبارت کے قرینے سے معلوم ہو جاتے ہیں ایک ہی جگہ سب کے سب معنی مراد نہیں ہوتے اور سب کو ایک ہی جگہ محمول کرنے کے مسئلہ میں علماء اصول کا بڑا اختلاف ہے اور ہمارے تفسیری موضوع سے اس کا بیان خارج ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسرے یہ کہ امت وغیرہ الفاظ کے معنی بہت سارے ہیں اور یہ الفاظ اسی لیے بنائے گئے ہیں کہ بندش کلام اور نشست الفاظ سے ایک معنی ٹھیک بیٹھ جاتے ہیں لیکن ایک حرف کی دلالت ایک ایسے نام پر ممکن ہے جو دوسرے ایسے نام پر بھی دلالت کرتا ہو اور ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہ ہو نہ تو مقدر ماننے سے نہ ضمیر دینے سے نہ وضع کے اعتبار سے اور نہ کسی اور اعتبار سے ایسی بات علمی طور پر تو نہیں سمجھی جا سکتی البتہ اگر منقول ہو تو اور بات ہے لیکن یہاں اختلاف ہے اجماع نہیں ہے اس لیے یہ فیصلہ قابل غور ہے۔ اب بعض اشعار عرب کے جو اس بات کی دلیل میں پیش کیے جاتے ہیں ایک کلمہ کو بیان کرنے کے لیے صرف اس کا پہلا حرف بول دیتے ہیں یہ ٹھیک ہے لیکن ان

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۴۹)، (۲۸/۱)]

شعروں میں خود عبارت ایسی ہوتی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے۔ ایک حرف کے بولتے ہی پورا کلمہ سمجھ میں آ جاتا ہے لیکن یہاں ایسا بھی نہیں واللہ اعلم۔

قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں ایک حدیث میں ہے کہ جو مسلمان کے قتل پر آدھے کلمہ سے بھی مدد کرے (1) مطلب یہ ہے کہ اُقْتُلْ پورا نہ کہے بلکہ صرف "اُقْ" کہے۔

مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں: سورتوں کے شروع میں جو حروف ہیں مثلاً ﴿قٓ، صٓ، حٰمٓ، طٰسٓمٓ، الٓرٰ﴾ وغیرہ یہ سب حروف ہجا ہیں۔ بعض عربی دان کہتے ہیں کہ یہ حروف الگ الگ جو اٹھائیس ہیں ان میں سے چند ذکر کر کے باقی کو چھوڑ دیا گیا ہے جیسے کوئی کہے کہ میرا بیٹا اب ت ث لکھتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ تمام اٹھائیس حروف لکھتا ہے لیکن ابتداء کے چند حروف ذکر کر دیئے اور باقی کو چھوڑ دیا۔ (2) سورتوں کے شروع میں اس طرح کے کل چودہ حروف آئے ہیں ﴿ا ل م ر ص ر ك ه ی ع ط س ح ق ن﴾ ان سب کو اگر ملا لیا جائے تو یہ عبارت بنتی ہے: ﴿نَصٌّ حَكِيْمٌ قَاطِعٌ لَّهٗ سِرٌّ﴾ تعداد کے لحاظ سے یہ حروف چودہ ہیں اور جملہ حروف اٹھائیس ہیں اس لیے یہ پورے آدھے ہوئے بقیہ جن حروف کا ذکر نہیں کیا گیا ان کے مقابلہ میں یہ حروف ان سے زیادہ فضیلت والے ہیں اور یہ صناعت تصریف ہے ایک حکمت اس میں یہ بھی ہے کہ جتنی قسم کے حروف تھے اتنی قسمیں باعتبار اکثریت کے ان میں آ گئیں یعنی مہموسہ مجہورہ وغیرہ۔ سبحان اللہ ہر چیز میں اس مالک کی حکمت نظر آتی ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ اللہ کا کلام لغو، بیہودہ، بے کار، بے معنی الفاظ سے پاک ہے جو جاہل لوگ کہتے ہیں کہ سرے سے ان حروف کے کچھ معنی ہی نہیں وہ بالکل خطا پر ہیں۔ اس کے کچھ نہ کچھ معنی یقیناً ہیں۔

اگر نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنی کچھ ثابت ہوں، تو ہم وہ معنی کریں گے اور سمجھیں گے ورنہ جہاں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ معنی بیان نہیں کیے ہم بھی نہ کریں گے اور ایمان لائیں گے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تو اس بارہ میں ہمیں کچھ نہیں ملا۔

اور علماء کا بھی اس میں بے حد اختلاف ہے۔ اگر کسی پر کسی قول کی دلیل کھل جائے تو خیر وہ اسے مان لے ورنہ بہتر یہ ہے کہ ان حروف کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لائے اور یہ جانے کہ اس کے معنی ضرور ہیں جو اللہ ہی کو معلوم ہیں اور ہمیں معلوم نہیں ہوئے۔ دوسری حکمت ان حروف کے لانے میں یہ بھی ہے کہ ان سے سورتوں کی ابتداء معلوم ہو جائے لیکن یہ وجہ ضعیف ہے اس لیے کہ اس کے بغیر ہی سورتوں کی جدائی معلوم ہو جاتی ہے جن

---

(1) [ضعیف : ابن ماجه : كتاب الديات : باب التغليظ فى قتل مسلم ظلما (٢٦٢٠) العقيلى (٣٨٢/٤) ابو يعلى (٥٩٠٠) بيهقى (٢٢/٨)] حافظ بوصیری رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔[الزوائد (٣٣٤/٢)] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے نقل فرمایا ہے کہ امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس روایت کو باطل و موضوع قرار دیا۔[التلخيص الحبير (١٨٧٠)] امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسے موضوعات میں ذکر کیا ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں اور امام ابن عدی رحمہ اللہ نے اسے غیر محفوظ کہا ہے۔[الموضوعات (١٠٣/٣) ابن عدى (٢٦٠/٧)]

(2) [تفسير ابن جرير الطبرى (٢٠٨/١)]

سورتوں میں ایسے حروف ہی نہیں کیا ان کی ابتداء انتہاء معلوم نہیں؟ پھر سورتوں سے پہلے ﴿ بسم اللہ ﴾ الخ کا پڑھنے اور لکھنے کے اعتبار سے موجود ہونا کیا ایک سورت کو دوسری سے جدا نہیں کرتا؟ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کی حکمت یہ بھی بیان کی ہے کہ چونکہ مشرکین کتاب اللہ کو سنتے ہی نہ تھے اس لیے انہیں سنانے کے لیے ایسے حرف لائے گئے تاکہ جب ان کا دھیان کان لگ جائے تو باقاعدہ تلاوت شروع ہو لیکن یہ وجہ بھی بودی ہے اس لیے اگر ایسا ہوتا تو تمام سورتوں کی ابتداء انہی حروف سے کی جاتی حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اکثر سورتیں اس سے خالی ہیں پھر جب کبھی مشرکین سے کلام شروع ہو یہی حروف چاہئیں۔ نہ کہ صرف سورتوں کے شروع میں ہی یہ حروف ہوں۔ پھر اس پر بھی غور کر لیجیے کہ یہ سورت یعنی سورۂ بقرہ اور اس کے بعد کی سورت یعنی سورۂ آل عمران یہ تو مدینہ شریف میں نازل ہوتی ہیں اور مشرکین مکہ ان کے اترنے کے وقت وہاں تھے ہی نہیں پھر ان میں یہ حروف کیوں آئے؟ ہاں یہاں پر ایک اور حکمت بھی بیان کی گئی ہے کہ ان حروف کے لانے میں قرآن کریم کا ایک معجزہ ہے جس سے تمام مخلوق عاجز ہے باوجود یہ کہ یہ حروف بھی روزمرہ کے استعمالی حروف سے ترکیب دیئے گئے ہیں لیکن مخلوق کے کلام سے بالکل نرالے ہیں۔ مبرد رحمہ اللہ اور محققین کی ایک جماعت اور فراء اور قطرب رحمہم اللہ سے بھی یہی منقول ہے زمخشری رحمہ اللہ نے تفسیر کشاف میں اس قول کو نقل کر کے اس کی بہت کچھ تائید کی ہے۔ شیخ امام علامہ ابو العباس حضرت ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ مجتہد ابو الحجاج مزی رحمہ اللہ نے بھی یہی حکمت بیان کی ہے۔ زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام حروف اکٹھے نہیں آئے۔

ہاں ان حروف کو مکرر لانے کی یہ وجہ ہے کہ بار بار مشرکین کو عاجز اور لاجواب کیا جائے اور انہیں ڈانٹا اور دھمکایا جائے جس طرح قرآن کریم میں اکثر قصے کئی کئی مرتبہ لائے گئے ہیں اور بار بار کھلے الفاظ میں بھی قرآن کے مثل لانے میں ان کی عاجزی کا بیان کیا گیا ہے۔ بعض جگہ تو صرف ایک حرف آیا جیسے ﴿ صٓ ﴾ ﴿ نٓ ﴾ ﴿ قٓ ﴾ کہیں دو حروف آئے ہیں جیسے ﴿ حٰمٓ ﴾ کہیں تین حروف آئے ہیں جیسے ﴿ الٓمٓ ﴾ کہیں چار آئے ہیں جیسے ﴿ الٓمٓرٰ ﴾ اور ﴿ الٓمٓصٓ ﴾ اور کہیں پانچ آئے ہیں جیسے ﴿ كٓهٰيٰعٓصٓ ﴾ اور ﴿ حٰمٓ عٓسٓقٓ ﴾ اس لیے کہ کلمات عرب کے کل کے کل اسی طرح پر ہیں یا تو ان میں ایک حرفی لفظ ہیں یا دو حرفی یا سہ حرفی یا چار حرفی یا پانچ حرف کے پانچ حرف سے زیادہ کے کلمات نہیں۔ جب یہ بات ہے کہ یہ حروف قرآن شریف میں بطور معجزے کے آئے ہیں تو ضروری تھا کہ جن سورتوں کے شروع میں یہ حروف آئے ہیں وہاں ذکر بھی قرآن کریم کا ہو اور قرآن کی بزرگی اور بڑائی بیان ہو چنانچہ ایسا ہی انتیس سورتوں میں یہ واقع ہوا ہے سنیئے فرمان ہے: ﴿ الٓـمٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ یہاں بھی ان حروف کے بعد ذکر ہے کہ اس قرآن کے اللہ جل شانہ کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور جگہ فرمایا: ﴿ الٓمٓ ○ اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُـوَ الْحَىُّ الْقَيُّوْمُ نَـزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ (ال عمران ۲-۳) وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو زندہ اور دائم و قائم ہے جس نے تم پر حق کے ساتھ یہ کتاب تھوڑی تھوڑی نازل فرمائی ہے جو پہلے کی کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے

یہاں بھی ان حروف کے بعد قرآن کریم کی عظمت کا اظہار کیا گیا۔ اور جگہ فرمایا ﴿ الٓمٓصٓ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ (اعراف / ۱) الخ یعنی یہ کتاب تیری طرف اتاری گئی ہے تو اپنا دل تنگ نہ رکھ اور جگہ فرمایا ﴿ الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ ﴾ (ابراھیم / ۱۔۲) الخ یہ کتاب ہم نے تیری طرف نازل کی تا کہ تو لوگوں کو اپنے رب کے حکم سے اندھیروں سے نکال کر اجالے میں لائے۔ ارشاد ہوتا ہے ﴿ الٓمّٓ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (السجدہ ۱'۲) اس کتاب کے رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ فرماتا ہے ﴿ حٰمٓ ○ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ (حم السجدہ / ۱'۲) بخششوں اور مہربانیوں والے اللہ نے اسے نازل فرمایا ہے ﴿ حٰمٓ ○ عٓسٓقٓ ○ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ ﴾ (الشوری / ۳۔۲۔۱) الخ یعنی اسی طرح وحی کرتا ہے اللہ تعالیٰ غالب حکمتوں والا تیری طرف اور ان نبیوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے' اسی طرح اور ایسی سورتوں کے شروع کو بہ غور دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان حروف کے بعد کلام پاک کی عظمت وعزت کا ذکر ہے جس سے یہ بات قوی معلوم ہوتی ہے کہ یہ حروف اس لیے لائے گئے ہیں کہ لوگ اس کے معارضے اور مقابلے سے عاجز ہیں۔ واللہ اعلم۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ان حروف سے مدت معلوم کرائی گئی ہے اور فتنوں لڑائیوں اور دوسرے ایسے ہی کاموں کے اوقات بتائے گئے ہیں لیکن یہ قول بھی بالکل ضعیف معلوم ہوتا ہے اس کی دلیل میں ایک حدیث بھی بیان کی جاتی ہے۔ لیکن اول تو وہ ضعیف ہے دوسرے اس حدیث سے اس قول کی پختگی کا ایک طرف اس کا باطل ہونا زیادہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ حدیث محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ نے نقل کی ہے جو تاریخ کے مصنف ہیں۔ اس حدیث میں ہے کہ ابو یاسر بن اخطب یہودی اپنے چند ساتھیوں کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ اس وقت سورۂ بقرہ کی شروع آیت ﴿ الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ الخ تلاوت فرما رہے تھے وہ اسے سن کر اپنے بھائی حیی بن اخطب کے پاس آیا اور کہا میں نے آج حضور ﷺ کو اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ پوچھتا ہے تو نے خود سنا؟ اس نے کہا ہاں میں نے خود سنا ہے۔ حیی ان سب یہودیوں کو لے کر پھر حضور ﷺ کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے حضور ﷺ کیا یہ سچ ہے کہ آپ اس آیت کو پڑھ رہے تھے۔ آپ نے فرمایا سچ ہے۔ اس نے کہا سنیے۔ آپ سے پہلے جتنے نبی آئے کسی کو بھی نہیں بتایا گیا تھا۔ کہ اس کا ملک اور مذہب کب تک رہے گا لیکن آپ کو بتا دیا گیا پھر کھڑا ہو کر لوگوں سے کہنے لگا سنو! الف کا عدد ہوا ایک' لام کے تیس' میم کے چالیس' کل اکہتر ہوئے۔ کیا تم اس نبی کی تابعداری کرنا چاہتے ہو جس کے ملک اور امت کی مدت کل اکہتر سال ہو؟ پھر حضور ﷺ کی طرف متوجہ ہو کر دریافت کیا کہ کیا کوئی اور آیت بھی ایسی ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں ﴿ الٓمٓصٓ ﴾ کہنے لگا یہ بڑی بھاری اور بڑی لمبی ہے۔ الف کا ایک' لام کے تیس' میم کے چالیس' صاد کے نوے یہ سب ایک سو اکسٹھ سال ہوئے۔ کہا اور کوئی بھی ایسی آیت ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ ﴿ الٓرٰ ﴾ کہنے لگا یہ بھی بہت بھاری اور لمبی ہے۔ الف کا ایک' لام کے تیس اور رے کے دو سو۔ جملہ دو سو اکتیس برس ہوئے۔ کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ایسی ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں ﴿ الٓمّٓرٰ ﴾ ہے کہا یہ تو بہت ہی بھاری ہے الف کا ایک' لام کے تیس' میم

کے چالیس، رے کے دوسو، سب مل کر دو سو اکہتر ہو گئے۔ اب تو کام مشکل ہو گیا اور بات خلط ملط ہو گئی۔ لو گو اٹھو۔

ابو یاسر نے اپنے بھائی سے اور دوسرے علماء یہود سے کہا۔ "کیا عجب کہ ان سب حروف مجموعہ کی مدت حضرت محمد ﷺ کو ملی ہوا کہتر ایک، سو ایک، ایک سو اکتیس ایک، دو سو اکتیس ایک، دو سو اکہتر ایک، یہ سب مل کر سات سو چار برس ہوئے۔ انہوں نے کہا اب کام خلط ملط ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیتیں انہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئیں ﴿هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ﴾ (ال عمران / ٧) الخ یعنی وہی اللہ جس نے تجھ پر یہ کتاب نازل فرمائی جس میں محکم آیتیں ہیں جو اصل کتاب ہیں اور دوسری آیتیں مشابہت والی بھی ہیں۔ [1]

اس حدیث کا دارومدار محمد بن سائب کلبی پر ہے اور جس حدیث کا یہ اکیلا راوی ہو محدثین اس سے حجت نہیں پکڑتے، اور پھر اس طرح اگر مان لیا جائے، اور ہر ایسے حرف کے عدد نکالے جائیں تو جن چودہ حروف کو ہم نے بیان کیا ان کے عدد بہت ہو جائیں گے اور جو حروف ان میں سے کئی کئی بار آئے ہیں اگر ان کے عدد کا شمار بھی کئی کئی بار لگایا جائے تو بہت ہی بڑی گنتی ہو جائے گی۔ واللہ اعلم۔

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝

اس کتاب (کے اللہ کی کتاب ہونے) میں کوئی شک نہیں پرہیز گاروں کو راہ دکھانے والی ہے ۝

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہاں ﴿ذَٰلِكَ﴾ معنی میں ﴿هَٰذَا﴾ کے ہیں۔ مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، سدی، مقاتل بن حیان، زید بن اسلم اور ابن جریج رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے قائم مقام عربی زبان میں اکثر آتے رہتے ہیں۔ حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے ابوعبیدہ رحمہ اللہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ﴿ذَٰلِكَ﴾ اصل میں ہے تو دور کے اشارے کے لیے جس کے معنی ہیں "وہ" لیکن کبھی نزدیک کے لیے بھی لاتے ہیں اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں "یہ" یہاں بھی اسی معنی میں ہے۔ زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں اس سے اشارہ الٓمٓ کی طرف ہے۔ جیسے اس آیت میں ہے ﴿لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ﴾ (البقرہ / ٦٨) یعنی نہ تو وہ گائے بڑھیا ہے نہ بچہ ہے بلکہ اس کے درمیانی عمر کی جوان ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ﴿ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ﴾ (ممتحنہ / ١٠) یہ ہی ہے اللہ کا حکم جو تمہارے درمیان حکم کرتا ہے۔ اور جگہ فرمایا ﴿ذَٰلِكُمُ اللَّهُ﴾ (الانعام: / ١٠٢) یہ ہی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کی مثال اور مواقع پہلے گذر چکے۔ واللہ اعلم۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ اشارہ قرآن کریم کی طرف ہے جس کے اتارنے کا وعدہ رسول اللہ ﷺ سے ہوا تھا۔ بعض نے توراۃ کی طرف کسی نے انجیل کی طرف بھی اشارہ بتایا ہے اور اسی طرح کے دس قول

---

[1] [ضعیف جدا: التاریخ الکبیر للبخاری (٢/٢٠٨) تفسیر ابن جریر الطبری (٢٤٦)، (١/٢١٦)] اس میں محمد بن سائب کلبی راوی متروک ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے کلبی راوی کی وجہ سے اس کی سند کو سخت ضعیف کہا ہے۔]

ہیں لیکن ان کو اکثر مفسرین نے ضعیف کہا ہے۔ واللہ اعلم۔

"کِتَابُ" سے مراد قرآن کریم ہے جن لوگوں نے کہا ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ الْكِتَابُ ﴾ کا اشارہ توراۃ اور انجیل کی طرف ہے۔ انہوں نے انتہائی بھول بھلیوں کا راستہ اختیار کیا' بڑی تکلیف اٹھائی اور خواہ مخواہ بلا وجہ وہ بات کہی جس کا انہیں علم نہیں۔ ﴿ رَيْبَ ﴾ کے معنی ہیں شک وشبہ۔ حضرت ابن عباس' حضرت ابن مسعود اور کئی ایک صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہی معنی مروی ہیں۔ [1] ابو درداء' ابن عباس رضی اللہ عنہم' مجاہد' سعید بن جبیر' ابو مالک' نافع جو ابن عمر کے مولا ہیں' عطا' ابو العالیہ' ربیع بن انس' مقاتل بن حیان' سدی' قتادہ' اسماعیل بن ابو خالد رحمہم اللہ سے بھی یہی مروی ہے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ مفسرین میں اس میں اختلاف نہیں۔ [2] ﴿ رَيْبَ ﴾ کا لفظ عرب شاعروں کے شعروں میں تہمت کے معنی میں بھی آیا ہے اور حاجت کے معنی میں بھی اس کا استعمال ہوا ہے۔ اس جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ اس قرآن کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونے میں کچھ شک نہیں۔ جیسے سورۂ سجدہ میں ہے ﴿ الٓمّٓ ○ تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ (السجدہ/ ۱'۲) یعنی بے شک یہ قرآن کریم تمام جہانوں کے پالنے والے اللہ کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے گو یہ خبر ہے مگر معنی میں نہی کے ہے یعنی اس میں شک نہ کرو۔

بعض قاری ﴿ لَا رَيْبَ ﴾ پر وقف کرتے ہیں اور ﴿ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ کو الگ جملہ پڑھتے ہیں لیکن ﴿ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ پر ٹھہرنا بہت بہتر ہے کیونکہ یہی مضمون اسی طرح سورۂ سجدہ کی آیت میں گزر چکا ہے اور اس میں بہ نسبت ﴿ فِيْهِ هُدًى ﴾ کے زیادہ مبالغہ ہے۔ ﴿ هُدًى ﴾ نحوی اعتبار سے صفت ہو کر مرفوع ہو سکتا ہے اور حال کی بنا پر منصوب ہو سکتا ہے۔ اس جگہ ہدایت کو متقیوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ ﴾ (فصلت/ ٤٤) الخ یعنی یہ قرآن ہدایت اور شفا ہے ایمان والوں کے لیے اور بے ایمانوں کے کان بوجھل ہیں اور آنکھیں اندھی ہیں یہ بہت دور کی جگہ سے پکارے جاتے ہیں' اور فرمایا ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (الاسراء/ ۸۲) الخ یعنی یہ قرآن ایمان داروں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ظالم لوگ تو اپنے خسارے میں ہی بڑھتے جاتے ہیں۔ اسی مضمون کی اور آیتیں بھی ہیں ان سب کا مطلب یہ ہے کہ گو قرآن کریم خود ہدایت اور محض ہدایت ہے اور سب کے لیے ہے لیکن اس ہدایت سے نفع اٹھانے والے صرف نیک بخت لوگ ہیں۔ جیسے فرمایا ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (یونس/ ٥٧) الخ لوگو تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی نصیحت اور سینے کی بیماریوں کی شفاء آ چکی جو مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے اور ابن عباس' ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ہدایت سے مراد نور ہے۔

متقی کون ہیں؟: ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: متقی وہ ہیں جو ایمان لا کر شرک سے دور رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام بجا لائیں۔ ایک اور روایت میں ہے متقی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عذابوں سے ڈر کر ہدایت کو نہیں چھوڑتے اور اس کی رحمت کی امید رکھ کر اس کی طرف سے جو نازل ہوا اسے سچا جانتے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۲۲۸)] [2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۳۱)]

''متقی وہ ہے جو حرام سے بچے اور فرائض بجالائے۔'' حضرت اعمش حضرت ابوبکر بن عیاش رحمہ اللہ سے سوال کرتے ہیں۔ ''متقی کون ہے؟'' آپ یہی جواب دیتے ہیں پھر میں نے کہا ''ذرا حضرت کلبی سے بھی تو دریافت کرلو'' وہ کہتے ہیں جو کبیرہ گناہوں سے بچیں۔ اس پر دونوں کا اتفاق ہوتا ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں متقی وہ ہے جس کا وصف اللہ تعالیٰ نے خود اس آیت کے بعد بیان فرمایا کہ ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (البقرہ/٣) الخ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سب اوصاف متقیوں میں جمع ہوتے ہیں۔ ترمذی اور ابن ماجہ کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بندہ حقیقی متقی نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جن میں حرج نہیں اس خوف سے کہ کہیں وہ حرج میں گرفتار نہ ہوجائے۔ [1] امام ترمذی رحمہ اللہ اسے حسن غریب کہتے ہیں ابن ابی حاتم میں ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جبکہ لوگ ایک میدان میں قیامت کے دن روک لیے جائیں گے' اس وقت ایک پکارنے والا پکارے گا کہ متقی کہاں ہیں؟ اس آواز پر وہ کھڑے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنے بازو میں لے لے گا اور بے حجاب انہیں اپنے دیدار سے مشرف فرمائے گا۔ ابوعفیف نے پوچھا حضرت متقی کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا جو لوگ شرک اور بت پرستی سے بچیں اور اللہ کی خالص عبادت کریں وہ اسی عزت کے ساتھ جنت میں پہنچائے جائیں گے۔

ہدایت کیا ہے؟ ہدایت کے معنی کبھی تو دل میں ایمان پیوست ہوجانے کے آتے ہیں ایسی ہدایت پر تو سوائے اللہ جل وعلا کی مہربانی کے کوئی قدرت نہیں رکھتا فرمان ہے ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ﴾ (القصص/٥٦) یعنی اے نبی جسے تو چاہے ہدایت نہیں دے سکتا۔ فرماتا ہے ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾ (البقرہ/٢٧٢) تجھ پر ان کی ہدایت لازم نہیں۔ فرماتا ہے ﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ﴾ (اعراف/١٨٦) جسے اللہ گمراہ کرے اسے کوئی ہدایت پر لانے والا نہیں۔ فرمایا ﴿مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ﴾ (الکہف/١٧) الخ یعنی جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت والا ہے اور جسے وہ گمراہ کرے تم ہرگز نہ اس کا ولی پاؤ گے نہ مرشد۔ اس قسم کی اور آیتیں بھی ہیں اور ہدایت کے معنی کبھی حق کے اور حق کو واضح کردینے کے اور حق پر دلالت کرنے اور حق کی طرف راہ دکھانے کے بھی آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (الشوری/٥٢) یعنی تو یقیناً سیدھی راہ کی رہبری کرتا ہے۔ اور فرمایا ﴿اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (الرعد/٧) یعنی تو صرف ڈرانے والا ہے اور ہر قوم کے لیے کوئی ہادی ہے۔ اور جگہ فرمان ہے ﴿وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ﴾ (حم السجدہ/١٧) الخ یعنی ہم نے ثمودیوں کو ہدایت دکھائی لیکن انہوں نے اندھے پن کو ہدایت پر ترجیح دے کر پسند کرلیا۔ فرماتا ہے ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ (البلد/١٠) ہم نے اسے دونوں راہیں دکھائیں یعنی بھلائی

---

[1] [**ضعیف** : ترمذی : کتاب صفة القیامة و الرقائق (٢٤٥١) ابن ماجه : کتاب الزھد (٤٢١٥) عبد بن حمید (٤٨٤) بخاری فی التاریخ (١٥٨/١/٣) ابن ابی حاتم فی التفسیر (٦٠) طبرانی کبیر (٤٤٦/١٧) حاکم (٣١٩/٤)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [غایة المرام (١٧٨)] کیونکہ اس کی سند میں عبداللہ بن یزید دمشقی راوی ضعیف ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ تاہم مولانا مبشر احمد ربانی نے اسے صحیح کہا ہے۔]

اور برائی کی۔ تقویٰ کے اصلی معنی بری چیزوں سے بچنے کے ہیں۔ اصل میں یہ ''وقوی'' ہے وقایت سے ماخوذ ہے نابغہ وغیرہ کے اشعار میں بھی آیا ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کبھی کانٹے دار راستے میں چلے ہو؟ جیسے وہاں کپڑوں کو اور جسم کو بچاتے ہو ایسے ہی گناہوں سے بال بال بچنے کا نام تقویٰ ہے ابن معتز شاعر کا قول ہے:

خَلِّ الذُّنُوبَ صَغِيرَهَا وَكَبِيرَهَا ذَاكَ التُّقَى
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ أَرْضِ الشَّوْكِ يَحْذِرُ مَا يَرَى
لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيرَةً إِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصَى

یعنی چھوٹے اور بڑے اور سب گناہوں کو چھوڑ دو یہی تقویٰ ہے۔ ایسے رہو جیسے کانٹوں والی راہ پر چلنے والا انسان۔ چھوٹے گناہ کو بھی ہلکا نہ جانو۔ دیکھو پہاڑ کنکروں سے ہی بن جاتے ہیں۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ اپنے اشعار میں فرماتے ہیں انسان اپنی تمناؤں کا پورا ہونا چاہتا ہے اور اللہ کے ارادوں پر نگاہ نہیں رکھتا حالانکہ ہوتا وہی ہے جو اللہ کا ارادہ ہو۔ وہ اپنے دنیوی فائدے اور مال کے پیچھے پڑا ہوا ہے حالانکہ اس کا بہترین فائدہ اور عمدہ مال اللہ سے تقویٰ ہے۔ ابن ماجہ کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سب سے عمدہ فائدہ جو انسان حاصل کر سکتا ہے وہ اللہ کا ڈر ہے۔ اس کے بعد نیک بیوی ہے کہ خاوند جب اس کی طرف دیکھے وہ اسے خوش کر دے اور جو حکم دے اسے بجالائے اور اگر قسم دے دے تو پوری کر دکھائے اور جب وہ موجود نہ ہو تو اس کے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔ (1)

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ

جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں

ایمان کی حقیقت: حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ایمان کسی چیز کی تصدیق کرنے کا نام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی یہی فرماتے ہیں۔ حضرت زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''ایمان کہتے ہیں عمل کو'' ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں۔ یہاں ایمان لانے سے مراد ڈرنا ہے۔ (2) ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ یہ سب اقوال مل جائیں۔ تو مطلب یہ ہوگا کہ زبان سے دل سے عمل سے غیب پر ایمان لانا اور اللہ سے ڈرنا۔ ایمان کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ پر اس کی کتابوں پر اس کے رسولوں پر ایمان لانا شامل ہے اور اس اقرار کی تصدیق عمل کے ساتھ بھی کرنا لازم ہے۔ میں کہتا ہوں لغت میں ایمان کہتے ہیں: صرف سچا مان لینے کو قرآن میں بھی ایمان اس معنی میں استعمال

---

(1) [ضعیف: ابن ماجہ: کتاب النکاح: باب افضل النساء (۱۸۵۷)] حافظ بوصیری نے فرمایا ہے کہ اس کی سند میں علی بن زید بن جدعان راوی ضعیف ہے۔ [الزوائد (۲/۷۰)] شیخ البانی نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ [السلسلة الضعيفة (۴۴۲۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو سخت ضعیف کہا ہے۔]

(2) [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۲۳۵)]

ہوا ہے۔ جیسے فرمایا ﴿يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (التوبه / ٦١) یعنی اللہ کو مانتے ہیں اور ایمان والوں کو سچا جانتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا تھا۔ ﴿وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِيْنَ﴾ (یوسف / ١٧) یعنی تو ہمارا یقین نہیں کرے گا اگرچہ ہم سچے ہوں۔ اس طرح ایمان یقین کے معنی میں آتا ہے جب اعمال کے ذکر کے ساتھ ملا ہوا ہو۔ جیسے فرمایا ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (انشقاق / ٢٥) ہاں جس وقت اس کا استعمال مطلق ہو تو ایمان شرعی جو اللہ کے ہاں مقبول ہے وہ اعتقاد قول اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ [1] اکثر ائمہ کا یہی مذہب ہے بلکہ امام شافعی' امام احمد اور امام ابوعبیدہ رحمہم اللہ وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایمان نام ہے زبان سے کہنے اور عمل کرنے کا۔ ایمان بڑھتا گھٹتا رہتا ہے اور اس کے ثبوت میں بہت سے آثار اور حدیثیں بھی آئی ہیں۔ جو ہم نے بخاری شریف کی شرح میں نقل کر دی ہیں۔ فالحمد للہ۔

بعض نے ایمان کے معنی اللہ سے ڈر خوف کے بھی کیے ہیں۔ جیسے فرمان ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ (الملك / ١٢) جو لوگ اپنے رب سے در پردہ ڈرتے رہتے ہیں۔ اور جگہ فرمایا ﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (ق / ٣٣) الخ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے بن دیکھے ڈرے اور جھکنے والا دل لے کر آئے۔ حقیقت میں اللہ کا خوف ایمان کا اور علم کا خلاصہ ہے۔ جیسے فرمایا ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر / ٢٨) جو بندے ذی علم ہیں صرف اللہ سے ہی ڈرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں وہ غیب پر بھی ایسا ہی ایمان رکھتے ہیں جیسا حاضر پر اور ان کا حال منافقوں جیسا نہیں کہ جب ایمان والوں کے سامنے ہوں تو اپنا ایماندار ہونا ظاہر کریں لیکن جب اپنے والوں میں ہوتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان منافقین کا حال اور جگہ اس طرح بیان ہوا ہے ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ﴾ (المنافقون / ١) الخ یعنی منافق جب تیرے پاس آئیں گے تو کہیں گے کہ ہماری تہ دل سے شہادت ہے کہ تو اللہ کا رسول ہے اللہ خوب جانتا ہے کہ تو اسکا رسول ہے لیکن اللہ کی گواہی ہے کہ یہ منافق تجھ سے جھوٹ کہتے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے ﴿بِالْغَيْبِ﴾ حال ٹھہرے گا یعنی وہ ایمان لاتے ہیں درآں حالیکہ لوگوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ غیب کا لفظ جو یہاں ہے' اس کے معنی میں بھی مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں اور وہ سب صحیح ہیں اور جمع ہو سکتے ہیں۔

ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ پر' فرشتوں پر' کتابوں پر' رسولوں پر' قیامت پر' جنت و دوزخ پر' ملاقات اللہ پر' مرنے کے بعد جی اٹھنے پر' ایمان لانا ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور بعض دیگر اصحاب سے مروی ہے کہ اس سے مراد وہ پوشیدہ چیزیں ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں جیسے جنت' دوزخ وغیرہ۔ وہ امور جو قرآن میں مذکور ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اللہ کی طرف سے جو کچھ آیا ہے وہ سب غیب میں داخل ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس سے مراد قرآن ہے۔ عطا بن ابورباح رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ پر ایمان لانے والا غیب پر ایمان لانے والا ہے۔ اسماعیل بن ابوخالد رحمہ اللہ فرماتے ہیں اسلام کی تمام پوشیدہ چیزیں مراد ہیں۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ کہتے ہیں مراد تقدیر پر ایمان لانا ہے۔ پس یہ تمام اقوال معنی کی رو سے ایک ہی

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (١/ ٣٥)]

ہیں اس لیے کہ سب چیزیں پوشیدہ ہیں اور غیب کی تفسیر ان سب پر مشتمل ہے اور ان سب پر ایمان لانا واجب ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل بیان ہوتے ہیں تو آپ فرماتے ہیں ”حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہی تھا لیکن اللہ کی قسم ایمانی حیثیت سے وہ لوگ افضل ہیں جو بغیر دیکھے ایمان لاتے ہیں۔ پھر آپ نے ﴿ الٓمٓ ﴾ سے لے کر ﴿ مُفْلِحُوْنَ ﴾ تک آیتیں پڑھیں۔ [1] (ابن ابی حاتم۔ ابن مردویہ۔ مستدرک حاکم) [2] امام حاکم رحمہ اللہ اس روایت کو صحیح بتاتے ہیں۔ مسند احمد میں بھی اس مضمون کی ایک حدیث ہے۔ ابو جمعہ صحابی رضی اللہ عنہ سے ابن محیریز رحمہ اللہ نے کہا کہ کوئی ایسی حدیث سناؤ جو تم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو۔ فرمایا میں تمہیں ایک بہت ہی عمدہ حدیث سناتا ہوں‘ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ناشتہ کیا‘ ہمارے ساتھ ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی تھے‘ انہوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم سے بہتر بھی کوئی اور ہے؟ ہم آپ پر اسلام لائے‘ آپ کے ساتھ جہاد کیا‘ آپ نے فرمایا ہاں وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے‘ مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انہوں نے مجھے دیکھا بھی نہ ہوگا۔ [3] تفسیر ابن مردویہ میں ہے۔ صالح بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابو جمعہ انصاری رضی اللہ عنہ ہمارے پاس بیت المقدس میں آئے۔ رجاء بن حیوہ رضی اللہ عنہ بھی ہمارے ساتھ ہی تھے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو ہم انہیں چھوڑنے کو ساتھ چلے‘ جب الگ ہونے لگے تو فرمایا تمہاری ان مہربانیوں کا بدلہ اور حق مجھے ادا کرنا چاہیے۔ سنو! میں تمہیں ایک حدیث سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے‘ ہم نے کہا اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے ضرور سناؤ۔ کہا سنو! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے‘ ہم دس آدمی تھے‘ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی ان میں تھے‘ ہم نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہم سے بڑے اجر کا مستحق بھی کوئی ہوگا؟ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور آپ کی تابعداری کی۔ آپ نے فرمایا تم ایسا کیوں نہ کرتے؟ اللہ کا رسول تم میں موجود ہے‘ وحی الٰہی آسمان سے تمہارے سامنے نازل ہو رہی ہے۔ ایمان تو ان لوگوں کا افضل ہوگا جو تمہارے بعد آئیں گے دو گتوں کے درمیان یہ کتاب پائیں گے‘ اس پر ایمان لائیں گے اور اس پر عمل کریں گے‘ یہ لوگ اجر میں تم سے دگنے ہوں گے۔ [4] اس حدیث میں ”وَجَادَہ“ کی قبولیت کی دلیل ہے جس میں محدثین کا اختلاف ہے۔ میں نے مسئلہ کو بخاری شریف میں خوب واضح کر دیا ہے بعد والوں کی تعریف اسی بنا پر ہو رہی ہے اور ان کا بڑے اجر والا ہونا اسی حیثیت کی وجہ سے ہے ورنہ علی الاطلاق ہر طرح سے بہتر اور افضل تو صحابہ رضی اللہ عنہم ہی ہیں۔

---

[1] [سنن سعید بن منصور (۲/۵۴۴)]

[2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۴) مستدرک حاکم (۲/۲۶۰)]

[3] [صحیح: مسند احمد (۴/۱۰۶) مسند ابو یعلی (۱۵۵۹) دارمی (۲۷۴۷) طبرانی کبیر (۳۵۳۸) بخاری فی خلق افعال العباد (ص: ۵۰) ابن ابی عاصم (۲۱۳۶)] امام ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔[مجمع الزوائد (۱۰/۶۹)] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔[فتح الباری (۶/۷)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔[السلسلة الصحیحة (۷/۹۰۷)]

[4] [ضعیف: طبرانی کبیر (۳۵۴۰) مجمع الزوائد (۱۰/۶۵)] اس میں عبداللہ بن صالح ضعیف ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے بھی اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔]

ایک اور حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ سے پوچھا' تمہارے نزدیک ایمان لانے میں کون زیادہ افضل ہے؟ انہوں نے کہا' فرشتے۔ فرمایا وہ ایمان کیوں نہ لائیں وہ تو اپنے رب کے پاس ہی ہیں' لوگوں نے پھر کہا' انبیاء' فرمایا وہ ایمان کیوں نہ لائیں ان پر تو وحی نازل ہوتی ہے۔ کہا پھر ہم' فرمایا تم ایمان کو قبول کیوں نہ کرتے ؟ جب کہ میں تم میں موجود ہوں سنو ! میرے نزدیک سب سے زیادہ افضل ایمان والے وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں گے۔ صحیفوں میں لکھی ہوئی کتاب پائیں گے اس پر ایمان لائیں گے۔ [1] اس کی سند میں مغیرہ بن قیس ہیں۔ ابو حاتم رازی رحمہ اللہ انہیں منکر الحدیث بتاتے ہیں لیکن اسی کے مثل ایک اور حدیث ضعیف سند سے۔ مسند ابو یعلی تفسیر ابن مردویہ مستدرک حاکم میں بھی مروی ہے اور حاکم اسے صحیح بتاتے ہیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کے مثل مرفوعاً مروی ہے۔ [2] واللہ اعلم۔ ابن ابی حاتم میں ہے حضرت بدیلہ بنت اسلم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ بنو حارثہ کی مسجد میں ہم ظہر یا عصر کی نماز میں تھے اور بیت المقدس کی طرف ہمارا منہ تھا دو رکعت ادا کر چکے تھے کہ کسی نے آ کر خبر دی کہ نبی ﷺ نے بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر لیا ہے ہم سنتے ہی گھوم گئے۔ عورتیں مردوں کی جگہ آ گئیں اور مرد عورتوں کی جگہ چلے گئے اور باقی کی دو رکعتیں ہم نے بیت اللہ شریف کی طرف ادا کیں۔ جب حضور ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا یہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ [3] یہ حدیث اس اسناد سے غریب ہے۔

وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے دیتے رہتے ہیں ○

اقامت صلاۃ کی فرضیت اور صدقہ وخیرات کی فضیلت: ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں فرائض نماز بجالانا۔ [4] رکوع' سجدہ' تلاوت' خشوع اور توجہ کو قائم رکھنا نماز کو قائم رکھنا ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں وقتوں کا خیال رکھنا' وضو اچھی طرح کرنا' رکوع' سجدہ پوری طرح کرنا' اقامت صلوٰۃ ہے۔ مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں وقت کی نگہبانی کرنا۔ مکمل طہارت کرنا' رکوع'

[1] [ضعیف : بزار (۳۸۳۹) مستدرک حاکم (۲/۸۵) مسند ابو یعلی (۱۶۰)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس روایت کے ضعیف ہونے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اسماعیل بن عیاش راوی ہے جس کی غیر شامیوں سے روایت ضعیف ہوتی ہے (اور یہ روایت غیر شامیوں سے ہے) اور دوسرے اس میں مغیرہ راوی ہے جسے امام ابن ابی حاتمؒ نے منکر الحدیث کہا ہے۔ [ابن ابی حاتم (۸/۲۲۷)]

[2] [ضعیف : مسند بزار (۲۸۴۰) مجمع الزوائد للهیثمی (۱۰/۶۵)] یہ روایت سعید بن بشیر راوی کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

[3] [ضعیف جدا : تفسیر ابن ابی حاتم (۷۳)، (۱/۳۶) طبرانی کبیر (۲۴/۲۰۷) اسد الغابة لابن الأثیر (۷/۹۴۴)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند سخت ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں اسحاق بن ادریس راوی ہے۔ جس کے متعلق امام بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ لوگوں نے اسے متروک کہا ہے اور امام ابن معینؒ فرماتے ہیں کہ وہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ حافظ زبیر علی زئی نے بھی اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔]

[4] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۲۴۱)] [5] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۷)]

سجدہ پورا کرنا' تلاوت اچھی طرح کرنا۔ التحیات اور درود پڑھنا اقامت صلوٰۃ ہے۔ (۵) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ﴿مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ کے معنی زکوٰۃ ادا کرنے کے ہیں۔ (۱) ابن عباس' ابن مسعود اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے اس سے مراد آدمی کا اپنے بال بچوں کو کھلانا پلانا ہے۔ (۲) خرچ میں قربانی دینا جو قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ اپنی استعداد کے مطابق بھی شامل ہے جو زکوٰۃ کے حکم سے پہلے کی آیت ہے۔ حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی سات آیتیں جو سورۂ برات میں ہیں ان کے نازل ہونے سے پہلے یہ حکم تھا کہ اپنی اپنی طاقت کے مطابق تھوڑا بہت جو میسر ہو دیتے رہیں۔ (۳)

قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ مال تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے عنقریب تم سے جدا ہو جائے گا۔ اپنی زندگی میں اسے اللہ کی راہ میں لگا دو۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت عام ہے زکوٰۃ کو اہل وعیال میں خرچ اور جن لوگوں کو دینا ضروری ہے ان سب کو دینا بھی شامل ہے اس لیے کہ پروردگار نے ایک عام وصف بیان فرمایا اور عام تعریف کی ہے لہٰذا ہر طرح کا خرچ شامل ہوگا۔ میں کہتا ہوں قرآن کریم میں اکثر جگہ نماز کا اور مال خرچ کرنے کا ذکر ملا جلا آتا ہے اس لیے نماز اللہ کا حق اور اس کی عبادت ہے جو اس کی توحید' اس کی ثنا' اس کی بزرگی' اس کی طرف جھکنے' اس پر توکل کرنے' اس سے دعا کرنے کا نام ہے اور خرچ کرنا مخلوق کی طرف احسان کرنا ہے جس سے انہیں نفع پہنچے۔ اس کے زیادہ حقدار اہل وعیال اور غلام ہیں' پھر دور والے اجنبی۔ لہٰذا تمام واجب خرچ اخراجات اور فرض زکوٰۃ اس میں داخل ہیں۔ صحیحین میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسلام کی بنیادیں پانچ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دینا۔ نماز قائم رکھنا۔ زکوٰۃ دینا۔ رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔ (۴) اس بارے میں اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ عربی لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا کے ہیں۔ عرب شاعروں کے شعر اس پر شاہد ہیں۔ پھر شریعت میں اس لفظ کا استعمال نماز کے لیے ہونے لگا جو رکوع سجود اور دوسرے خاص افعال کا نام ہے جو مخصوص اوقات میں جملہ شرائط اور صفات اور اقسام کے ساتھ بجالائی جاتی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ نماز کو صلوٰۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ نمازی اللہ تعالیٰ سے اپنے عمل کا ثواب طلب کرتا ہے اور اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جو دو رگیں پیٹھ سے لے کر ریڑھ کی ہڈی کی دوسری طرف آتی ہے انہیں عربی میں صلوین کہتے ہیں چونکہ نماز میں یہ ہلتی ہیں اس لیے اسے صلوٰۃ کہا گیا ہے۔ لیکن یہ قول ٹھیک نہیں۔ بعض نے کہا ہے یہ ماخوذ ہے صلی سے' جس کے معنی ہیں جھک جانا اور لازم ہو جانا۔ جیسے قرآن میں ﴿لَا يَصْلٰهَا﴾ (۵) الخ یعنی جہنم میں ہمیشہ نہ رہے گا مگر بدبخت۔ بعض علماء کا قول ہے کہ

---

(۱) [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۲۴۳)]
(۲) [أیضا]
(۳) [أیضا]
(۴) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الایمان: باب دعاؤ کم ایمانکم (۸) صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب بیان ارکان الاسلام (۱۶)]
(۵) [سورۃ اللیل: آیت ۱۵]

جب لکڑی کو درست کرنے کے لیے آگ پر رکھتے ہیں تو عرب تَصْلِیَہ کہتے ہیں چونکہ نمازی بھی اپنے نفس کی کجی کو نماز سے درست کرتا ہے اس لیے اسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (العنکبوت / ٤٥) الخ یعنی نماز ہر بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے لیکن اس کا دعا کے معنی میں ہونا ہی زیادہ صحیح اور زیادہ مشہور ہے واللہ اعلم۔ لفظ زکوٰۃ کی بحث ان شاء اللہ اور جگہ آئے گی۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں ○

تقویٰ میں آسمانی کتابوں اور یوم آخرت پر ایمان بھی شامل : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی طرف سے تم پر نازل ہوا اور تجھ سے پہلے کے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوا وہ ان سب کی تصدیق کرتے ہیں ایسا نہیں کہ وہ کسی کو مانیں اور کسی سے انکار کریں بلکہ اپنے رب کی سب باتوں کو مانتے ہیں اور آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں یعنی بعث وقیامت وجنت ودوزخ' حساب ومیزان سب کو مانتے ہیں۔ [1] قیامت چونکہ دنیا کے فنا ہونے کے بعد آئے گی اس لیے اسے آخرت کہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جن کی پہلے ایمان بالغیب وغیرہ کے ساتھ صفت بیان کی گئی تھی انہی کی دوبارہ یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ یعنی ایماندار خواہ عرب مومن ہوں خواہ اہل کتاب وغیرہ۔ مجاہد' ابوالعالیہ' ربیع بن انس اور قتادہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا ہے یہ دونوں ہیں تو ایک مگر مراد اس سے صرف اہل کتاب ہی نہیں۔ ان دونوں صورتوں میں واؤ عطف کو ہوگا اور صفتوں کا عطف صفتوں پر ہوگا جیسے ﴿سَبِّحِ اسْمَ﴾ (اعلیٰ / ١) الخ میں صفتوں کا عطف صفتوں پر ہے اور شعراء کے شعروں میں بھی آیا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ پہلی صفتیں تو ہیں عرب مومنوں کی اور ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ الخ سے مراد اہل کتاب مومنوں کی صفتیں ہیں سدی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس' ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے اور ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی سے اتفاق کیا ہے اور اس کی شہادت میں یہ آیت لائے ہیں ﴿وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ﴾ (آل عمران / ١٩٩) الخ یعنی اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس وحی پر جو تمہاری طرف نازل ہوئی اور اس وحی پر جو اس سے پہلے ان کی طرف اتاری گئی ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور جگہ ارشاد ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ﴾ (القصص / ٥٢) الخ یعنی جنہیں اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اس کے ساتھ ایمان رکھتے اور جب ان کو (یہ قرآن) پڑھ کر سنایا جاتا ہے تو کہتے ہیں۔ ہم اس پر بھی ایمان لائے اور اسے اپنے رب کی طرف سے حق جانا۔ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے۔ انہیں ان کے صبر کرنے اور برائی کے بدلے بھلائی کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی وجہ سے دوہرا اجر ملے گا۔

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (١/٣٩)]

بخاری و مسلم میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تین شخصوں کو دوہرا اجر ملے گا' ایک اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لائیں اور مجھ پر بھی ایمان رکھیں۔ دوسرا وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرے اور اپنے مالک کا بھی۔ تیسرا وہ شخص جو اپنی لونڈی کو اچھا ادب سکھائے پھر اسے آزاد کر کے اس سے نکاح کر لے۔ [1] امام جریر رحمہ اللہ کے اس فرق کی مناسبت اس سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ سورت کے شروع میں مومنوں اور کافروں کا بیان ہوا ہے تو جس طرح کفار کی دو قسمیں ہیں کافر اور منافق۔ اسی طرح مومنوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ عربی مومن اور کتابی مومن۔ میں کہتا ہوں ظاہراً یہ ہے کہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا یہ قول ٹھیک ہے کہ سورۂ بقرہ کی اول چار آیتیں مومنوں کے اوصاف کے بیان میں ہیں اور دو آیتیں اس کے بعد کی کافروں کے بارے میں ہیں اور ان کے بعد کی تیرہ آیتیں منافقوں سے متعلق ہیں پس یہ چاروں آیتیں ہر مومن کے حق میں عام ہیں۔ عربی ہو یا عجمی' کتابی ہو یا غیر کتابی' انسانوں میں سے ہو یا جنات میں سے۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک وصف دوسرے کو لازم اور شرط ہے ایک بغیر دوسرے کے نہیں ہو سکتا۔

غیب پر ایمان لانا' نماز قائم کرنا' اور زکوۃ دینا اس وقت تک صحیح نہیں جب تک کہ رسول اللہ ﷺ پر اور اگلے انبیاء علیہم السلام پر جو کتابیں اتری ہیں۔ ان پر ایمان نہ ہو اور ساتھ ہی آخرت کا یقین کامل نہ ہو جس طرح پہلی تین چیزیں بغیر پچھلی تین چیزوں کے غیر معتبر ہیں اسی طرح پچھلی تینوں بغیر پہلی تینوں کے صحیح نہیں۔ اسی لیے ایمان والوں کو حکم الٰہی ہے ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي أَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ﴾ (النساء/۱۳۶) الخ یعنی ایمان والو اللہ پر' اس کے رسول ﷺ پر اور جو کتاب اس پر اتری ہے اس پر اور جو کتابیں ان سے پہلے اتری ہیں ان پر ایمان لاؤ۔ اور فرمایا ﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ﴾ (العنکبوت/٤٦) الخ یعنی اہل کتاب سے جھگڑنے میں بہترین طریقہ برتو اور کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس پر جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو تمہاری طرف اتارا گیا ہے ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ ارشاد ہے اے اہل کتاب جو ہم نے اتارا ہے اس پر ایمان لاؤ وہ اس کو سچا کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ [2] اور جگہ فرمایا: اے اہل کتاب تم کسی چیز پر نہیں ہو جب تک توراۃ' انجیل اور جو کچھ تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے اتارا گیا ہے قائم نہ رکھو۔ [3] دوسری جگہ تمام ایمان والوں کی طرف سے خبر دیتے ہوئے قرآن پاک نے فرمایا ﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ﴾ (سورۃ بقرہ/۲۸۵) الخ یعنی ہمارے رسول ﷺ ایمان لائے اس پر جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا اور تمام ایمان والے بھی ہر ایک ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر' ہم رسولوں میں فرق اور جدائی نہیں کرتے۔ اسی طرح ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں میں سے کسی میں

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب العلم: باب تعلیم الرجل امته و اهله (۹۷) صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب وجوب الایمان برسالة بینا محمد ﷺ (۱۵٤)]

[2] [سورۃ النسآء: آیت ٧٤]

[3] [سورۃ المائدہ: آیت ٦٨]

[4] [سورۃ النسآء: آیت ۱۵۲]

تفریق نہیں کرتے۔ [4] اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن میں کل ایمان والوں کا اللہ تعالیٰ پر اس کے تمام رسولوں اور سب کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ اور بات ہے کہ اہل کتاب کے ایمان والوں کی ایک خاص خصوصیت ہے کیونکہ ان کا ایمان اپنے ہاں کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ہوتا ہے اور پھر جب حضور ﷺ کے ہاتھ پر وہ اسلام قبول کرتے ہیں تو قرآن کریم پر بھی تفصیل کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ اس لیے ان کو دوہرا اجر ملتا ہے اور اس امت کے لوگ بھی اگلی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں لیکن ان کا ایمان اجمالی طور پر ہوتا ہے۔ جیسے صحیح حدیث میں ہے کہ جب تم سے اہل کتاب کوئی بات کریں تو تم نہ اسے سچ کہو نہ جھوٹ بلکہ کہہ دیا کرو کہ ہم تو جو کچھ ہم پر اترا اسے بھی مانتے ہیں اور جو کچھ تم پر اترا اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ [1] بعض موقعہ پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ حضور ﷺ پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان بہ نسبت اہل کتاب کے زیادہ پورا، زیادہ کمال والا زیادہ راسخ اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے اس حیثیت سے ممکن ہے کہ انہیں اہل کتاب سے بھی زیادہ اجر ملے چاہے وہ اپنے پیغمبر اور پیغمبر آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کے سبب دوہرا اجر پائیں لیکن یہ لوگ کمال ایمان کے سبب اجر میں ان سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں ۝

ہدایت یافتہ اور کامیاب لوگ: یعنی وہ لوگ جن کے اوصاف پہلے بیان ہوئے مثلاً غیب پر ایمان لانا، نماز قائم رکھنا، اللہ کے دیئے ہوئے میں سے دینا۔ حضور ﷺ پر جو اترا اس پر ایمان لانا، آپ سے پہلے جو کتابیں اتریں ان کو ماننا، دار آخرت پر یقین رکھ کر وہاں کام آنے کے لیے نیک اعمال کرنا۔ برائیوں اور حرام کاریوں سے بچنا۔ یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں جنہیں اللہ کی طرف سے نور ملا، اور بیان و بصیرت حاصل ہوا اور انہی لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں فلاح و نجات ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ہدایت کی تفسیر ''نور'' اور ''استقامت'' سے کی ہے اور ''فلاح'' کی تفسیر اپنی چاہت کو پالینے اور برائیوں سے بچ جانے کی کی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے نور، دلیل، ثابت قدمی، سچائی اور توفیق میں حق پر ہیں اور یہی لوگ اپنے ان پاکیزہ اعمال کی وجہ سے نجات، ثواب اور دائمی جنت پانے کے مستحق ہیں اور عذاب سے محفوظ ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ دوسرے ﴿أُولَـٰئِكَ﴾ کا اشارہ اہل کتاب کی طرف ہے جن کی صفت اس سے پہلے بیان ہو چکی ہے جیسے پہلے گزر چکا۔ اس اعتبار سے ﴿وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ﴾ (البقرہ/ ٤) الخ پہلے کی آیت سے جدا ہوگا اور مبتدا بن کر مرفوع ہوگا اور اس کی خبر ﴿أُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ہوگی لیکن پسندیدہ قول یہی ہے کہ اس کا اشارہ پہلے کے سب اوصاف والوں کی طرف ہے اہل کتاب ہوں یا عرب ہوں۔ حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ﴿يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ سے مراد عرب ایمان دار ہیں اس کے بعد کے جملہ سے مراد اہل کتاب ایمان

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب التفسیر: باب قولوا امنا باللہ وما انزل الینا (٤٤٨٥)]

دار ہیں۔ پھر دونوں کے لیے یہ بشارت ہے کہ یہ لوگ ہدایت اور فلاح والے ہیں۔ اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ آیتیں عام ہیں اور یہ اشارہ بھی عام ہے واللہ اعلم۔ مجاہد' ابوالعالیہ' ربیع بن انس اور قتادہ رحمہم اللہ سے یہی مروی ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوا کہ حضور قرآن پاک کی بعض آیتیں تو ہمیں ڈھارس دیتی ہیں اور امید قائم کرا دیتی ہیں اور بعض آیتیں کمر توڑ دیتی ہیں اور قریب ہوتا ہے کہ ہم ناامید ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا لو میں تمہیں جنتی اور جہنمی کی پہچان صاف صاف بتا دوں۔ پھر آپ نے ﴿الٓمّٓ﴾ سے ﴿مُفْلِحُوْنَ﴾ تک پڑھ کر فرمایا یہ تو جنتی ہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے خوش ہو کر فرمایا' الحمدللہ ہمیں امید ہے کہ انہی میں سے ہوں۔" پھر ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ سے ﴿عَظِیْمٌ﴾ تک تلاوت کی اور فرمایا یہ جہنمی ہیں۔ انہوں نے کہا ہم ایسے نہیں آپ نے فرمایا ہاں۔ [1] (ابن ابی حاتم)

> اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

جن کافروں کو آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے وہ لوگ ایمان نہ لائیں گے ○

بدقسمت لوگ: یعنی جو لوگ حق کو پوشیدہ کرنے اور چھپا لینے کے عادی ہیں اور ان کی قسمت میں یہی ہے کہ انہیں نہ آپ کا ڈرانا سود مند ہے اور نہ ہی نہ ڈرانا۔ یہ کبھی اللہ تعالیٰ کی اس وحی کی تصدیق نہیں کریں گے جو آپ پر نازل ہوئی ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰى یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ﴾ (یونس/۹۶) یعنی جن لوگوں پر اللہ کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے اگرچہ تمام آیتیں دیکھ لیں یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھیں۔ ایسے ہی سرکش اہل کتاب کی نسبت فرمایا ﴿وَلَئِنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ﴾ (البقرہ/۱۴۵) الخ یعنی ان اہل کتاب کے پاس اگرچہ تمام دلائل لے آؤ تاہم وہ تمہارے قبلہ کو نہیں مانیں گے۔ یعنی ان بدنصیبوں کو سعادت حاصل ہی نہیں ہو گی۔ ان گمراہوں کو ہدایت کہاں؟ تو اے نبی ان پر افسوس نہ کر' تیرا کام صرف رسالت کا حق ادا کر دینا اور پہنچا دینا ہے۔ ماننے والے نصیب ور ہیں وہ مالا مال ہو جائیں گے اور اگر کوئی نہ مانے تو نہ سہی۔ تیرا فرض ادا ہو گیا ہم خود ان سے حساب لے لیں گے۔ تو صرف ڈرا دینے والا ہے۔ ہر چیز پر اللہ تعالیٰ ہی وکیل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کو اس بات کی بڑی ہی حرص تھی کہ تمام لوگ ایمان دار ہو جائیں اور ہدایت قبول کر لیں لیکن پروردگار نے فرمایا کہ یہ سعادت ہر ایک کے حصہ نہیں۔ یہ نعمت بٹ چکی ہے جس کے حصے میں آئی ہے وہ آپ کی مانے گا اور جو بدقسمت ہیں وہ ہرگز ہرگز اطاعت کی طرف نہ جھکیں گے۔ [2] پس مطلب یہ ہے کہ جو قرآن کو تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم اگلی کتابوں کو مانتے ہیں انہیں ڈرانے

---

① [**ضعیف**: تفسیر ابن ابی حاتم (۸۶)، (۱/۴۰)] اس کی سند میں ابن لھیعہ راوی ضعیف ہے اور عثمان بن صالح مصری کے متعلق امام ذہبیؒ نے امام ابوحاتمؒ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ یہ کذاب ہے۔]

② [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۲۵۳) بیہقی فی الاسماء والصفات (۱۶۴) طبرانی (۱۲/۱۳۰۲۵)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو انقطاع کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔]

کا فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ وہ تو خود اپنی کتاب کو بھی حقیقتاً نہیں مانتے کیونکہ اس میں تیرے ماننے کا عہد موجود ہے تو جب وہ اس کتاب کو اور اس نبی ﷺ کی نصیحت کو نہیں مانتے جس کے ماننے کا اقرار کر چکے تو بھلا وہ اے نبی! تمہاری باتوں کو کیا مانیں گے؟ ابوالعالیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت جنگ احزاب کے ان سرداروں کے بارے میں اتری ہے جن کی نسبت فرمان باری ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا﴾ (ابراهیم/۲۸) الخ لیکن جو معنی ہم نے پہلے بیان کیے ہیں وہ زیادہ واضح ہیں اور دوسری آیتوں کے مطابق ہیں۔ واللہ اعلم۔ اس حدیث پر جو ابن ابی حاتم کے حوالے سے ابھی بیان ہوئی ہے دوبارہ نظر ڈال جائیے ﴿لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ پہلے جملہ کی تاکید ہے یعنی ڈرانا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں، دونوں حالتوں میں ان کا کفر نہ ٹوٹے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ﴿لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ خبر ہو اس لیے کہ تقدیر کلام ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ ہے اور ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ﴾ جملہ معترضہ ہو جائے گا۔ واللہ اعلم۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ۧ﴿۷﴾

ع

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان ہی کے لیے بڑا عذاب ہے ○

جن کے دلوں پر مہر لگا دی گئی: حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں 'ختم' سے مراد 'طبع' ہے یعنی مہر لگا دی [1] حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں یعنی ان پر شیطان غالب آ گیا وہ اسی کے ماتحتی میں لگ گئے یہاں تک کہ مہر الٰہی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر لگ گئی اور آنکھوں پر پردہ پڑ گیا، ہدایت کو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں۔ [2]

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گناہ لوگوں کے دلوں میں بستے جاتے ہیں اور انہیں ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ بس یہی طبع اور ختم یعنی مہر ہے۔ [3] دل اور کان کے لیے محاورہ میں مہر آتی ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں قرآن میں ﴿رَانَ﴾ کا لفظ ہے، ﴿طَبَعَ﴾ کا لفظ ہے اور ﴿اَقْفَالُ﴾ کا لفظ ہے۔ رَانَ، طَبَعَ سے کم ہے اور طبع اقفال سے کم ہے، اقفال سب سے زیادہ ہے۔ [4]

حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا کہ دل ہتھیلی کی طرح ہے اور بندہ کے گناہ کی وجہ سے وہ سمٹ جاتا ہے اور بند ہو جاتا ہے اس طرح کہ ایک گناہ کیا تو گویا چھنگلیا بند ہو گئی پھر دوسرا گناہ کیا دوسری انگلی بند ہو گئی یہاں تک کہ تمام انگلیاں بند ہو گئیں اور اب مٹھی بالکل بند ہو گئی جس میں کوئی چیز داخل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح گناہوں سے دل پر پردے پڑ جاتے ہیں مہر لگ جاتی ہے پھر اس پر کسی طرح حق اثر نہیں کرتا۔ اسے رین بھی کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ تکبر کی وجہ ان کا حق سے منہ پھیر لینا بیان کیا جا رہا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اس بات کے

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ٤٤)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔]

[2] [ایضا] [3] [ایضا] [4] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۲۵۹)]

سننے سے بہرا بن گیا۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ تکبر اور بے پرواہی کر کے اس نے اس بات کی طرف دھیان نہیں دیا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ مطلب ٹھیک نہیں ہو سکتا اس لیے کہ یہاں تو خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔

زمخشری رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی ہے۔ اور پانچ تاویلیں کی ہیں لیکن سب کی سب بالکل بے معنی اور فضول ہیں اور صرف اپنے معتزلی ہونے کی وجہ سے اسے یہ تکلّفات کرنے پڑے ہیں کیونکہ اس کے نزدیک یہ بات بہت بری ہے کہ کسی کے دل پر اللہ قدوس مہر لگا دے لیکن افسوس اس نے دوسری صاف اور صریح آیات پر غور نہیں کیا۔ ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾ (الصف/ ٥) یعنی جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے اور فرمایا ﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ﴾ (الانعام/ ١١٠) الخ ہم ان کے دلوں کو اور ان کی نگاہوں کو الٹ دیتے ہیں گویا کہ وہ سرے سے ایمان ہی نہ لائے تھے اور ہم انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکتے ہوئے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس قسم کی اور آیتیں بھی ہیں۔ جو صاف بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور ہدایت کو ان سے دور کر دیا ہے۔ ان کے حق کو ترک کرنے اور باطل پر جم رہنے کی وجہ سے جو یہ سراسر عدل وانصاف ہے اور عدل اچھی چیز ہے نہ کہ بری۔ اگر زمخشری رحمہ اللہ بھی بغور ان آیات پر نظر ڈالتے تو تاویل نہ کرتے۔ واللہ اعلم۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ امت کا اجماع ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی ایک صفت مہر لگانا بھی بیان کی ہے جو کفار کے کفر کے بدلے ہے۔ فرمایا ہے ﴿بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ (النساء/ ١٥٥) بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر مہر لگا دی۔ [1] حدیث میں بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے۔ دعا میں ہے ﴿يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قُلُوبَنَا عَلَى دِينِكَ﴾ یعنی اے دلوں کے پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم رکھ۔ [2]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دلوں پر فتنے اس طرح پیش ہوتے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے بورے کا ایک ایک تنکا جو دل انہیں قبول کر لیتا ہے اس میں ایک سیاہ نکتہ ہو جاتا ہے اور جس دل میں یہ فتنے اثر نہیں کرتے' اس میں ایک سفید نکتہ ہو جاتا ہے جس کی سفیدی بڑھتے بڑھتے بالکل صاف سفید ہو کر سارے دل کو منور کر دیتی ہے۔ پھر اسے کبھی کوئی فتنہ نقصان نہیں پہنچا سکتا اسی طرح دوسرے دل کی سیاہی (جو حق قبول نہیں کرتا) پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ سارا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اب وہ الٹے کوزے کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ

---

[1] [تفسیر قرطبی (١/ ١٨٧)]

[2] [صحیح : ابن ماجه : مقدمه : باب فيما انكرت الجهمية (١٩٩) مسند احمد (٤/ ١٨٢) النسائی فی السنن الكبرى (٤/ ٤١٤) ابن ابی عاصم فی السنة (٢١٩) ابن حبان (الموارد۔ ٩٤٣) مستدرك حاكم (١/ ٥٢٥)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [السلسلة الصحيحه (٢٠٩١)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اس کی سند کو صحیح کہتے ہیں۔]

[3] [صحیح : صحيح بخارى : كتاب الرقاق : باب رفع الامانة (٦٤٩٧) صحيح مسلم : كتاب الايمان : باب رفع الامانة والايمان من بعض القلوب (١٤٤)]

اچھی بات اسے اچھی لگتی ہے نہ برائی بری معلوم ہوتی ہے الخ۔[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ کا فیصلہ وہی ہے جو حدیث میں آ چکا ہے کہ مومن جب گناہ کرتا ہے اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ ہو جاتا ہے اگر وہ باز آ جائے توبہ کر لے اور رک جائے تو وہ نکتہ مٹ جاتا ہے اور اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر وہ گناہ میں بڑھ جائے تو وہ سیاہی بھی پھیلتی جاتی ہے یہاں تک کہ سارے دل پر چھا جاتی ہے، یہی وہ رَانَ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (المطففین / ١٤) یعنی یقیناً ان کے دلوں پر رَانَ ہے، اس کی بد اعمالیوں کی وجہ سے[1] (ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے تو معلوم ہوا کہ گناہوں کی زیادتی دلوں پر غلاف ڈال دیتی ہے اور اس کے بعد مہر الٰہی لگ جاتی ہے جسے 'ختم' اور 'طبع' کہا جاتا ہے۔ اب اس دل میں ایمان کے جانے اور کفر کے نکلنے کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی۔

اسی مہر کا ذکر اس آیت ختم اللہ الخ میں ہے، وہ ہماری آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کہ جب کسی چیز کا منہ بند کر کے اس پر مہر لگا دی جائے تو جب تک وہ مہر نہ ٹوٹے نہ اس میں کچھ جا سکتا ہے نہ اس سے کوئی چیز نکل سکتی ہے۔ اسی طرح جن کفار کے دلوں اور کانوں پر مہر الٰہی لگ چکی ہے ان میں بھی بغیر اس کے ہٹے اور ٹوٹے نہ ہدایت آئے، نہ کفر جائے، ﴿سَمْعِهِمْ﴾ پر پورا وقف ہے اور ﴿عَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ الگ پورا جملہ ہے۔ ختم اور طبع دلوں اور کانوں پر ہوتی ہے اور غشـــاوــۃ یعنی پردہ آنکھوں پر پڑتا ہے۔ جیسے کہ حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔[2] قرآن میں ہے ﴿فَإِنْ يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَى قَلْبِكَ﴾ (شوری / ٢٤) اور جگہ ہے ﴿وَخَتَمَ عَلَى سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَى بَصَرِهِ غِشَاوَةً﴾ (الجاثیۃ / ٢٣) ان آیتوں میں دل اور کان پر ختم کا ذکر ہے اور آنکھ پر پردے کا بعض نے یہاں ﴿غِشَاوَةً﴾ زبر کے ساتھ بھی پڑھا ہے تو ممکن ہے کہ ان کے نزدیک فعل ﴿جَعَلَ﴾ مقصود ہو اور ممکن ہے کہ نصب محل کی اتباع سے ہو جیسے ﴿وَحُورٌ عِينٌ﴾[3] میں۔ شروع سورت کی چار آیتوں میں مومنین کے اوصاف بیان ہوئے پھر ان دو آیتوں میں کفار کا حال بیان ہوا۔ اب منافقوں کا ذکر ہوتا ہے جو بظاہر ایماندار بنتے ہیں لیکن حقیقت میں کافر ہیں چونکہ ان لوگوں کی چالاکیاں عموماً پوشیدہ رہ جاتی ہیں۔ اس لیے ان کا بیان ذرا تفصیل سے کیا گیا اور بہت کچھ ان کی نشانیاں بیان کی گئیں انہی کے بارے میں سورۂ برات اتری اور انہی کا ذکر سورۂ نور وغیرہ

---

[1] [حسن : ترمذی : کتاب تفسیر القرآن : باب و من سورۃ ویل المطففین (٣٣٣٤) ابن ماجہ : کتاب الزھد : باب ذکر الذنوب (٤٢٤٤) حاکم (٥١٧/٢) طبری (٣٠٤) ابن حبان (٩٣٠) نسائی فی الیوم واللیلۃ (٤١٨) وفی الکبری (١١٦٥٨)] امام ترمذیؒ نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ امام حاکمؒ نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ شیخ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحیح الترغیب (٣١٤١)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس بھی اسے حسن کہتے ہیں۔]

[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (٢٦٦/١)]

[3] [سورۃ الواقعہ : آیت ٢٢]

میں بھی کیا گیا تا کہ ان سے پورا بچاؤ ہو اور ان کی مذموم خصلتوں سے مسلمان دور رہیں۔ پس فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

بعض لوگ کہتے تو ہیں کہ ہم اللہ تعالی پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ایماندار نہیں ہوتے ○ وہ اللہ تعالی کو اور ایمان والوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں لیکن دراصل خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں مگر سمجھتے نہیں ○

نفاق کی حقیقت: دراصل نفاق کہتے ہیں بھلائی ظاہر کرنے اور برائی کے پوشیدہ رکھنے کو۔ نفاق کی دو قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی۔ پہلی قسم کے منافق تو ابدی جہنمی ہیں اور دوسری قسم کے بدترین مجرم ہیں۔ اس کا بیان تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ کسی مناسب جگہ ہوگا۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں ”منافق کا قول اس کے فعل کے خلاف' اس کا باطن ظاہر کے خلاف اس کا آنا جانے کے خلاف اور اس کی موجودگی عدم موجودگی کے خلاف ہوا کرتی ہے۔“ [1] نفاق مکہ شریف میں تو تھا ہی نہیں بلکہ اس کے الٹ تھا یعنی بعض لوگ ایسے تھے جو زبردستی سے بہ ظاہر کافروں کا ساتھ دیتے تھے مگر دل میں مسلمان ہوتے تھے۔ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے اور وہاں پر اوس اور خزرج کے قبائل نے انصار بن کر آپ کا ساتھ دیا اور جاہلیت کے زمانہ کی مشرکانہ بت پرستی ترک کر دی اور دونوں قبیلوں میں سے خوش نصیب لوگ مشرف بہ اسلام ہو گئے لیکن یہودی اب تک اللہ تعالی کی اس نعمت سے محروم تھے۔ ان میں سے صرف حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے اس سچے دین کو قبول کیا تب تک بھی منافقوں کا خبیث گروہ قائم نہ ہوا تھا اور حضور ﷺ نے ان یہودیوں اور عرب کے بعض قبائل سے صلح کر لی تھی۔

غرض اس جماعت کے قیام کی ابتداء یوں ہوئی کہ مدینہ شریف کے یہودیوں کے تین قبیلے تھے' بنوقینقاع' بنو نضیر اور بنوقریظہ' بنوقینقاع تو خزرج کے حلیف اور بھائی بند بنے ہوئے تھے باقی دو کا بھائی چارہ اوس سے تھا۔ جب جنگ بدر ہوئی اور اس میں پروردگار نے اپنے دین والوں کو غالب کیا۔ شوکت وشان اسلام ظاہر ہوئی' مسلمانوں کا سکہ جم گیا اور کفر کا زور ٹوٹ گیا تب یہ ناپاک گروہ قائم ہوا چنانچہ عبداللہ بن ابی بن سلول تھا تو خزرج کے قبیلے سے لیکن اوس اور خزرج دونوں اسے اپنا بڑا مانتے تھے بلکہ اس کی باقاعدہ سرداری اور بادشاہت کے اعلان کا پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ ان دونوں قبیلوں کا رخ اسلام کی طرف پھر گیا اور اس کی سرداری یونہی رہ گئی۔ [2] یہ خار تو اس کے دل میں تھا ہی' اسلام کی روزافزوں ترقی میں لڑائی اور کامیابی نے اسے مخبوط الحواس بنا دیا۔ اب اس نے دیکھا کہ یوں کام نہیں چلے گا اس نے بظاہر اسلام قبول کر لینے اور باطن میں کافر رہنے کی ٹھانی اور جس قدر جماعت اس کے زیر اثر تھی سب کو یہی ہدایت کی' اس طرح منافقین کی ایک جمعیت مدینہ میں اور مدینہ کے آس پاس قائم ہو گئی۔ ان

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۲۷۰)]

[2] [**صحیح**: بخاری: کتاب التفسیر: باب ولتسمعن من الذین (٤٥٦٦) صحیح مسلم: کتاب الجهاد: باب فی دعاء النبی ﷺ (۱۷۹۸)]

منافقین میں بحمد اللہ کوئی مہاجر ایک بھی نہ تھا بلکہ یہ بزرگ تو اپنے اہل وعیال، مال ومتاع کو نام حق پر قربان کر کے اللہ کے رسول ﷺ کا ساتھ دے کر آئے تھے۔ ﴿فَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں "یہ منافق اوس اور خزرج کے قبیلوں میں سے تھے اور یہودی بھی جوان کے طریقے پر تھے۔ [1] قبیلہ اوس اور خزرج کے نفاق کا ان آیتوں میں بیان ہے۔" ابوالعالیہ، حضرت حسن، قتادہ، سدی رحمہم اللہ نے یہی بیان کیا ہے۔

پروردگار عالم نے منافقوں کی بہت سی بدخصلتوں کا یہاں بیان فرمایا۔ تا کہ ان کے ظاہر حال سے مسلمان دھوکہ میں نہ آ جائیں اور انہیں مسلمان خیال کر کے اپنا نہ سمجھ بیٹھیں۔ جس کی وجہ سے کوئی بڑا فساد پھیل جائے۔ یہ یاد رہے کہ بدکاروں کو نیک سمجھنا بھی بجائے خود بہت برا اور نہایت خوفناک امر ہے جس طرح اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ زبانی اقرار تو ضرور کرتے ہیں مگر ان کے دل میں ایمان نہیں ہوتا اسی طرح سورۂ منافقوں میں بھی کہا گیا ہے کہ ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (منافقون / ۱) الخ یعنی منافق تیرے پاس آ کر کہتے ہیں کہ ہماری گواہی ہے کہ آپ رسول اللہ ہیں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے لیکن چونکہ حقیقت میں منافقوں کا قول ان کے عقیدے کے مطابق نہ تھا اس لیے ان لوگوں کے شاندار اور تاکیدی الفاظ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں جھٹلا دیا۔ اور سورۂ منافقوں میں فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (منافقون / ۱) یعنی اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ بالیقین منافق جھوٹے ہیں۔

اور یہاں بھی فرمایا ﴿وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ یعنی دراصل وہ ایماندار نہیں وہ اپنے ایمان کو ظاہر کر کے اور اپنے کفر کو چھپا کر اپنی جہالت سے اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اسے نفع دینے والی اور اللہ کے ہاں چل جانے والی کاریگری خیال کرتے ہیں۔ جیسے کہ بعض مومنوں پر ان کا یہ مکر چل جاتا ہے۔ قرآن میں اور جگہ ہے ﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ﴾ (المجادلہ / ۱۸) الخ یعنی قیامت کے دن جبکہ اللہ تعالیٰ ان سب کو کھڑا کرے گا تو جس طرح وہ یہاں ایمان والوں کے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے اور سمجھتے ہیں کہ وہ بھی کچھ ہیں۔ خبردار یقیناً وہ جھوٹے ہیں۔ یہاں بھی ان کے اس غلط عقیدے کی وضاحت میں فرمایا کہ دراصل وہ اپنے اس کام کی برائی کو جانتے ہی نہیں۔ یہ دھوکہ خود اپنی جانوں کو دے رہے ہیں۔ جیسے کہ اور جگہ ارشاد ہوا ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ﴾ (النساء ۱۴۲) یعنی منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وہ انہیں کو دھوکہ میں رکھنے والا ہے۔ بعض قاریوں نے "يَخْدَعُوْنَ" پڑھا ہے اور بعض "يُخَادِعُوْنَ" مگر دونوں قراتوں کے معنی کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔ ابن جریر نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو منافق دھوکہ کیسے دیں گے؟ وہ جو اپنے دل کے خلاف اظہار کرتے ہیں وہ تو صرف بچاؤ کے لیے ہوتا ہے تو جواباً کہا جائے گا کہ اس طرح کی بات کرنے والے کو بھی جو کسی خطرہ سے بچنا چاہتا ہے۔ عربی زبان میں "مُخَادِع" کہا جاتا ہے چونکہ منافق بھی قتل، قید اور دنیاوی عذابوں سے محفوظ رہنے کے لیے یہ چال چلتے تھے اور

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۲۶۹)]

اپنے باطن کے خلاف اظہار کرتے تھے اس لیے انہیں دھوکہ باز کہا گیا۔

ان کا یہ فعل چاہے کسی کو دنیا میں دھوکا دے بھی دے لیکن درحقیقت وہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اسی میں اپنی بھلائی اور کامیابی جانتے ہیں اور دراصل یہ سب ان کے لیے انتہائی برا عذاب اور غضب الٰہی ہوگا جس کے سہنے کی ان میں طاقت نہیں ہوگی پس یہ دھوکہ حقیقتاً ان پر خود وبال ہوگا۔ وہ جس کام کے انجام کو اچھا جانتے ہیں وہ ان کے حق میں برا اور بہت برا ہوگا۔ ان کے کفر' شک اور تکذیب کی وجہ سے انکا رب ان سے ناراض ہوگا لیکن افسوس انہیں اس کا شعور ہی نہیں اور یہ اپنے اندھے پن میں ہی مست ہیں۔ ابن جریج رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ﴿لا الٰــہ الا اللّٰہ﴾ کا اظہار کر کے وہ اپنی جان اور مال کا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں' یہ کلمہ ان کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتا۔ [1] حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں منافقوں کی یہی حالت ہے کہ زبان پر کچھ' دل میں کچھ' عمل کچھ' عقیدہ کچھ' صبح کچھ اور شام کچھ' کشتی کی طرح جو ہوا کے جھونکے سے کبھی ادھر ہو جاتی ہے کبھی ادھر۔ [2]

فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ۝

ان کے دلوں میں بیماری تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں بیماری میں بڑھا دیا اور ان کے جھوٹ کی وجہ سے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔○

بیمار دلوں کا حال: بیماری سے مراد یہاں شک وشبہ ہے۔ [3] حضرت ابن عباس حضرت ابن مسعود اور چند صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔ حضرت مجاہد عکرمہ' حسن بصری' ابوالعالیہ' ربیع بن انس' قتادہ رحمۃ اللہ علیہم کا بھی یہی قول ہے۔ [4] حضرت عکرمہ رحمہ اللہ اور طاؤس نے اس کی تفسیر ریا سے کی ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر نفاق بھی مروی ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہاں دینی بیماری مراد ہے نہ کہ جسمانی۔ انہیں اسلام میں شک کی بیماری تھی اور ان کی ناپاکی میں اللہ تعالیٰ نے اور اضافہ کر دیا۔ [5] جیسے قرآن میں اس کا ذکر ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْھُمْ اِیْمَانًا وَّھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ○ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْھُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِہِمْ﴾ (التوبۃ/ ۱۲۴۔۱۲۵) یعنی ایمان والوں کے ایمان کو تقویت پہنچاتی اور وہ خوشیاں مناتے ہیں لیکن بیماری والوں کی ناپاکی اور پلیدی کو اور زیادہ کر دیتی ہے یعنی ان کی بدی اور گمراہی بڑھ جاتی ہے' یہ بدلہ بالکل ان کے عمل کے مشابہ ہے۔ یہ تفسیر ہی درست ہے' ٹھیک اسی کے مثل یہ فرمان بھی ہے ﴿وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی وَّآتَاھُمْ تَقْوٰھُمْ﴾ (محمد/ ۱۷) یعنی ہدایت والوں کو ہدایت میں بڑھا دیتا ہے اور ان کو تقویٰ عطا فرماتا ہے ﴿یَکْذِبُوْنَ﴾ کو ''یُکَذِّبُوْنَ'' بھی قاریوں نے پڑھا ہے یہ دونوں خصلتیں ان میں تھیں جھٹلاتے بھی تھے اور جھوٹے بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض منافقوں کو اچھی

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۴۶)]

[2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۴۷)]

[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۲۸۰)]

[4] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۴۸)]

[5] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۲۸۰)]

طرح جاننے کے باوجود بھی قتل نہ کرنے کی وجہ وہی ہے جو بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ لوگوں میں یہ چرچے ہوں کہ محمد رسول اللہ (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں'[1] مطلب یہ ہے کہ جو اعرابی آس پاس ہیں انہیں یہ تو معلوم نہ ہوگا کہ ان منافقوں کے پوشیدہ کفر کی بنا پر انہیں قتل کیا گیا ہے ان کی نظریں تو صرف ظاہر داری پر ہوں گی جب ان میں یہ بات مشہور ہو جائے گی کہ حضور (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں تو خوف ہے کہ کہیں وہ اسلام کے قبول کرنے سے رک نہ جائیں۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہمارے علماء وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ ٹھیک اسی طرح آنحضرت ﷺ **مولفۃ القلوب** کو جن کے دل اسلام کی جانب مائل کیے جاتے تھے۔ مال عطا فرمایا کرتے تھے حالانکہ آپ ﷺ جانتے تھے کہ ان کے اعتقاد بد ہیں۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ بھی منافقوں کو قتل نہ کرنے کی یہی وجہ بیان فرماتے ہیں جیسے محمد بن جہم' قاضی اسماعیل اور ابہری رحمہم اللہ نے نقل کیا ہے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے بقول ابن ماجشون رحمہ اللہ ایک وجہ یہ بھی نقل کی گئی ہے کہ یہ اس لیے تھا کہ آپ کی امت کو معلوم ہو جائے کہ حاکم صرف اپنے علم کی بناء پر فیصلہ نہیں کرسکتا۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء کو تمام مسائل میں اختلاف ہو لیکن اس مسئلہ میں سب کا اتفاق ہے کہ قاضی صرف اپنی ذاتی معلومات کی بنا پر کسی کو قتل نہیں کرسکتا۔ حضرت امام شافعی رحمہ اللہ نے ایک اور وجہ بھی بیان کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کا منافقین کو قتل کرنے سے رکنے کا سبب ان کا اپنی زبان سے اسلام کو ظاہر کرنا تھا کہ آپ ﷺ کو اس کا علم تھا کہ ان کے دل اس کے الٹ ہے لیکن ظاہری کلمہ اس پہلی بات کی تردید کرتا تھا جس کی تائید میں بخاری و مسلم وغیرہ کی یہ حدیث بھی پیش کی جاسکتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ﴿ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ کہیں جب وہ اسے کہہ دیں تو وہ مجھ سے اپنی جان اور مال کی امان پالیں گے اور ان کا حساب اللہ عزوجل پر ہے[2]۔ مطلب یہ ہے کہ اس کلمہ شریف کے کہتے ہی ظاہری احکام اسلام ان پر جاری ہو جائیں گے۔ اب اگر ان کا عقیدہ بھی اس کے مطابق ہے تو آخرت والے دن نجات کا سبب ہوگا ورنہ وہاں کچھ بھی نفع نہ ہوگا لیکن دنیا میں تو مسلمانوں کے احکام ان پر جاری رہیں گے گو یہ لوگ یہاں مسلمانوں کی صفوں میں اور ان کی فہرست میں نظر آئیں گے لیکن آخرت میں عین پل صراط پر ان سے دور کر دیئے جائیں گے اور اندھیروں میں حیران و پریشان ہوتے ہوئے بآواز بلند مسلمانوں کو پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ لیکن انہیں جواب ملے گا کہ تھے تو سہی مگر تم فتنوں میں پڑ گئے اور انتظار میں ہی رہ گئے اور اپنی من مانی

---

1. [صحیح : صحیح بخاری : کتاب المناقب : باب ما ینھی من دعوی الجاھلیة (٣٥١٨) صحیح مسلم : کتاب البر والصلة : باب نصر الاخ ظالما او مظلوما (٢٥٨٤)]
2. [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الایمان : باب فان تابوا واقاموا الصلوة واتوالزکوة فخلو سبیلھم (٢٥) صحیح مسلم : کتاب الایمان : باب الامر بقتال الناس حتی یقولوا لااله الا الله (٢١۔٢٢) ترمذی : کتاب الایمان : باب ما جآء امرت ان اقاتل الناس (٢٦٠٦) ابو داؤد : کتاب الجھاد : باب کل ما یقاتل المشرکون (٢٦٤٠) ابن ماجه (٣٩٢٧) نسائی (٣٩٨٦)]
3. [سورة الحدید : آیت ١٤]

خواہشوں کے چکر میں پڑ گئے یہاں تک کہ حکم الٰہی آ پہنچا۔ ③

غرض دار آخرت میں بھی مسلمانوں کے پیچھے پڑے لپٹے رہیں گے لیکن بالآخران سے الگ کر دیئے جائیں گے اوران کی امیدوں پر پانی پھر جائے گا وہ چاہیں گے کہ مسلمانوں کے ساتھ سجدے میں گر پڑیں لیکن سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ جیسے کہ احادیث میں مفصل بیان آ چکا ہے۔ ① بعض محققین نے کہا ہے کہ ان کے قتل نہ کیے جانے کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ کی موجودگی میں ان کی شرارتیں چل نہیں سکتی تھیں۔ مسلمانوں کو باری تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعہ ان کی برائیوں سے محفوظ کر لیتا تھا لیکن حضور ﷺ کے بعد اگر اللہ نہ کرے ایسے لوگ ہوں کہ ان کا نفاق کھل جائے اور مسلمان بخوبی معلوم کر لیں تو وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ نفاق حضور ﷺ کے زمانہ میں تھا لیکن آج کل وہ بے دینی اور زندیقیت ہے یہ بھی یاد رہے کہ زندیق کے بارے میں بھی علماء کا اختلاف ہے کہ جب وہ کفر ہی پر مرے تو اس کے قتل سے پہلے توبہ پیش کی جائے یا نہیں؟ اور وہ زندیق جو لوگوں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہو اور وہ زندیق جو معلم نہ ہو ان دونوں میں فرق کیا جائے گا یا نہیں؟ اور یہ ارتداد کئی کئی مرتبہ ہو اتب یہ حکم ہے یا صرف ایک مرتبہ ہونے پر ہی؟ پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ اسلام لانا اور رجوع کرنا خود اس کی اپنی طرف سے ہو یا اس پر غلبہ پالینے کے بعد بھی یہی حکم ہے؟ غرض ان باتوں میں اختلاف ہے لیکن اس کے بیان کی جگہ احکام کی کتابیں ہیں نہ کہ تفسیریں۔

چودہ شخصوں کے نفاق کا تو آپ کو قطعی علم تھا' یہ وہ بد باطن لوگ تھے جنہوں نے غزوۂ تبوک میں مشورہ کر کے یہ امر طے کر لیا تھا کہ حضور ﷺ کے ساتھ دغا بازی کریں اور آپ کے قتل کی پوری سازش کر چکے تھے طے ہوا تھا کہ رات کے اندھیرے میں جب حضور ﷺ فلاں گھاٹی کے قریب پہنچیں تو آپ کی اونٹنی کو بدکا دیں اور بھڑک کر بھاگے گی تو حضور ﷺ گھاٹی میں گر پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی طرف اسی وقت وحی بھیج کر ان کی اس ناپاک سازش کا علم عطا کر دیا۔ حضور ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر اس واقعہ کی خبر دی اور ان غداروں کے نام بھی بتلا دیئے پھر بھی آپ نے ان کے قتل کے احکام صادر نہ فرمائے۔ ② ان کے سوا اور منافقوں کے ناموں کا آپ کو علم نہ تھا۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے ﴿وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ﴾ (التوبة/۱۰۱) الخ یعنی تمہارے آس پاس کے بعض اعرابی منافق ہیں اور بعض سرکش منافق مدینہ میں بھی ہیں تم انہیں نہیں جانتے لیکن ہم جانتے ہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا ﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُونَ﴾ ③ الخ اگر چہ منافق گندے دل والے اور فساد و تکبر والے اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ہم بھی انہیں نہ چھوڑیں گے اور مدینہ میں بہت کم باقی رہ سکیں گے بلکہ ان پر لعنت کی

---

① [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الاذان: باب فضل السجود (۸۰٦) و کتاب التوحید: باب قول الله تعالی ﴿وجوه یومئذ ناضرة﴾ (۷٤۳۹) صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب مغفرة طریق الرویة (۱۸۲)]

② [صحیح: مسلم: کتاب صفات المنافقین: باب صفات المنافقین واحکامهم (۲۷۷۹)]

③ [سورہ الاحزاب: آیت ٦۰-٦۱]

جائے گی جہاں پائے جائیں گے' پکڑے جائیں گے اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں گے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو ان منافقوں کا علم نہ تھا کہ کون کون ہے؟ ہاں ان کی مذموم خصلتیں جو بیان ہوئی تھیں یہ جس میں پائی جاتی تھیں اس پر نفاق صادق آتا تھا۔ جیسے اور جگہ ارشاد فرمایا ﴿وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ﴾ (محمد / ۳۰) الخ یعنی اگر ہم چاہیں تو ہم تمہیں ان کو دکھا دیں لیکن تم ان کی نشانیوں اور ان کی دبی بچی زبان سے ہی انہیں پہچان لو گے ان منافقون میں سب سے زیادہ مشہور عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کی منافقانہ خصلتوں پر حضور ﷺ کے سامنے گواہی بھی دی تھی [۱] باوجود اس کے جب وہ مرگیا تو حضور ﷺ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھائی اور اس کے دفن میں شرکت کی [۲]۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اور مسلمان صحابیوں کے ساتھ بلکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب حضور ﷺ کو ذرا زور سے یاد دلایا تو آپ نے فرمایا میں نہیں چاہتا کہ لوگ چہ میگوئیاں کریں کہ محمد (ﷺ) اپنے صحابیوں کو مار ڈالا کرتے ہیں [۳] اور ایک صحیح روایت میں ہے استغفار کرنے یا نہ کرنے کا مجھے اختیار دیا گیا۔ تو میں نے استغفار کو پسند کیا۔ [۴] ایک اور روایت میں ہے "اگر ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے میں بھی اس کی بخشش جانتا تو یقیناً اس سے زیادہ مرتبہ استغفار کرتا۔" [۵]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ○ خبردار رہو یقیناً یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں لیکن شعور سمجھ نہیں ○

فسادی کون ہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباس حضرت عبداللہ بن مسعود اور نبی ﷺ کے بعض اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ یہ بیان بھی منافقوں سے ہی متعلق ہے ان کا فساد کفر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی تھی [۶] مطلب یہ ہے کہ زمین میں اللہ کی نافرمانی کرنا یا نافرمانی کا حکم دینا زمین میں فساد کرنا ہے اور زمین و آسمان میں اصلاح سے مراد اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے [۷] حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہیں جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے روکا جاتا ہے تو کہتے

---

۱ [صحیح : صحیح بخاری : کتاب التفسیر : سورة المنافقون (۴۹۰۰) صحیح مسلم : کتاب صفات المنافقين : باب صفات المنافقين واحكامهم (۲۷۷۲)]

۲ [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الجنائز : باب الكفن في القميص الذي يكف او لا يكف (۱۲۶۹) صحيح مسلم : کتاب صفات المنافقين : باب صفات المنافقين واحكامهم (۲۷۷۳)]

۳ [صحیح : صحیح بخاری : کتاب المناقب : باب ما ينهىٰ من دعوى الجاهلية (۳۵۱۸) صحیح مسلم : کتاب البر وا الصلة : باب نصر الاخ ظالما اور مظلوما (۲۵۸۴)]

۴ [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الجنائز : باب ما يكره من الصلوة على المنافقين (۱۳۶۶)]

۵ [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الجنائز : باب ما يكره من الصلوة على المنافقين (۱۳۶۶)]

۶ [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۲۸۸)] ۷ [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۵۰)]

ہیں کہ ہم تو ہدایت واصلاح پر ہیں۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس خصلت کے لوگ اب تک نہیں آئے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ بدخصلت لوگ تھے تو سہی لیکن اب جو آئیں گے وہ ان سے بھی بدتر ہوں گے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس وصف کا کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھا ہی نہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان منافقوں کا فساد برپا کرنا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرتے تھے جس کام سے اللہ تعالیٰ منع فرماتا تھا' اسے کرتے تھے۔ فرائض ربانی ضائع کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے سچے دین میں شک وشبہ کرتے تھے۔ اس کی حقیقت اور صداقت پر یقین کامل نہیں رکھتے تھے۔ مومنوں کے پاس آ کر اپنی ایمانداری کی ڈینگیں مارتے تھے حالانکہ دل میں طرح طرح کے وسوسے ہوتے تھے موقع پا کر اللہ کے دشمنوں کی امداد واعانت کرتے تھے اور اللہ کے نیک بندوں کے مقابلہ میں ان کی پاسداری کرتے تھے اور باوجود اس مکاری اور مفسدانہ چلن کے اپنے آپ کو مصلح اور صلح کل کے حامی جانتے تھے۔ (۱)

فساد کی ایک صورت کفار سے دوستی رکھنا: قرآن کریم نے کفار سے موالات اور دوستی رکھنے کو بھی زمین میں فساد ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ﴾ (الانفال/ ۷۳) یعنی کفار آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اگر تم ایسا نہ کرو گے یعنی آپس میں دوستی نہ کرو گے تو اس زمین میں بھاری فتنہ اور بڑا فساد پھیل جائے گا۔ اس آیت نے مسلمان اور کفار کے دوستانہ تعلقات منقطع کر دئے اور جگہ فرمایا اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی تم پر کھلی حجت ہو جائے یعنی تمہاری دلیل نجات کٹ جائے۔ (۲) پھر فرمایا منافق لوگ تو جہنم کے نچلے طبقے میں ہوں گے اور ہرگز تم ان کے لئے کوئی مددگار نہ پاؤ گے۔ (۳)

چونکہ منافقوں کا ظاہر اچھا ہوتا ہے' اس لئے مسلمانوں سے حقیقت پوشیدہ رہ جاتی ہے وہ ایمان داروں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دھوکہ دے دیتے اور ان کے بے حقیقت کلمات اور کفار سے پوشیدہ دوستیوں سے مسلمانوں کو خطرناک مصائب جھیلنے پڑتے ہیں پس بانی فساد یہ منافقین ہوئے۔ اگر یہ اپنے کفر پر ہی رہتے تو ان کی خوفناک سازشوں اور گہری چالوں سے مسلمانوں کو اتنا نقصان ہرگز نہ پہنچتا اور اگر پورے مسلمان ہو جاتے اور ظاہر باطن یکساں کر لیتے تب تو دنیا کے امن وامان کے ساتھ آخرت کی نجات وفلاح بھی پا لیتے باوجود اس خطرناک پالیسی کے جب انہیں یکسوئی کی نصیحت کی جاتی تو جھٹ کہہ اٹھتے کہ ہم تو صلح کن ہیں' ہم کسی سے بگاڑنا نہیں چاہتے' ہم فریقین کے ساتھ اتفاق رکھتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ کہتے تھے "ہم ان دونوں جماعتوں یعنی مومنوں اور اہل کتاب کے درمیان صلح کرانے والے ہیں۔" (۴) لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ ان کی

---

(۱) [تفسیر ابن جریر الطبری (۲۸۹۱)]
(۲) [سورۃ النسآء: آیت ۱٤٤]
(۳) [سورۃ النسآء: آیت ١٤٥]
(۴) [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۵۲)]

نری جہالت ہے جسے یہ صلح سمجھتے ہیں وہ عین فساد ہے لیکن انہیں شعور ہی نہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں (یعنی صحابہ) کی طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم ایسا ایمان لائیں جیسا بے وقوف لائے ہیں؟ خبردار ہو جاؤ یقیناً یہی بے وقوف ہیں لیکن جانتے نہیں ○

بے وقوف لوگوں کی پہچان: مطلب یہ ہے کہ جب ان منافقوں کو صحابہ کی طرح اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں پر کتابوں اور رسولوں ﷺ پر ایمان لانے موت کے بعد جی اٹھنے پر جنت و دوزخ کی حقانیت کے تسلیم کرنے پر اللہ اور رسول ﷺ کی تابعداری کر کے نیک اعمال بجا لانے اور برائیوں سے رکے رہنے کو کہا جاتا ہے تو یہ ملعون فرقہ ایسے ایمان والوں کو بے وقوف قرار دیتا ہے۔ ابن عباس ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم ربیع بن انس عبدالرحمن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ وغیرہ نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔ [1] "سُفَهَآءُ سَفِيْهٌ" کی جمع ہے جیسے حکماء حکیم کی اور حلماء حلیم کی۔ جاہل کم عقل اور نفع نقصان کے پوری طرح نہ جاننے والے کو **سفیہ** کہتے ہیں۔ قرآن میں اور جگہ ہے ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ﴾ [2] الخ بیوقوفوں کو اپنے وہ مال نہ دے بیٹھو جو تمہارے قیام کا سبب ہیں۔ عام مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت میں 'سفہاء' سے مراد عورتیں اور بچے ہیں۔ ان منافقین کے جواب میں یہاں بھی خود پروردگار عالم نے جواب دیا اور تاکیداً حصر کے ساتھ فرمایا کہ بیوقوف تو یہی ہیں لیکن ساتھ ہی جاہل بھی ایسے ہیں کہ اپنی بیوقوفی کو جان بھی نہیں سکتے۔ نہ اپنی جہالت و ضلالت کو سمجھ سکتے ہیں اس سے زیادہ ان کی برائی اور کمال اندھا پن اور ہدایت سے دوری اور کیا ہو گی؟

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾

اور جب ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایماندار ہیں اور جب اپنے بڑوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان سے صرف مذاق کرتے ہیں ○ اللہ تعالیٰ بھی ان سے مذاق کرتا ہے اور انہیں ان کی سرکشی اور بہکاوے میں اور بڑھا دیتا ہے ○

منافقین کی ایک اہم صفت: مطلب یہ ہے کہ یہ بد باطن مسلمانوں کے پاس آ کر اپنی ایمان دوستی اور خیر خواہی ظاہر کر کے انہیں دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں تا کہ مال و جان کا بچاؤ بھی ہو جائے بھلائی اور غنیمت کے مال میں حصہ بھی قائم ہو جائے اور جب اپنے والوں میں ہوتے ہیں تو ان ہی کی سی کہنے لگتے ہیں۔ "خَلَوْا" کے معنی یہاں ہیں "اِنْصَرَفُوْا ذَهَبُوْا خَلَصُوْا مَضَوْا" یعنی لوٹتے ہیں اور پہنچتے ہیں اور تنہائی میں ہوتے ہیں اور جاتے ہیں۔

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۲۹۳،۲۹۴)] [2] [سورۃ النساء: آیت ۵]

پس خلوا جو کہ الٰی کے ساتھ متعدی ہے اس کے معنی لوٹ جانے کے ہیں۔ فعل مضمر اور ملفوظ دونوں پر یہ دلالت کرتا ہے۔ بعض کہتے ہیں الٰی معنی میں مَعَ کے مترادف ہے مگر اول ہی ٹھیک ہے' ابن جریر رحمہ اللہ کے کلام کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ شیاطین سے مراد رؤساء بڑے سردار ہیں جیسے علماء یہود اور سرداران کفار قریش ومنافقین۔

حضرت ابن عباس اور ابن مسعود اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ یہ شیاطین ان کے امیر امراء اور سرداران کفر تھے اور ان کے ہم عقیدہ لوگ بھی۔ شیاطین یہود بھی انہیں پیغمبری کے جھٹلانے اور قرآن کی تکذیب کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں شیاطین سے مراد ان کے وہ ساتھی ہیں جو یا تو مشرک تھے یا منافق۔ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو برائیوں میں اور شرک میں ان کے سردار تھے۔ ابوالعالیہ' سدی' ربیع بن انس رحمہم اللہ بھی یہی تفسیر کرتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''ہر بہکانے اور سرکشی کرنے والے کو شیطان کہتے ہیں۔ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔'' قرآن میں بھی ﴿شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ﴾ (الانعام/۱۱۲) آیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ''ہم جنوں اور انسانوں کے شیطانوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔'' ابوذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا یا رسول اللہ کیا انسان کے شیطان بھی ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں [1] جب یہ منافق مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہیں ''ہم تمہارے ساتھ ہیں'' یعنی جیسے تم ہو ویسے ہی ہم ہیں۔ اور اپنوں سے کہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ ہنسی کھیل کرتے ہیں۔ [2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ربیع بن انس رحمہ اللہ اور قتادہ رحمہ اللہ کی یہی تفسیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جواب دیتے ہوئے ان کے اس مکروہ فعل کے مقابلہ میں فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ان سے ٹھٹھا کرے گا اور انہیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے دے گا جیسے دوسری جگہ ہے' کہ قیامت کے روز منافق مرد وعورت ایمان والوں سے کہیں گے ذرا ٹھہر جاؤ ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں۔ کہا جائے گا اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور کی تلاش کرو۔ ان کے لوٹتے ہی درمیان میں ایک اونچی دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں دروازہ ہوگا' اس طرف تو رحمت ہوگی اور دوسری طرف عذاب ہوگا۔ [3] فرمان الٰہی ہے کافر ہماری ڈھیل کو اپنے حق میں بہتر نہ جانیں۔ اس تاخیر میں وہ اپنی بدکرداریوں میں اور بڑھ جاتے ہیں [4] پس قرآن میں جہاں استہزاء سخریت یعنی مذاق' مکر' خدیعت یعنی دھوکہ کے الفاظ آئے ہیں وہاں یہی مراد ہے۔

ایک اور جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ صرف ڈانٹ ڈپٹ اور تنبیہ کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں ان کی بدکرداریوں اور کفر وشرک پر انہیں ملامت کی گئی ہے۔ اور مفسرین کہتے ہیں یہ الفاظ صرف جواب میں لائے گئے

---

[1] [ضعیف : نسائی : کتاب الاستعاذۃ : باب الاستعاذۃ من شر شیاطین الانس (۵۵۰۹) البزار فی کشف الاستار (۹۳/۱) مجمع البحرین (۲۶۸/۱) مسند احمد (۱۷۸/۵)] امام ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس میں مسعودی راوی ہے جو ثقہ تو ہے مگر اسے اختلاط ہو گیا تھا۔ [مجمع الزوائد (۱۵۹/۱)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف نسائی (۴۲۴)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے، ابوعمر دمشقی اور عبید بن خشخاش ضعیف ومجروح راوی ہیں۔]

[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۳۰۰/۱)]

[3] [سورۃ الحدید : آیت ۱۳]

[4] [سورۃ ال عمران : آیت ۱۷۸]

ہیں جیسے کوئی بھلا آدمی کسی مکار کے فریب سے بچ کر اس پر غالب آ کر کہتا ہے کہو میں نے کیسا فریب دیا حالانکہ اس کی طرف سے فریب نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ فرمان الٰہی ہے کہ ﴿وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ (ال عمران / ٥٤) الخ اور ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ ورنہ اللہ کی ذات مکر اور مذاق سے پاک ہے' مطلب یہ ہے کہ ان کا فن فریب انہی کو برباد کرتا ہے۔ ان الفاظ کا یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اللہ ان کی ہنسی' دھوکہ' تمسخر اور بھول کا ان کو بدلہ دے گا تو بدلے میں بھی وہی الفاظ استعمال کیے گئے دونوں لفظوں کے دونوں جگہ معنی جدا جدا ہیں۔ دیکھئے قرآن کریم میں ہے ﴿وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (الشوری / ٤٠) یعنی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ﴾ (البقرة / ١٩٤) جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو تو ظاہر ہے کہ برائی کا بدلہ لینا حقیقتاً برائی نہیں۔ زیادتی کے مقابلہ میں بدلہ لینا زیادتی نہیں۔ لیکن لفظ دونوں جگہ ایک ہی ہے حالانکہ پہلی برائی اور زیادتی ''ظلم'' ہے' اور دوسری برائی اور زیادتی ''عدل'' ہے لیکن لفظ دونوں جگہ ایک ہی ہے۔ اسی طرح جہاں جہاں کلام اللہ میں ایسی عبارتیں ہیں وہاں یہی مطلب ہے۔ ایک اور مطلب بھی سنیے دنیا میں یہ منافق اپنی اس ناپاک پالیسی سے مسلمانوں کے ساتھ مذاق کرتے تھے اللہ نے بھی ان کے ساتھ یہی کیا کہ دنیا میں انہیں امن وامان مل گیا اور یہ مست ہو گئے حالانکہ یہ عارضی امن ہے' قیامت والے دن انہیں کوئی امن نہیں ملے گا گو یہاں ان کے مال اور جانیں بچ گئیں لیکن اللہ کے ہاں یہ دردناک عذاب کا شکار بنیں گے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور اس کی بہت تائید کی ہے اس لیے کہ مکر' دھوکہ اور مذاق جو بلا وجہ ہو اس سے تو اللہ کی ذات پاک ہے ہاں انتقام' مقابلے اور بدلے کے طور پر یہ الفاظ اللہ کی نسبت کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بھی یہی فرماتے ہیں کہ یہ ان کا بدلہ اور سزا ہے ﴿يَمُدُّهُمْ﴾ کا مطلب ڈھیل دینا اور بڑھانا بیان کیا گیا ہے۔ [1] جیسے فرمایا: ﴿اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ﴾ (المومنون / ٥٥) الخ یعنی کیا یہ یوں سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کے مال اور اولاد کی کثرت ان کے لیے باعث خیر ہے نہیں! نہیں انہیں صحیح شعور ہی نہیں اور ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (القلم / ٤٤) اس طرح ہم انہیں آہستہ آہستہ پکڑیں گے کہ انہیں پتہ بھی نہ چلے غرض کہ ادھر یہ گناہ کرتے ہیں ادھر دنیوی نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں جن پر یہ پھولے نہیں سماتے حالانکہ وہ حقیقت میں عذاب ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ قرآن پاک نے اور جگہ فرمایا ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانعام / ٤٥ / ٤٤) یعنی جب لوگوں نے نصیحت بھلا دی ہم نے ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیئے یہاں تک کہ وہ اپنی چیزوں پر اترانے لگے تو ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا' اب گھبرا گئے' ظالموں کی بربادی ہوئی اور کہہ دیا گیا کہ تعریفیں رب العالمین کے لیے ہی ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہیں ڈھیل دینے اور انہیں اپنی سرکشی اور بغاوت میں بڑھنے کے لیے ان کو مہلت دی جاتی ہے۔ جیسے اور جگہ فرمایا

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/ ٣١١)] [2] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/ ٣٠٧)]

﴿وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ﴾ (الانعام/ ۱۱۰) الخ "طُغْيَان" [2] کہتے ہیں کسی چیز میں گھس جانے کو۔ جیسے فرمایا ﴿إِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاءُ﴾ (الحاقة/ ۱۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں وہ اپنے کفر میں گرے جاتے ہیں۔ ﴿عَمَهُ﴾ کہتے ہیں گمراہی کو۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ضلالت وکفر میں ڈوب گئے اور اس ناپاکی نے انہیں گھیر لیا اب یہ اسی دلدل میں اترتے جاتے ہیں' اسی ناپاکی میں پھنسے جاتے ہیں اور اس سے نجات کی تمام راہیں ان پر بند ہو جاتی ہیں۔ بھلا ایسی دلدل میں جو ہو اور پھر اندھا بہرا اور بیوقوف ہو وہ کیسے نجات پا سکتا ہے۔ آنکھوں کے اندھے پن کے لیے عربی میں "عُمْیٌ" کا لفظ آتا ہے اور دل کے اندھاپے کے لیے "عَمَهٌ" کا لیکن کبھی دل کے اندھے پن کے لیے بھی "عَمٰی" کا لفظ آتا ہے جیسے قرآن میں ہے ﴿وَلَكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ (الحج/ ۴۶)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے مول لے لیا پس نہ تو ان کی تجارت نے ان کو فائدہ پہنچایا اور نہ یہ ہدایت والے ہوئے ○

جن کی تجارت سودمند نہ ہوئی: حضرت ابن عباس' ابن مسعود اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ انہوں نے ہدایت چھوڑ دی اور گمراہی لے لی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں انہوں نے ایمان کے بدلے کفر قبول کیا۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایمان لائے پھر کافر ہو گئے۔ قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں "ہدایت پر گمراہی کو پسند کرتے ہیں۔" جیسے اور جگہ قوم ثمود کے بارے میں ہے ﴿وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ﴾ (حم السجدة / ۱۷) یعنی باوجود اس کے کہ ہم نے قوم ثمود کو ہدایت سے روشناس کر دیا مگر پھر بھی انہوں نے اس رہنمائی کی جگہ اندھے پن کو پسند کیا۔ مطلب یہ ہوا کہ منافقین ہدایت سے ہٹ کر گمراہی پر آ گئے اور ہدایت کے بدلے گمراہی لے لی گویا ہدایت کو بیچ کر گمراہی خرید لی۔ اب ایمان لا کر پھر کافر ہوئے ہوں خواہ سرے سے ایمان ہی نصیب نہ ہوا ہو اور ان منافقین میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾ (المنافقون/ ۳) یہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے پس ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور ایسے بھی منافق تھے جنہیں ایمان نصیب ہی نہ ہوا پس نہ تو انہیں اس سودے میں فائدہ ہوا' نہ راہ ملی' بلکہ ہدایت کے چمنستان سے نکل کر گمراہی کے خارزار میں' جماعت کے مضبوط قلعہ سے نکل کر تنہائیوں کی تنگ جیل میں' امن کے وسیع میدان سے نکل کر خوف کی اندھیری کوٹھری میں اور سنت کے پاکیزہ گلشن سے نکل کر بدعت کے سنسان جنگل میں آ گئے۔ [1]

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

---

[1] [تفسیر ابن جریر طبری (۱/ ۳۱۶)]

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پس آس پاس کی چیزیں روشنی میں آئی ہی تھیں جو اللہ ان کے نور کو لے گیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا جو نہیں دیکھتے۔ بہرے گونگے اندھے ہیں پس وہ نہیں لوٹتے ○

منافقوں کی مثال: مثال کو عربی میں مثیل بھی کہتے ہیں اس کی جمع امثال آتی ہے۔ جیسے قرآن میں ہے: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ ﴾ [1] الخ یعنی یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جنہیں صرف عالم ہی سمجھتے ہیں۔ اس آیت شریف کا مطلب یہ ہے کہ جو منافق گمراہی کو ہدایت کے بدلے اور اندھے پن کو بینائی کے بدلے مول لیتے ہیں ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے اندھیرے میں آگ جلائی اس کے دائیں بائیں کی چیزیں اسے نظر آنے لگیں، اس کی پریشانی دور ہوگئی اور فائدے کی امید بندھی کہ دفعتاً آگ بجھ گئی اور سخت اندھیرا چھا گیا نہ تو نگاہ کام کر سکے، نہ راستہ معلوم ہو سکے اور باوجود اس کے وہ شخص خود بہرا ہو۔ کسی کی بات کو نہ سن سکتا ہو۔ گونگا ہو کسی سے دریافت نہ کر سکتا ہو، اندھا ہو جو روشنی سے کام نہ چلا سکتا ہو۔ اب بھلا یہ راہ کیسے پا سکے گا؟ ٹھیک اسی طرح یہ منافق بھی ہیں کہ ہدایت چھوڑ کر راہ گم کر بیٹھے اور بھلائی چھوڑ کر برائی کو چاہنے لگے۔ اس مثال سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے ایمان قبول کر کے کفر کیا تھا۔ جیسے قرآن کریم میں کئی جگہ یہ صراحت موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سدی رحمہ اللہ سے یہی نقل کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ تشبیہ بہت ہی درست اور صحیح ہے، اس لیے کہ اولاً تو ان منافقوں کو نور ایمان حاصل ہوا پھر ان کے نفاق کی وجہ سے وہ چھن گیا اور یہ حیرت میں پڑ گئے اور دین گم ہو جانے کی حیرت سے بڑی حیرت اور کیا ہوگی؟

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن کی یہ مثال بیان کی گئی ہے انہیں کسی وقت بھی ایمان نصیب ہی نہ ہوا تھا کیونکہ پہلے فرمان الٰہی گذر چکا ہے کہ ﴿ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (البقرہ/۸) یعنی گو یہ زبان سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت پر ایمان لانے کا اقرار کرتے ہیں مگر حقیقتاً یہ ایماندار نہیں۔ درحقیقت اس آیۂ مبارکہ میں ان کے کفر و نفاق کے وقت کی خبر دی گئی ہے اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس حالت کفر و نفاق سے پہلے کبھی انہیں ایمان حاصل ہی نہیں ہوا۔ ممکن ہے ایمان لائے ہوں، پھر اس سے ہٹ گئے ہوں اور اب دلوں میں مہریں لگ گئی ہوں دیکھئے دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ﴾ (منافقون/۳) الخ یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا، پھر ان کے دلوں پر مہر لگ گئی۔ اب وہ کچھ نہیں سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثال میں روشنی اور اندھیرے کا ذکر ہے یعنی کلمہ ایمان کے ظاہر کرنے کی وجہ سے دنیا میں کچھ نور ہو گیا، کفر کے چھپانے کی وجہ سے پھر آخرت کے اندھیروں نے گھیر لیا۔ ایک جماعت کی مثال شخص واحد سے اکثر دی جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اور جگہ ہے ﴿ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ﴾ (احزاب/۱۹) تو دیکھے گا کہ وہ تیری طرف آنکھیں پھیر پھیر کر اس طرح دیکھتے ہیں جس طرح وہ شخص جو سکرات موت میں ہو۔ اور اس آیت کو بھی دیکھئے ﴿ مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ﴾

---

[1] [سورۃ العنکبوت : آیت ۴۳]

(لقمان / ۲۸) تم سب کا پیدا کرنا اور مار ڈالنے کے بعد پھر زندہ کر دینا ایسا ہی ہے جیسے ایک جان کو دوبارہ زندہ کرنا۔ تیسری جگہ توراۃ سیکھ کر عملی عقیدہ اس کے مطابق نہ رکھنے والوں کی مثال میں کہا گیا ہے ﴿كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (الجمعہ / ۵) گدھے کی مانند ہیں جو کتابیں لادے ہوئے ہو۔ سب آیتوں میں جماعت کی مثال ایک ہی دی گئی ہے۔ اسی طرح مذکورہ بالا آیت میں منافقوں کی جماعت کی مثال ایک شخص سے دی گئی۔ بعض کہتے ہیں تقدیر کلام یوں ہے مَثَلُ قِصَّتِهِمْ كَقِصَّةِ الَّذِيْنَ اسْتَوْقَدُوْا نَارًا یعنی ان کے واقعہ کی مثال ان لوگوں کے واقعہ کی طرح جو آگ روشن کریں۔ بعض کہتے ہیں کہ آگ جلانے والا تو ایک ہے لیکن مجموعی طور پر پوری جماعت اس سے محظوظ ہوتی ہے جو اس کے ساتھ ہے اور اس قسم کا اور ﴿اَلَّـــذِىْ﴾ یہاں ﴿اَلَّذِيْنَ﴾ کے معنی میں ہیں جیسے کہ شاعروں کے شعروں میں بھی آتا ہے میں کہتا ہوں اس مثال میں بھی واحد کے صیغہ کے بعد ہی جمع کے صیغہ بھی ہیں۔ ﴿بِنُوْرِهِمْ﴾ اور ﴿تَرَكَهُمْ﴾ اور ﴿لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ ملاحظہ ہوں۔ اس طرح کلام میں اعلیٰ فصاحت اور بہترین خوبی بھی آ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی روشنی لے گیا اس سے مطلب یہ ہے کہ جو نور نفع دینے والا تھا وہ تو ان سے ہٹا لیا اور جس طرح آگ کے بجھ جانے کے بعد تپش اور دھواں اور اندھیرا رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے پاس نقصان پہنچانے والی چیز یعنی شک وکفر ونفاق رہ گیا تو راہ راست کو نہ خود دیکھ سکیں نہ دوسرے کی بھلی بات سن سکیں نہ کسی سے بھلائی کا سوال کر سکیں۔ اب پھر لوٹ کر ہدایت پر آنا محال ہو گیا۔ اس کی تائید میں مفسرین کے اقوال سنیے۔

حضرت ابن عباس، ابن مسعود اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے کے بعد کچھ لوگ اسلام لے آئے مگر پھر منافق بن گئے۔ ان کی مثال اس شخص جیسی ہے جو اندھیرے میں ہو پھر آگ جلا کر روشنی حاصل کرے اور آس پاس کی بھلائی برائی کو سمجھنے لگے اور معلوم کرے کہ کس راہ میں کیا ہے؟ کہ اچانک آگ بجھ جائے روشنی جاتی رہے۔ اب معلوم نہیں ہو سکتا کہ کس راہ میں کیا کیا ہے؟ اسی طرح منافق شرک وکفر کی ظلمت میں تھے پھر اسلام لا کر بھلائی برائی یعنی حلال حرام وغیرہ سمجھنے لگے مگر پھر کافر ہو گئے اور حرام وحلال خیر وشر میں کچھ تمیز نہ رہی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نور سے مراد ایمان اور ظلمت سے مراد ضلالت وکفر ہے یہ لوگ ہدایت پر تھے لیکن پھر سرکشی کر کے بہک گئے۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایمانداری اور ہدایت کی طرف رخ کرنے کو اس مثال میں آس پاس کی چیز کی روشنی کرنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت عطا خراسانی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ منافق کبھی کبھی بھلائی کو دیکھ لیتا ہے اور پہچان بھی لیتا ہے لیکن پھر اس کے دل کی کور چشمی اس پر غالب آ جاتی ہے۔ عکرمہ، حسن، سدی اور ربیع رحمہم اللہ سے بھی یہی منقول ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں منافقوں کی یہی حالت ہے کہ ایمان لاتے ہیں اور اس کی پاکیزہ روشنی سے ان کے دل جگمگا اٹھتے ہیں جیسے آگ کے جلانے سے آس پاس کی چیزیں روشن ہو جاتی ہیں لیکن پھر کفر اس روشنی کو کھو دیتا ہے جس طرح آگ کا بجھ جانا پھر اندھیرا کر دیتا ہے۔ مندرجہ بالا اقوال تو ہماری اس تفسیر کی تائید میں تھے کہ جن منافقوں کی یہ مثال بیان کی گئی ہے وہ

ایمان لا چکے تھے پھر کفر کیا۔ اب امام ابن جریر ؒ کی تائید میں جو تفسیر ہے اسے بھی سنئے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ مثال منافقوں کی ہے کہ وہ اسلام کی وجہ سے عزت پا لیتے ہیں۔ مسلمانوں میں نکاح، ورثہ اور تقسیم مال غنیمت میں شامل ہوتے ہیں لیکن مرتے ہی یہ عزت چھن جاتی ہے جس طرح آگ کی روشنی آگ بجھتے ہی جاتی رہتی ہے۔ ابوالعالیہ ؒ فرماتے ہیں جب منافق ﴿لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ﴾ پڑھتا ہے تو دل میں نور پیدا ہوتا ہے پھر جہاں شک کیا وہ نور گیا، جس طرح لکڑیاں جب تک جلتی رہیں روشنی رہی، جہاں بجھ گئیں نور گیا۔ ضحاک ؒ فرماتے ہیں نور سے مراد یہاں ایمان ہے جو ان کی زبانوں پر تھا۔ قتادہ ؒ کہتے ہیں ﴿لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ﴾ ان کے لیے روشنی کر دیتا تھا امن وامان، کھانا پینا، بیوی بچے سب مل جاتے تھے لیکن شک ونفاق مرتے ہی ان سے یہ تمام راحتیں چھین لیتا ہے جس طرح آگ کا بجھنا روشنی دور کر دیتا ہے۔ حضرت قتادہ ؒ کا قول ہے کہ ﴿لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ﴾ کہنے سے منافق کو (دنیوی نفع مثلاً مسلمانوں میں لڑکے لڑکی کا لین دین، ورثہ کی تقسیم، جان ومال کی حفاظت وغیرہ) مل جاتا ہے لیکن چونکہ اس کے دل میں ایمان کی جڑ اور اس کے اعمال میں خلوص نہیں ہوتا اس لیے موت کے وقت وہ سب منافق سے سلب ہو جاتے ہیں جیسے آگ کی روشنی بجھ جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اندھیروں میں چھوڑ دینا سے مراد مرنے کے بعد عذاب ہونا ہے۔ یہ لوگ حق کو دیکھ کر زبان سے اس کا اقرار کرتے ہیں اور ظلمت کفر سے نکل جاتے ہیں لیکن پھر اپنے کفر ونفاق کی وجہ سے ہدایت کا نظر آنا اور حق پر قائم رہنا ان سے چھن جاتا ہے۔ سدی ؒ کا قول ہے کہ اندھیرے سے مراد ان کا نفاق ہے۔ حسن بصری ؒ فرماتے ہیں موت کے وقت منافقین کی بداعمالیاں اندھیروں کی طرح ان پر چھا جاتی ہیں اور کسی بھلائی کی روشنی ان کے لیے باقی نہیں رہتی جس سے ان کی توحید کی تصدیق ہو۔ وہ بہرے ہیں حق کے سننے سے، اور اندھے ہیں راہ راست کو دیکھنے اور سمجھنے سے۔ ہدایت کی طرف لوٹ نہیں سکتے۔ نہ تو انہیں توبہ نصیب ہوتی ہے، نہ نصیحت حاصل کر سکتے ہیں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ
مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ
اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ
لَذَھَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰ ع ۲

یا آسمانی برسات کی طرح جس میں اندھیریاں اور گرج اور بجلی ہو، موت سے ڈر کر کڑاکے کی وجہ سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرنے والا ہے ○ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے جائے جب ان کے لیے روشنی کرتی ہے تو اس میں چلتے پھرتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا کرتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان کے کانوں اور آنکھوں کو بیکار کر دے یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ○

مومن، کافر اور منافق کی پہچان: یہ دوسری مثال ہے جو دوسری قسم کے منافقوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔ یہ وہ قوم ہے جن پر کبھی حق ظاہر ہو جاتا ہے اور کبھی پھر شک میں پڑ جاتے ہیں تو شک کے وقت ان کی مثال برسات کی سی ہے۔ صَيِّبٍ کے معنی مینہ اور بارش کے ہیں۔ بعض نے بادل کے معنی بھی بیان کیے ہیں لیکن زیادہ مشہور معنی بارش کے ہی ہیں۔ جو اندھیرے میں برسے۔ ظلمات سے مراد شک' کفر و نفاق ہے اور رعد سے مراد یعنی گرج ہے جو اپنی خوفناک آواز سے دل دہلا دیتی ہے۔ یہی حال منافق کا ہے کہ اسے ہر وقت ڈر خوف گھبراہٹ اور پریشانی ہی رہتی ہے۔ جیسے کہ اور جگہ فرمایا ﴿يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ﴾ (منافقون / ٤) یعنی ہر آواز کو اپنے اوپر ہی سمجھتے ہیں ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ یہ منافقین اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں دراصل وہ ڈرپوک لوگ ہیں اگر وہ کوئی جائے پناہ یا راستہ پالیں تو یقیناً اس میں سمٹ کر گھس جائیں۔ [1] بجلی کی مثال سے مراد وہ نور ایمان ہے جو ان کے دلوں میں کسی وقت چمک اٹھتا ہے' اس وقت وہ اپنی انگلیاں موت کے ڈر سے کانوں میں ڈال لیتے ہیں لیکن ایسا کرنا انہیں کوئی نفع نہ دے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے ارادے کے ماتحت ہیں' یہ بچ نہیں سکتے۔ جیسا کہ اور جگہ فرمایا ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ﴾ (البروج / ١٨٬١٧) الخ یعنی کیا تمہیں لشکر فرعون اور ثمود کی روایتیں نہیں پہنچیں' بے شک پہنچی تو ہیں لیکن یہ کافر پھر بھی تکذیب ہی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی انہیں ان کے پیچھے سے گھیر رہا ہے۔ بجلی کا آنکھوں کو اچک لینا' اس کی قوت اور سختی کا اظہار ہے اور منافقین کی بینائی کی کمزوری اور ان کا ضعف ایمان ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ قرآن کی مضبوط آیتیں ان منافقوں کی قلعی کھول دیں گی اور ان کے چھپے ہوئے عیب ظاہر کر دیں گی اور اپنی نورانیت سے انہیں مبہوت کر دیں گی [2] جب ان پر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں یعنی جب ایمان ان پر ظاہر ہو جاتا ہے تو ذرا روشن دل ہو کر پیروی بھی کرنے لگتے ہیں لیکن پھر جہاں شک و شبہ آیا' دل میں کدورت اور ظلمت بھر گئی' اور بھونچکے ہو کر کھڑے رہ گئے۔ اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اسلام کو ذرا عروج ملا تو ان کے دل میں قدرے اطمینان پیدا ہوا' جہاں اس کے خلاف نظر آیا یہ الٹے پیروں کفر کی طرف لوٹنے لگے۔ [3] جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ (الحج / ١١) الخ یعنی بعض لوگ وہ بھی ہیں جو کنارے پر ٹھہر کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اگر بھلائی ملے تو مطمئن ہو جائیں اور اگر برائی پہنچے تو اسی وقت پھر گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان کا روشنی میں چلنا حق کو جان کر کلمہ اسلام پڑھنا ہے اور اندھیرے میں ٹھہر جانا کفر کی طرف لوٹ جانا ہے۔ دیگر بہت سے مفسرین کا بھی یہی قول ہے اور زیادہ صحیح اور ظاہر بھی یہی قول ہے۔ [4] واللہ اعلم۔ روز قیامت بھی ان کا یہی حال رہے گا کہ جب لوگوں کو ان کے ایمان کے اندازے کے مطابق نور ملے گا' بعض کو کئی کئی میلوں تک کا' بعض کو

[1] [سورة التوبة: آیت ٥٦-٥٧]
[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٣٤٩)]
[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٣٤٩)]
[4] [تفسیر ابن ابی حاتم (١/٧٥)]

اس سے بھی زیادہ، کسی کو اس سے کم، یہاں تک کہ کسی کو اتنا نور ملے گا کہ کبھی روشن ہو اور کبھی اندھیرا کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ذرا سی دور چل سکیں گے پھر ٹھہر جائیں گے پھر ذرا سی دور کا نور ملے گا پھر بجھ جائے گا اور بعض وہ بے نصیب بھی ہوں گے کہ ان کا نور بالکل بجھ جائے گا یہ پورے منافق ہوں گے جن کے بارے میں فرمان الٰہی ہے ﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا﴾ (الحدید/۱۳) الخ یعنی جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں کو پکاریں گے اور کہیں گے ذرا رکو! ہمیں بھی آ لینے دو تا کہ ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھائیں تو کہا جائے گا کہ اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور نور ڈھونڈ لاؤ، الخ۔ مومنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم﴾ (الحدید/۱۲) الخ یعنی اس دن تو دیکھے گا کہ مومن مرد اور عورتوں کے آگے آگے اور دائیں جانب نور ہوگا اور کہا جائے گا تمہیں آج باغات کی خوشخبری دی جاتی ہے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ اور فرمایا جس دن نہ رسوا کرے گا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اور ان لوگوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لائے، ان کا نور ان کے آگے اور دائیں ہوگا۔ وہ کہہ رہے ہوں گے اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر اور ہمیں بخش۔ یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔ [1] ان آیتوں کے بعد اب اس مضمون کی حدیثیں بھی سنیے۔

احادیث نور کا بیان: نبی ﷺ فرماتے ہیں: ''بعض مومنوں کو مدینہ سے لے کر عدن تک نور ملے گا۔ بعض کو اس سے کم یہاں تک کہ بعض کو اتنا کم کہ صرف پاؤں رکھنے کی جگہ ہی روشن ہوگی۔'' [2] (ابن جریر) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''ایمان والوں کو ان کے اعمال کے مطابق نور ملے گا بعض کو کھجور کے درخت جتنا، کسی کو قد آدم جتنا، کسی کو صرف اتنا ہی کہ اس کا انگوٹھا ہی روشن ہو، کبھی بجھ جاتا ہو، کبھی روشنی ہو جاتا ہو۔'' (ابن ابی حاتم) [3] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''انہیں نور ملے گا ان کے اعمال کے مطابق جس کی روشنی میں وہ پل صراط سے گزریں گے۔ بعض لوگوں کا نور پہاڑ جتنا ہوگا، بعض کا کھجور جتنا اور سب سے کم نور والا وہ ہوگا جس کا نور اس کے انگوٹھے پر ہوگا کبھی چمک اٹھے گا اور کبھی بجھ جائے گا۔'' (ابن ابی حاتم) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ''کہ تمام اہل توحید کو قیامت کے دن نور ملے گا۔ جب منافقوں کا نور بجھ جائے گا تو موحد ڈر کر کہیں گے ﴿رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا﴾ (التحریم/۸) یارب ہمارے نور کو پورا کر۔'' (ابن ابی حاتم) [4] ضحاک بن مزاحم رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ ان احادیث سے معلوم ہوا کہ قیامت والے دن لوگ کئی قسم کے ہوں گے۔ خالص مومن وہ جن کا بیان اگلی چار آیتوں میں ہوا خالص کفار جن کا ذکر اس کے بعد کی دو آیتوں میں ہے اور منافق جن کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو خالص منافق جن کی مثال آگ کی روشنی سے دی گئی۔ دوسرے وہ منافق جو تردد میں ہیں کبھی تو ایمان چمک اٹھتا ہے کبھی بجھ جاتا ہے، ان ہی کی مثال بارش سے دی گئی ہے یہ پہلی قسم کے منافقوں سے کچھ کم ہیں۔

---

[1] [سورۃ تحریم : آیت ۸]

[2] [**ضعیف ومرسل** : تفسیر ابن جریر الطبری (۳۳۶۱۴)]

[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱۷۹/۲۳)]

[4] [حاکم (۴۹۰/۲) الدر المنثور (۵۲/۸)]

ٹھیک اسی طرح سورۂ نور میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومن کی اور اس کے دل کے نور کی مثال اس منور چراغ سے دی ہے جو روشن فانوس میں ہو اور خود فانوس بھی چمکتے ہوئے تارے کی طرح ہو۔ چنانچہ ایمان دار کا ایک تو خود دل روشن، دوسرے خالص شریعت کی اسے امداد، بس روشنی پر روشنی، نور پر نور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ کافروں کی مثال بھی بیان کی جو اپنی نادانی کی وجہ سے اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ کچھ نہیں ہوتے۔ فرمایا کافروں کے اعمال کی مثال ریت کے چمکیلے ٹیلوں کی طرح ہے جنہیں پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ پاس آ کر دیکھتا تو کچھ بھی نہیں پاتا۔ [1] ایک اور جگہ پر ان جاہل کافروں کی مثال بیان کی جو جہل بسیط میں گرفتار ہیں۔ فرمایا مانند سخت اور اندھیروں کے جو گہرے سمندر میں ہوں جو موجوں پر موجیں مار رہا ہو پھر ابر سے ڈھکا ہوا ہو اور اندھیروں پر اندھیرے چھائے ہوئے ہوں، ہاتھ نکالے تو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کے لیے اللہ کی طرف سے نور نہ ہو اس کے پاس نور کہاں سے آئے؟ [2] پس کفار کی بھی دو قسمیں بیان کیں ایک تو دوسروں کو کفر کی طرف بلانے والے دوسرے ان کی تقلید کرنے والے۔ جیسے سورۂ حج کے شروع میں ہے ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ [3] الخ بعض وہ لوگ ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم کے جھگڑتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتَابٍ مُّنِيْرٍ﴾ (الحج / ۸) بعض لوگ علم اور ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارے میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ سورہ واقعہ کے شروع اور آخر میں اور سورہ انسان میں مومنوں کی بھی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ سابقین اور اصحاب یمین یعنی مقربین بارگاہ ربانی اور پرہیزگار و نیک کار لوگ۔ پس ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ مومنوں کی دو جماعتیں ہیں مقرب اور ابرار۔ اور کافروں کی بھی دو قسمیں ہیں کفر کی طرف بلانے والے اور ان کی تقلید کرنے والے۔ منافقوں کی بھی دو قسمیں ہیں خالص اور پکے منافق اور وہ منافق جن میں نفاق کی ایک آدھ شاخ ہے۔

صحیحین میں حدیث ہے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "تین خصلتیں ایسی ہیں جس میں یہ تینوں ہوں وہ پختہ منافق ہے اور جس میں ایک ہو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک اسے نہ چھوڑے۔ بات کرنے میں جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا، امانت میں خیانت کرنا۔ [4] اس سے ثابت ہوا کہ انسان میں بھی نفاق کا کچھ حصہ ہوتا ہے خواہ وہ نفاق عملی ہو خواہ اعتقادی جیسے کہ آیت وحدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ سلف کی ایک جماعت اور علماء کرام کے ایک گروہ کا یہی مذہب ہے اس کا بیان پہلے بھی گذر چکا ہے اور آئندہ بھی آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مسند احمد میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دل چار قسم کے ہیں ایک تو صاف دل جو روشن چراغ کی طرح چمک رہا ہو دوسرے وہ دل جو غلاف آلود ہیں، تیسرے وہ دل جو الٹے ہیں، چوتھے وہ دل جو مخلوط ہیں پہلا دل مومن کا ہے جو پوری طرح نورانی ہے، دوسرا کافر کا دل ہے جس پر پردے پڑے ہوئے ہیں،

---

[1] [سورۃ النور : آیت ۳۹]
[2] [سورۃ النور : آیت ۴۰]
[3] [سورۃ الحج : آیت ۳]
[4] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الایمان : باب علامۃ المنافق (۳٤) ، (۲٤۵۹) صحیح مسلم : کتاب الایمان : باب خصال المنافق (۵۸) ترمذی : کتاب الایمان : باب ما جآء فی علامۃ المنافق (۲٦۳۲) ابو داؤد : کتاب السنۃ : باب الدلیل علی زیادۃ الایمان و نقصہ (٤٦۸۸)]

تیسرا دل خالص منافقوں کا ہے جو جانتا ہے اور انکار کرتا ہے' چوتھا دل اس منافق کا ہے جس میں ایمان ونفاق دونوں جمع ہیں۔ ایمان کی مثال اس سبزے کی طرح ہے جو پاکیزہ پانی سے بڑھ رہا ہو اور نفاق کی مثال اس پھوڑے کی طرح ہے جس میں پیپ اور خون بڑھتا ہی جاتا ہو اب جو مادہ بڑھ جائے وہ دوسرے پر غالب آ جاتا ہے۔ [1] اس حدیث کی اسناد بہت ہی عمدہ ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور آنکھیں برباد کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے حق کو جان کر اسے چھوڑ دیا تو اللہ ہر چیز پر قادر ہے یعنی اگر چاہے تو عذاب وسزا دے چاہے تو معاف کر دے۔ [2] یہاں قدرت کا بیان اس لیے کیا کہ پہلے منافقوں کو اپنے عذاب' اپنی جبروت سے ڈرایا اور کہہ دیا کہ وہ انہیں گھیر لینے پر قادر ہے اور ان کے کانوں کو بہرا کرنے اور آنکھوں کو اندھا کرنے پر قادر ہے۔ [3]

'قدیر' کے معنی قادر کے ہیں جیسے 'علیم' کے معنی 'عالم' کے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ دو مثالیں ایک ہی قسم کے منافقوں کی ہیں 'او' معنی میں 'و' کے ہے جیسے فرمایا ﴿وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا﴾ [4] یا لفظ "اَوْ" اختیار کے لیے ہے یعنی خواہ یہ مثال بیان کرو' خواہ وہ مثال بیان کرو اختیار ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں 'او' یہاں پر تساوی یعنی برابری کے لیے ہے جیسے عربی زبان کا محاورہ ہے "جَالِسِ الْحَسَنَ اَوِ ابْنَ سِيْرِيْنَ" زمخشری رحمہ اللہ بھی یہی توجیہ کرتے ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ان دونوں مثالوں میں سے جو مثال چاہو بیان کرو دونوں ان کے حال کے مطابق ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ باعتبار منافقوں کی اقسام کے ہے' ان کے احوال وصفات طرح طرح کے ہیں۔ جیسے کہ سورہ براءت میں "وَمِنْهُمْ وَمِنْهُمْ وَمِنْهُمْ" کر کے ان کی بہت سی قسمیں بہت سے افعال اور بہت سے اقوال بیان کیے ہیں۔ تو یہ دونوں مثالیں دو قسم کے منافقوں کی ہیں جو ان کے احوال اور صفات سے بالکل مشابہ ہیں۔ واللہ اعلم۔ جیسے کہ سورۂ نور میں دو قسم کے کفار کی مثالیں بیان کیں۔ ایک کفر کی طرف بلانے والے دوسرے مقلد۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ﴾ (النور/۳۹) پھر فرمایا ﴿اَوْ كَظُلُمَاتٍ﴾ (النور/٤٠) پس پہلی مثال یعنی ریت کے تودے کی کفر کی طرف بلانے والوں کی ہے جو جہل مرکب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ دوسری مثال مقلدین کی ہے جو جہل بسیط میں مبتلا ہیں۔ واللہ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَاۗءَ بِنَاۗءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ
مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾

[1] [ضعیف: مسند احمد (۳/۱۷) طبرانی صغیر (۲/۱۰۹) ابو نعیم فی الحلیة (٤/٣٨٥)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [السلسلة الضعیفة (٥١٥٨)] اس کی سند میں لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

[2] [تفسیر ابن ابی حاتم (١/٧٦)]

[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٣٦١)]

[4] [سورة الدهر: آیت ٢٤]

اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کے سب کو پیدا کیا' یہی تمہارا بچاؤ ہے ○ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت' اور آسمان سے پانی اتار کر اس سے پھل پیدا کر کے تمہیں روزی دی خبردار باوجود جاننے کے' اللہ کے شریک مقرر نہ کرو ○

حقیقی معبود: یہاں سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی الوہیت کا بیان شروع ہوتا ہے وہی اپنے بندوں کو عدم سے وجود میں لایا' اسی نے ہر طرح کی ظاہری و باطنی نعمتیں عطا فرمائیں' اسی نے زمین کو فرش بنایا اور اس میں مضبوط پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں اور آسمان کو چھت بنایا۔ جیسے کہ دوسری آیت میں آیا کہ ﴿ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ﴾ (الانبیاء / ۳۲) الخ یعنی آسمان کو محفوظ چھت بنایا اس کے باوجود وہ نشانیوں سے منہ موڑ لیتے ہیں' آسمان سے پانی اتارنے کا مطلب بادل نازل فرمانا ہے۔ اس وقت جبکہ لوگ اس کے پورے محتاج ہوں۔ پھر اس پانی سے طرح طرح کے پھل پھول پیدا کرنا ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں اور ان کے جانور بھی۔ جیسے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا بیان آیا ہے۔ ایک جگہ فرمان ہے ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا ﴾ (المومن / ٦٤) الخ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہیں پیاری پیاری صورتیں عطا فرمائیں اور طرح طرح کی غذائیں پہنچائیں یہی اللہ ہے جو برکتوں والا اور تمام عالم کو پالنے والا ہے پس سب کا خالق' سب کا رازق' سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس لیے شرک سے مبرا ہر قسم کی عبادت کا وہی مستحق ہے اور فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ جبکہ تم جانتے ہو۔''

چند اقسام شرک: صحیحین میں حدیث ہے ''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پوچھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو تمہارا خالق ہے کسی کو شریک ٹھہرانا۔''[1] حضرت معاذ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ہے ''جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے؟ یہ کہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کریں۔''[2] دوسری حدیث میں ہے ''تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے بلکہ یوں کہے جو کچھ اللہ اکیلا چاہے' پھر جو فلاں چاہے۔''[3]

---

[1] [**صحیح:** صحیح بخاری : کتاب الادب : باب قتل الولد خشية ان يا كل معه (٦٠٠١) صحيح مسلم : كتاب الايمان : باب كون الشرك اقبح الذنوب (٨٦) ترمذی (٣١٨٢) ابن حبان (٤٤١٤)]

[2] [**صحیح:** صحیح بخاری : کتاب الجهاد : باب اسم الفرس والحمار (٢٨٥٦) صحيح مسلم : كتاب الايمان : باب الدليل على ان من مات على التوحيد دخل الجنة قطعا (٣٠) ترمذی : کتاب الایمان : باب ما جآء فی افتراق هذه الامة (٢٦٤٣) ابن ماجه : کتاب الزهد : باب ما يرجئ من رحمة الله يوم القيامه (٤٢٩٦) مسند احمد (٢٢٨/٥)]

[3] [**صحیح:** ابو داؤد : کتاب الادب : باب لا يقال خبثت نفسی (٤٩٨٠) ابن ابی شيبة (١١٧/٩) طيالسی (٤٣٠) ابن السنی (٦٧١) بیهقی فی السنن الکبری (٢١٦/٣) طحاوی (٩٠/١) مسند احمد (٣٨٤/٥، ٣٩٤) الادب المفرد (٧٨٣)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[السلسلة الصحیحه(١٣٧)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔]

طفیل بن سخبرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوتیلے بھائی فرماتے ہیں میں نے خواب میں چند یہودیوں کو دیکھا اور ان سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا ہم یہود ہیں۔ میں نے کہا افسوس تم میں یہ بڑی خرابی ہے کہ تم حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے ہو انہوں نے کہا تم بھی اچھے لوگ ہو لیکن افسوس تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) چاہیں پھر میں نصرانیوں کی جماعت کے پاس گیا اور ان سے بھی اسی طرح پوچھا انہوں نے بھی یہی جواب دیا۔ میں نے ان سے کہا افسوس تم بھی مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہو۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا میں نے صبح اپنے اس خواب کا ذکر کچھ لوگوں سے کیا پھر دربار نبوی میں حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی خواب بیان کیا۔ آپ نے پوچھا کیا کسی اور سے بھی تم نے اس کا ذکر کیا ہے؟ میں نے کہا ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اب آپ کھڑے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور فرمایا طفیل نے ایک خواب دیکھا اور تم میں سے بعض کو بیان بھی کیا میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس کلمہ کے کہنے سے روک دوں لیکن فلاں فلاں کاموں کی وجہ سے میں اب تک نہ کہہ سکا۔ یاد رکھو ''اب ہرگز ہرگز اللہ چاہے اور اس کا رسول'' کبھی نہ کہنا بلکہ یوں کہو کہ صرف اللہ تعالیٰ اکیلا جو چاہے۔ [1] (ابن مردویہ)

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے یوں کہہ جو اللہ تعالیٰ اکیلا چاہے [2] (ابن مردویہ) ایسے تمام کلمات توحید کے سراسر خلاف ہیں۔ توحید باری کی اہمیت کے بارے میں یہ سب احادیث بیان ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم۔ تمام کفار اور منافقوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا اور فرمایا اللہ کی عبادت کرو یعنی اس کی توحید کے پابند ہو جاؤ' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو جو نہ نفع دے سکے نہ نقصان پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اس کے سوا کوئی رب نہیں جو تمہیں روزی پہنچا سکے اور تم جانتے ہو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں اس توحید کی طرف بلا رہے ہیں جس کے حق اور سچ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ شرک اس سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے جیسے چیونٹی جو رات کے اندھیرے میں کسی صاف پتھر پر چل رہی ہو' قسم ہے اللہ کی اور قسم ہے آپ کی حیات کی' یہ بھی شرک ہے انسان کا یہ کہنا اگر یہ کتیا نہ ہوتی تو چور رات کو ہمارے گھر میں گھس آتے یہ بھی شرک ہے۔ آدمی کا یہ قول کہ اگر بطخ گھر میں نہ ہوتی تو چوری ہو جاتی یہ بھی شرک کا کلمہ ہے کسی کا یہ قول کہ جو اللہ چاہے اور آپ۔ یہ بھی شرک ہے کسی کا یہ کہنا کہ اگر اللہ نہ ہوتا اور فلاں نہ ہوتا۔ یہ سب کلمات شرک ہیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں تو آپ نے فرمایا کیا تو

---

[1] [صحیح : مسند احمد (۵/۷۲) ابن ماجہ : کتاب الکفارات : باب النھی ان یقال ما شاء اللہ و شئت (۲۱۱۸) ابن حبان (۵۷۲۵) دارمی (۲/۲۹۵)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[السلسلة الصحیحه (۱۳۸)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔]

[2] [حسن : النسائی فی السنن الکبری (۱۰۸۲۵) ابن ماجه : کتاب الکفارات (۲۱۱۷) مسند احمد (۲۱٤/۱) طحاوی فی مشکل الآثار (۹۰/۱) طبرانی کبیر (۱۳۰۰۵) ابو نعیم فی الحلیة (۹۹/٤) بیھقی (۲۱۷/۳) ابن ابی الدنیا فی الصمت (۳٤۲) ابن السنی (٦۷۲) الادب المفرد للبخاری (۷۸۳)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[السلسلة الصحیحة (۲٦٤/۱)، (۱۳۹)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے صحیح کہا ہے۔]

مجھے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے؟ دوسری حدیث میں تم اچھے لوگ ہوتے اگر تم شرک نہ کرتے تم کہتے ہو جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے۔ [1]

ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ﴿أَنْدَادًا﴾ کے معنی شریک اور برابر کے ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں تم تورات وانجیل پڑھتے ہو اور جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایک اور لاشریک ہے، پھر جانتے ہوئے کیوں اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتے ہو؟

اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ پانچ احکام: مسند احمد میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کا حکم دیا کہ ان پر عمل کرو اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم دو، قریب تھا کہ وہ اس میں غفلت کریں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انہیں یاد دلایا کہ آپ کو پروردگار عالم کا حکم تھا کہ ان پانچ چیزوں پر خود کاربند ہو کر دوسروں کو بھی حکم دو۔ لہٰذا یا تو آپ کہہ دیجیے یا میں پہنچادوں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ سبقت لے گئے تو کہیں مجھے عذاب نہ دیا جائے یا زمین میں دھنسا نہ دیا جائے، پس یحییٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بیت المقدس کی مسجد میں جمع کیا، جب مسجد بھر گئی تو آپ اونچی جگہ پر بیٹھ گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کر کے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ باتوں کا حکم کیا ہے کہ خود بھی عمل کروں تم سے بھی ان پر عمل کراؤں۔

① ایک یہ کہ اللہ ایک کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص خاص اپنے مال سے کسی غلام کو خریدے اور غلام کام کاج کرے لیکن جو کچھ حاصل ہو اسے کسی اور کو دے دے۔ کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو؟ ٹھیک اسی طرح تمہارا پیدا کرنے والا، تمہیں روزی دینے والا، تمہارا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

② دوسری یہ کہ نماز کو ادا کرو اللہ تعالیٰ کی نگاہ بندے کی طرف ہوتی ہے جب تک کہ وہ نماز میں ادھر ادھر منہ نہ پھیرے جب تم نماز میں ہو تو خبردار ادھر ادھر التفات نہ کرنا۔

③ تیسرا حکم یہ ہے کہ روزے رکھا کرو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس مشک کی تھیلی بھری ہوئی ہو جس سے اس کے تمام ساتھیوں کے دماغ معطر ہیں۔ یاد رکھو روزے دار کے منہ کی خوشبو اللہ تعالیٰ کو مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسند ہے۔

④ چوتھا حکم یہ ہے کہ صدقہ دیتے رہا کرو، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو دشمنوں نے قید کر لیا اور گردن کے ساتھ اس کے ہاتھ باندھ دیئے گردن مارنے کے لیے لے جانے لگے تو وہ کہنے لگا کہ تم مجھ سے فدیہ لے لو اور مجھے چھوڑ دو چنانچہ جو کچھ تھا کم زیادہ دے کر اپنی جان چھڑالی۔

⑤ پانچواں اس کا حکم یہ ہے کہ کثرت سے اس کے نام کا ذکر کیا کرو اور اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کے پیچھے تیزی کے ساتھ دشمن دوڑتا آتا ہے اور وہ ایک مضبوط قلعہ میں گھس جاتا ہے اور وہاں امن وامان پا

---

[1] [صحیح: مسند احمد (۱/۳۹۴) النسائی (۶/۷) اسد الغابة لابن الأثير (۷/۲۳۹)] حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [فتح الباری (۴/۳۸۹)]

لیتا ہے اسی طرح بندہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے وقت شیطان سے بچا ہوا ہوتا ہے یہ فرما کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اب میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم کرتا ہوں جن کا حکم جناب باری نے مجھے دیا ہے مسلمانوں کی جماعت کو لازم پکڑے رہنا' اللہ اور اس کے رسول اور مسلمان حاکم وقت کے احکام سننا۔ اور جاننا۔ ہجرت کرنا' اور جہاد کرنا جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر نکل جائے گویا وہ اسلام کے پٹے کو اپنے گلے سے اتار پھینکے گا ہاں یہ اور بات ہے کہ رجوع کر لے' جو شخص جاہلیت کی پکار پکارے وہ جہنم کا کوڑا کرکٹ ہے لوگوں نے کہا حضور ﷺ اگرچہ وہ روزے دار اور نمازی ہو فرمایا اگر چہ نماز پڑھتا ہو اور روزے بھی رکھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔ مسلمانوں کو ان کے ان ناموں کے ساتھ پکارتے رہو جو خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے رکھے ہیں مسلمین مومنین اور عباد اللہ (1) یہ حدیث حسن ہے اس آیت میں بھی یہی بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہیں روزی دیتا ہے پس عبادت بھی اسی کی کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ عبادت میں توحید باری تعالیٰ کا پورا خیال رکھنا چاہیے کسی اور کی عبادت نہ کرنی چاہیے ہر ایک عبادت کے لائق صرف وہی ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ نے اللہ تعالیٰ کے وجود پر بھی اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ اور فی الواقع یہ آیت اللہ تعالیٰ کے وجود پر بہت بڑی دلیل ہے زمین اور آسمان کی مختلف شکل وصورت مختلف رنگ مختلف مزاج اور مختلف نفع کی موجودات ان میں سے ہر ایک کا نفع بخش ہونا اور خاص حکمت کا حامل ہونا ان کے خالق کے وجود کا اور اس کی عظیم الشان قدرت' حکمت' زبردست سطوت اور سلطنت کا ثبوت ہے۔

کسی بدوی سے پوچھا گیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی موجودگی کی کیا دلیل ہے؟ تو اس نے کہا "يَا سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّ الْبَعْرَ لَيَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ وَاِنَّ اَثَرَ الْاَقْدَامِ لَتَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ فَسَمَاءٌ ذَاتُ اَبْرَاجٍ وَاَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ وَبِحَارٌ ذَاتُ اَمْوَاجٍ اَلَا يَدُلُّ ذٰلِكَ عَلٰى وُجُوْدِ اللَّطِيْفِ الْخَبِيْرِ" یعنی مینگنی سے اونٹ معلوم ہو سکے اور پاؤں کے نشان زمین پر دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ کوئی آدمی گیا ہے تو کیا یہ برجوں والا آسمان یہ راستوں والی زمین یہ موجیں مارنے والے سمندر اللہ تعالیٰ باریک بین اور باخبر کے وجود پر دلیل نہیں ہو سکتے؟ (2)

حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے ہارون رشید نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے آپ نے فرمایا زبانوں کا مختلف ہونا' آوازوں کا جداگانہ ہونا' نغموں کا الگ ہونا' ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہے۔

---

(1) [صحیح: مسند احمد (٤/١٣٠۔ ٢٠٢) طیالسی (١١٦١۔ ١١٦٢) ترمذی: کتاب الامثال: باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصوم والصدقۃ (٢٨٦٣) طبرانی کبیر (٣٢٤/٣) ابو یعلی (١٥٧١) ابن خزیمہ (١٨٩٥) ابن حبان (الموارد ۔ ٦٢٣٣) مستدرك حاکم (١/١١٧'١١٨)] امام ترمذیؒ نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح ترمذی (٢٢٩٨) صحیح الترغیب (٥٥٢)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

(2) [تفسیر الفخر الرازی (المعروف بہ "مفاتیح الغیب")، (٢/٩١)]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے بھی یہی سوال ہوتا ہے تو آپ جواب دیتے ہیں چھوڑو میں کسی اور سوچ میں ہوں۔ لوگوں نے مجھ سے کہا کہ ایک بہت بڑی کشتی جس میں طرح طرح کی تجارتی چیزیں ہیں نہ کوئی اس کا نگہبان ہے نہ چلانے والا ہے باوجود اس کے وہ برابر آ جا رہی ہے اور بڑی بڑی موجوں کو خود بخود چیرتی پھاڑتی گذر جاتی ہے ٹھہرنے کی جگہ پر ٹھہر جاتی ہے چلنے کی جگہ چلتی رہتی ہے نہ اسکا کوئی ملاح ہے نہ منتظم ہے۔ سوال کرنے والے دہریوں نے کہا آپ کس سوچ میں پڑ گئے کوئی عقلمند ایسی بات کہہ سکتا ہے کہ اتنی بڑی کشتی اتنے بڑے نظام کے ساتھ تلاطم والے سمندر میں آئے جائے اور کوئی اس کا چلانے والا نہ ہو آپ نے فرمایا افسوس تمہاری عقلوں پر ایک کشتی تو بغیر چلانے والے کے نہ چل سکے لیکن یہ ساری دنیا آسمان وزمین کی سب چیزیں ٹھیک اپنے کام پر لگی رہیں اور ان کا مالک حاکم خالق کوئی نہ ہو؟ یہ جواب سن کر وہ لوگ ہکا بکا ہو گئے اور حق معلوم کر کے مسلمان ہو گئے۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی یہی سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ توت کے پتے ایک ہی ہیں ایک ہی ذائقہ کے ہیں کیڑے اور شہد کی مکھی اور گائیں بکریاں ہرن وغیرہ سب اس کو چباتے کھاتے اور چرتے چگتے ہیں اسی کو کھا کر ریشم کا کیڑا ریشم تیار کرتا ہے مکھی شہد بناتی ہے' ہرن میں مشک پیدا ہوتا ہے اور گائیں بکریاں مینگنیاں دیتی ہیں۔ کیا یہ اس امر کی صاف دلیل نہیں کہ ایک پتے میں یہ مختلف خواص پیدا کرنے والا کوئی ہے؟ اور اسی کو ہم اللہ تبارک وتعالیٰ مانتے ہیں وہی موجد اور صانع ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی ایک مرتبہ وجود باری تعالیٰ پر دلیل طلب کی گئی تو آپ نے فرمایا۔ سنو یہاں ایک نہایت مضبوط قلعہ ہے جس میں کوئی دروازہ نہیں نہ کوئی راستہ ہے بلکہ سوراخ تک نہیں باہر سے چاندی کی طرح چمک رہا ہے اور اندر سے سونے کی طرح دمک رہا ہے اوپر نیچے دائیں بائیں چاروں طرف سے بالکل بند ہے ہوا تک اس میں نہیں جا سکتی اچانک اسکی ایک دیوار گرتی ہے اور ایک جاندار آنکھوں کانوں والا خوبصورت شکل اور پیاری بولی والا چلتا پھرتا نکل آتا ہے۔ بتاؤ اس بند اور محفوظ مکان میں اسے پیدا کرنے والا کوئی ہے یا نہیں؟ اور وہ ہستی انسانی ہستیوں سے بالاتر اور اس کی قدرت غیر محدود ہے یا نہیں؟ آپ کا مطلب یہ تھا کہ انڈے کو دیکھو چاروں طرف سے بند ہے پھر اس میں پروردگار خالق یکتا جاندار بچہ پیدا کر دیتا ہے۔ یہی دلیل ہے اللہ کے وجود پر اور اس کی توحید پر۔

حضرت ابونواس رحمہ اللہ سے جب یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا آسمان سے بارش برسنا' اس سے درختوں کا پیدا ہونا اور ان ہری ہری شاخوں پر خوش ذائقہ میووں کا لگنا ہی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی واحدانیت کی کافی دلیل ہے۔

ابن المعتز رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ افسوس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی تکذیب پر لوگ کیسے دلیر ہو جاتے ہیں حالانکہ ہر ہر چیز اس پروردگار کی موجود اور لاشریک ہونے پر گواہ ہے۔

بزرگوں کا مقولہ ہے کہ آسمانوں کو دیکھو ان کی بلندی ان کی وسعت' ان کے چھوٹے بڑے چمکیلے اور روشن ستاروں پر نظریں ڈالو۔ ان کے چمکنے دمکنے ان کے چلنے پھرنے' ٹھہر جانے' ظاہر ہونے اور چھپ جانے کا مطالعہ

کرو۔ پھر سمندروں کو دیکھو جو موجیں مارتے ہوئے زمین کو گھیرے ہوئے ہیں۔ پھر اونچے اونچے مضبوط پہاڑوں کو دیکھو جو زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور اسے ہلنے نہیں دیتے' جن کے رنگ' جن کی صورتیں مختلف ہیں۔ قسم قسم کی دوسری مخلوقات پر نظر ڈالو۔ ادھر سے ادھر پھر جانے والی کھیتیوں اور باغوں کو شاداب کرنے والی خوشنما نہروں کو دیکھو۔ کھیتیوں' باغوں کی سبزیوں اور ان کے طرح طرح کے پھل پھول مزے مزے کے میووں پر غور کرو زمین ایک پانی ایک' لیکن شکلیں' صورتیں' خوشبوئیں' رنگ' ذائقہ' فائدہ الگ الگ۔ کیا یہ تمام مصنوعات تمہیں نہیں بتاتیں کہ ان کا صانع کوئی ہے؟ کیا یہ تمام موجودات بآواز بلند نہیں کہہ رہیں کہ ان کا موجد کوئی ہے؟ کیا یہ ساری مخلوق اپنے خالق کی ہستی اس کی ذات اور اسکی توحید پر دلالت نہیں کرتی۔ یہ ہیں وہ زوردار دلائل جو اللہ جل وعلا نے اپنی ذات کے منوانے کے لیے ہرنگاہ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں جو اس کی زبردست قدرتوں' اس کی پرزور حکمتوں' اس کی لاثانی رحمتوں' اس کے بے نظیر انعاموں' اس کے لازوال احسانوں پر دلالت کرنے کے لیے کافی وافی ہیں۔

ہم اقرار کرتے ہیں کہ نہ اس کا کوئی پالنے والا ہے' نہ اس کے سوا کوئی پیدا کرنے اور حفاظت کرنے والا' نہ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہ اس کے سوا کوئی مسجود لاشک۔ ہاں دنیا کے لوگو! سن لو میرا توکل اور بھروسا اسی پر ہے میری انابت اور التجا اسی کی طرف ہے' میرا جھکنا اور پست ہونا اسی کے سامنے ہے' میری تمناؤں کا مرکز' میری امیدوں کا آسرا' میرا ماویٰ' ملجا وہی ایک ہے اس کے دست رحمت کو تکتا ہوں اور اسی کا نام جپتا ہوں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا
شُهَدَاۗءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا
النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ښ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

ہم نے جو کچھ اپنے بندے پر اتارا ہے اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو تم اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ' تمہیں اختیار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو ○ پس اگر تم نے نہ کیا اور تم ہرگز نہیں کر سکتے تو (اسے سچا مان کر) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر۔ جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ○

صدقِ رسالت کا ثبوت: توحید کے بعد اب نبوت کی تصدیق کی جا رہی ہے کفار مکہ کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے جو قرآن پاک اپنے بندے حضرت محمد ﷺ پر اتارا ہے اسے اگر تم ہمارا کلام نہیں مانتے تو تم اور تمہارے مددگار سب مل کر پورا قرآن نہیں صرف ایک سورت تو اس جیسی بنا لاؤ۔ جب تم ایسا نہیں کر سکتے اور اس سے عاجز ہو تو پھر اس قرآن کے کلام اللہ ہونے میں کیوں شک کرتے ہو؟ "شُهَدَآءَ" سے مراد مددگار اور شریک ہیں [1] جو ان کی مدد اور موافقت کیا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہیں تم اپنا معبود بنا رکھا ہے انہیں بھی بلا لو اور ان سے بھی مدد چاہو پھر اس جیسی ایک سورت ہی تو بنا لاؤ۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تم اپنے حاکموں اور اپنے زبان دان فصیح و بلیغ لوگوں سے بھی مدد لے لو۔ [2] قرآن پاک کے اس معجزے کا اظہار اور ایسا انداز خطاب کئی جگہ

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۳۷۶)] [2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۸۵)]

ہے سورہ قصص میں ہے ﴿فَاْتُوْا بِكِتَابٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ (القصص/۴۹) یعنی اگر تم سچے ہو تو ان دونوں سے (یعنی توریت وقرآن سے) زیادہ ہدایت والی کوئی اور اللہ کی کتاب لاؤ تو میں بھی اس کی تابعداری کروں گا۔ سورہ سبحان میں فرمایا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (الاسراء/۸۸) یعنی اگر تمام جنات اور انسان جمع ہو کر اور ہر ایک دوسرے کی مدد کے ساتھ یہ چاہیں کہ اس جیسا قرآن بنائیں تو بھی ان کے امکان میں نہیں۔ سورۂ ہود میں فرمایا ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيَاتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ (ھود/۱۳) یعنی کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ قرآن کو خود اس پیغمبر نے گھڑ لیا تم کہو کہ اگر تم سچے ہو تو تم سب مل کر اور اللہ کے سوا جنہیں تم بلا سکتے ہو بلا کر اس جیسی دس سورتیں ہی بنا لاؤ۔ سورہ یونس میں ہے ﴿وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ﴾ (یونس ۳۷۔۳۸) یعنی یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی طرف سے گھڑا ہوا نہیں بلکہ یہ اگلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور کتاب مفصل ہے جس کے اللہ کا کلام ہونے میں کوئی شک نہیں جو رب العالمین کی طرف سے ہے کیا یہ لوگ اسے خود ساختہ کہتے ہیں ان سے کہو کہ اللہ کے سوا ہر شخص کو بلا کر (اس قرآن کی سینکڑوں سورتوں میں سے) ایک چھوٹی سی سورت جیسی سورت تو بنا لاؤ تا کہ تمہارا سچ ظاہر ہو۔

یہ تمام آیتیں مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔ اور اہل مکہ کو اس کے مقابلہ میں عاجز ثابت کر کے پھر مدینہ شریف میں بھی اس مضمون کو دوہرایا گیا اوپر کی آیت مِثْلِہٖ کی ضمیر کو بعض نے قرآن کی طرف لوٹایا ہے یعنی کوئی سورت اس قرآن جیسی لاؤ۔ بعض نے یہ ضمیر محمد ﷺ کی طرف لوٹائی ہے یعنی آپ جیسا کوئی امی ایسا ہو ہی نہیں سکتا ہے کہ کچھ پڑھا ہوا نہ ہونے کے باوجود وہ کلام کہے جس کا مثل کسی سے نہ بن سکے۔ لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ مجاہدؒ قتادہ رحمۃ اللہ علیہما عمرؓ ابن مسعودؓ ابن عباس رضی اللہ عنہم حسن بصری اور اکثر محققین کا یہی قول ہے امام ابن جریر طبری زمخشری رازی رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اسی کو پسند کیا ہے اس کی ترجیح کی وجوہات بہت سی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں سب کو ڈانٹ ڈپٹ بھی ہے اجتماعی اور الگ الگ بھی۔ خواہ وہ امی اور ان پڑھ ہوں یا اہل کتاب اور پڑھے لکھے ہوں اس میں اس معجزے کا کمال ہے اور بہ نسبت اس کے کہ صرف ان پڑھ لوگوں کو عاجز کیا جائے اس میں زیادہ مبالغہ ہے پھر دس سورتوں کا مطالبہ کرنا اس کی مثل نہ لا سکنے کی پیشین گوئی کرنا بھی اسی حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے نہ کہ ذات رسول اللہ ﷺ پس اس عام اعلان سے جو بار بار کیا گیا اور ساتھ ہی پیشین گوئی بھی کر دی گئی کہ یہ لوگ اس پر قادر نہیں۔ مکہ میں اور مدینہ میں بارہا اس کا اعادہ کیا گیا اور وہ لوگ جن کی مادری زبان عربی تھی جنہیں اپنی فصاحت اور بلاغت پر ناز تھا جو لوگ آپ کی اور آپ کے دین کی دشمنی پر ادھار کھائے بیٹھے تھے وہ درحقیقت اس سے عاجز آ گئے نہ پورے قرآن کا جواب دے سکے نہ دس سورتوں کا، نہ ایک سورت کا۔

پس ایک معجزہ تو یہ ہے کہ اس جیسی ایک چھوٹی سی سورت بھی وہ نہ بنا سکے دوسرا معجزہ یہ ہے کہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی کہ یہ ہرگز اس جیسا نہیں بنا سکتے چاہے سب جمع ہو جائیں اور قیامت تک محنت کر لیں۔ پس ایسا ہی ہوا نہ تو اس زمانہ میں کسی کی یہ جرات ہوئی نہ اس کے بعد سے آج تک اور نہ قیامت تک کسی سے یہ ہو سکے گا۔ اور بھلا کیسے ہو سکتا؟ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل ہے اسی طرح اس کا کلام بھی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ قرآن پاک کو بیک نظر دیکھنے سے ہی اس کے ظاہری اور باطنی لفظی اور معنوی ایسے ایسے کمالات ظاہر ہوتے ہیں جو مخلوق کے بس کے نہیں خود رب العالمین فرماتا ہے: ﴿الٓرٰ کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ﴾ (ھود/۱) الخ یعنی اس کتاب کی آیتیں جو حکمت والے ہر طرح کی خبریں جاننے والے اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے محکم مضبوط اور مفصل الگ الگ ہیں۔ پس الفاظ محکم اور معانی مفصل یا الفاظ مفصل اور معانی محکم پس قرآن اپنے الفاظ میں اور اپنے مضامین میں بے نظیر ہے جس کے مقابلے، معارضے اور مثل سے دنیا عاجز اور بے بس ہے۔

اس پاک کلام میں اگلی خبریں جو دنیا سے پوشیدہ تھیں وہ ہو بہو بیان کی گئیں آنے والے امور کے تذکرے کیے گئے جو لفظ بہ لفظ پورے اترے۔ تمام بھلائیوں کا حکم تمام برائیوں سے ممانعت اس میں ہے۔ سچ ہے ﴿وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا﴾ (الانعام/۱۱۵) یعنی خبروں میں صداقت اور احکام میں عدل تیرے رب کے کلام میں پورا پورا ہے۔ پاکیزہ قرآن تمام تر حق وصداقت وہدایت سے پر ہے نہ اس میں واہی تواہی باتیں ہیں نہ ہنسی مذاق نہ کذب وافترا جو شاعروں کے کلام میں عموماً پایا جاتا ہے بلکہ ان کے اشعار کی قدر وقیمت ہی اس پر ہے مقولہ مشہور ہے کہ "اَعۡذَبُہٗ اَکۡذَبُہٗ" جوں جھوٹ زیادہ اتنا ہی مزیدار۔ تم دیکھو گے کہ لمبے لمبے پرزور قصیدے مبالغہ اور کذب آمیز یا تو عورتوں کی تعریف وتوصیف میں ہوں گے یا گھوڑوں کی اور شراب کی ستائش میں ہوں گے یا کسی انسان کی بڑھی چڑھی مدح وتعریف میں ہوں گے یا اونٹنیوں کی آرائش وزیبائش یا بہادری کے مبالغہ آمیز گیتوں یا لڑائیوں کی چالبازیوں یا ڈر خوف کے خیالی منظروں کے بیان میں ہوں گے جن سے کوئی فائدہ نہیں۔ نہ دین کا نہ دنیا کا صرف شاعر کی زبان دانی اور اس کی قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے نہ اخلاق پر ان سے کوئی عمدہ اثر نہ اعمال پر۔ پھر نفس مضمون کے بھی پورے قصیدے میں بمشکل دو ایک شعر ہوتے ہیں۔ باقی سب بھرتی کے اور ادھر ادھر کی لایعنی اور فضول بکواس۔

برخلاف اس کے قرآن پاک پر نظر ڈالو تو دیکھو گے کہ ایک ایک لفظ فصاحت وبلاغت سے دین ودنیا کے نفع سے، خیر وبرکت سے پر ہے۔ پھر کلام کی ترتیب وتہذیب الفاظ کی بندش، عبارت کی روانی، معانی کی نورانیت، مضمون کی پاکیزگی سونے پر سہاگہ ہے۔ اس کی خبروں کی حلاوت، اس کے بیان کردہ واقعات کی سلاست مردہ دلوں کی زندگی ہے۔ اس کا اختصار کمال کا اعلیٰ نمونہ اور اس کی تفصیل معجزے کی جان ہے اس کا کسی چیز کو دوہرانا قند مکرر کا مزہ دیتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سچے موتیوں کی بارش برس رہی ہے۔ بار بار پڑھو دل نہ اکتائے، مزے لیتے جاؤ اور ہر وقت نیا مزہ پاؤ۔ مضامین سمجھتے جاؤ اور ختم نہ ہوں۔ یہ قرآن پاک کا ہی خلاصہ ہے اس چاشنی کا ذائقہ

اس مٹھاس کا مزہ' کوئی اس سے پوچھے جنہیں عقل وحواس علم وفضل کا کچھ حصہ قدرت نے عطا فرمایا۔ اس کی تنذیر ودھمکاوا تعذیب اور پکڑ دھکڑ کا بیان مضبوط پہاڑوں کو ہلا دے۔ انسانی دل کیا ہیں اس کے وعدے اور خوشخبریاں' نعمتوں اور رحمتوں کا بیان دلوں کی پژ مردہ کلی کو کھلا دینے والا' شوق وتمنا کے دبے جذبات کو ابھار دینے والا جنتوں اور راحتوں کے پیارے پیارے مناظر کو آنکھوں کے سامنے لانے والا ہے۔ دل کھل جاتے ہیں کان لگ جاتے ہیں اور آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

رغبت دیتے ہوئے وہ فرماتا ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ (السجدہ/ ۱۷) الخ کوئی کیا جانے کہ اس کے نیک اعمال کے بدلے اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان چپکے چپکے تیار کیا جا رہا ہے۔ فرماتا ہے: ﴿وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ﴾ (الزخرف/ ۷۱) الخ اس دائمی جنت میں ہر وہ چیز ہے جو دل کو بھائے اور آنکھوں میں اتر جائے۔ ڈراتے اور دھمکاتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿أَفَأَمِنتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ﴾ (الاسراء/ ۶۸) فرمایا: ﴿ءَأَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمُ الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ۝ أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرِ﴾ (الملک ۱۶۔۱۷) کیا تم اپنے دھنسائے جانے یا آسمان سے پتھر برسائے جانے سے نڈر ہو گئے ہو؟ کیا آسمانوں والا اس پر قادر نہیں؟ اسے محض دھمکی ہی نہ سمجھو بلکہ اس کی حقیقت عنقریب تم پر کھل جائے گی۔ زجر وتوبیخ ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے ﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ﴾ (العنکبوت/ ۴۰) ایک ایک کو ہم نے اس کی بدکرداریوں میں پکڑ لیا۔ بطور وعظ ونصیحت بیان ہوتا ہے ﴿أَفَرَأَيْتَ إِن مَّتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ۝ ثُمَّ جَاءَهُم مَّا كَانُوا يُوعَدُونَ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يُمَتَّعُونَ﴾ (الشعراء ۲۰۵۔۲۰۷) اگر ہم نے کچھ سال انہیں فائدہ بھی دیا تو کیا ہوا؟ آخر وعدے کی گھڑی آ پہنچی اور اس جاہ وجلال نے کوئی نفع نہ بخشا۔ غرض کوئی کہاں تک بیان کرے جس مضمون کا ذکر کیا۔ اسے کمال تک پہنچا کر چھوڑا اور طرح طرح کی فصاحت وبلاغت' حلاوت وحکمت سے معمور کر دیا احکام کے حکم اور روک ٹوک کو دیکھئے ہر حکم اچھائی بھلائی نفع اور پاکیزگی کا جامع ہے۔ ہر ممانعت قباحت رذالت ونارت اور خباثت کی قاطع ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ اسلاف امت کا قول ہے کہ جب قرآن میں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ آئے تو کان لگا دو یا تو کسی اچھائی کا حکم ہوگا یا کسی برائی سے منع کیا جائے گا خود پروردگار عالم فرماتا ہے ﴿يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف/ ۱۵۷) الخ یعنی بھلائیوں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے پاکیزہ چیزیں حلال قرار دیتا ہے خبیث چیزیں حرام کرتا ہے وہ بوجھل بیڑیاں جو پاؤں میں تھیں وہ سخت طوق جو گلوں میں تھے اتار پھینکتا ہے الخ قیامت کے بیان کی آیتیں ہیں کہ ہولناک مناظر جنت

ودوزخ کا بیان رحمتوں اور زحمتوں کا پورا پورا وصف۔ اولیاء اللہ کے لیے طرح طرح کی نعمتیں۔ دشمنان اللہ کے لیے طرح طرح کے عذاب۔ کہیں بشارت ہے۔ کہیں ڈراوا ہے۔ کہیں نیکیوں کی طرف رغبت ہے۔ کہیں بدکاریوں سے ممانعت ہے۔ کہیں دنیا کی طرف سے زہد کرنے کی، کہیں آخرت کی طرف رغبت کرنے کی تعلیم ہے۔ یہی وہ تمام آیتیں ہیں جو راہ راست دکھاتی ہیں اور بہتر رہنمائی کرتی ہیں اللہ کی پسندیدہ شریعت کی طرف جھکاتی ہیں اور دلوں کو جلا دیتی ہیں اور شیطانی دروازوں کو بند کر دیتی ہیں اور برے اثرات کو زائل کرتی ہیں۔

صحیح بخاری و مسلم میں بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر نبی کو ایسے معجزے دئے گئے کہ جنہیں دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے اور میرا معجزہ اللہ کی وحی یعنی قرآن پاک ہے اس لیے مجھے امید ہے کہ میرے تابعدار بہ نسبت اور نبیوں کے بہت زیادہ ہوں گے [1] (اس لیے کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے ساتھ چلے گئے لیکن حضور ﷺ کا یہ معجزہ قیامت تک باقی رہے گا۔ لوگ اسے دیکھتے جائیں گے اور اسلام میں داخل ہوتے جائیں گے) حضور ﷺ کا یہ فرمان کہ میرا معجزہ وحی ہے جو مجھ کو دی گئی ہے کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو اس کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اور قرآن کریم مجھی کو ملا ہے جو اپنے معارضے اور مقابلے میں تمام دنیا کو عاجز کر دینے والا ہے۔ بخلاف دوسری آسمانی کتابوں کے وہ اکثر علماء کے نزدیک اس وصف سے خالی ہیں۔ واللہ اعلم۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت آپ کی صداقت اور دین اسلام کی حقانیت پر اس معجزے کے علاوہ اس قدر دلائل ہیں جو گنے بھی نہیں جاسکتے۔ للہ الحمد والمنۃ۔ بعض متکلمین نے قرآن کریم کے اعجاز کو ایسے انداز سے بیان کیا ہے جو اہل سنت کے اور معتزلہ کے قول پر مشترک ہے وہ کہتے ہیں کہ یا تو وہ قرآن فی نفسہ معجزہ ہے جو انسان کے امکان میں ہی نہیں کہ اس جیسا بنالا سکے انہیں اس کا معارضہ کرنے کی قدرت وطاقت ہی نہیں۔ یا یہ کہ گو اس کا معارضہ ممکن ہے اور انسانی طاقت سے باہر نہیں لیکن باوجود اس کے انہیں معارضہ کا چیلنج دیا جاتا ہے اس لیے کہ وہ عداوت اور دشمنی میں بڑھے ہوئے ہیں دین حق کو مٹانے، ہر وقت ہر طاقت کے خرچ کرنے اور ہر چیز کے برباد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن تاہم قرآن کا معارضہ اور مقابلہ ان سے نہیں ہوسکتا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اللہ کی جانب سے ہے اگر قدرت وطاقت ہو بھی تو بھی وہ انہیں روک دیتا ہے اور وہ قرآن کی مثل پیش کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ گو یہ پچھلی وجہ اتنی پسندیدہ نہیں تاہم اگر اسے بھی مان لیا جائے تو اس سے بھی قرآن کا معجزہ ثابت ہے جو بطریق تنزل حمایت حق اور مناظرے کی خاطر صلاحیت رکھتا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے بھی چھوٹی چھوٹی سورتوں کے سوال کے جواب میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

﴿ وَقُوْدُ ﴾ کے معنی ایندھن کے ہیں جس سے آگ جلائی جائے۔ جیسے چپٹیاں لکڑیاں وغیرہ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے ﴿ وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴾ (الجن / ١٥) ظالم لوگ جہنم کی لکڑیاں ہیں اور جگہ فرمایا تم اور تمہارے معبود جو اللہ کے سوا ہیں جہنم کی لکڑیاں ہیں تم سب اس میں وارد ہوگے اگر وہ سچے معبود ہوتے تو

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن: باب کیف نزل الوحی واول ما نزل (٤٩٨١) صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد ﷺ (١٥٢)]

وہاں وارد نہ ہوتے دراصل یہ سب کے سب اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں [1] اور **حجارہ** کہتے ہیں پتھر کو یہاں مراد گندھک کے سخت سیاہ اور بڑے بڑے اور بد بودار پتھر ہیں جن کی آگ بہت تیز ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ان پتھروں کو زمین وآسمان کی پیدائش کے ساتھ ہی آسمان اول پر پیدا کیا گیا ہے (ابن جریر، ابن ابی حاتم، مستدرک حاکم) ابن عباس، ابن مسعود اور چند اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے سدی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ جہنم میں یہ سیاہ گندھک کے پتھر بھی ہیں جن کی سخت آگ سے کافروں کو عذاب کیا جائے گا۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان پتھروں کی بدبو مردار کی بو سے بھی زیادہ ہے۔ محمد بن علی اور ابن جریج رحمہما اللہ بھی کہتے ہیں کہ مراد گندھک کے بڑے بڑے اور سخت پتھر ہیں۔ بعض نے کہا ہے مراد وہ پتھر جن کی مورتیاں بنائی جاتی ہیں اور پھر ان کی پرستش کی جاتی تھی جیسے اور جگہ ہے ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ (الانبیاء/ ۹۸) الخ تم اور تمہارے وہ معبود جو اللہ کے سوا ہیں جہنم کی لکڑیاں ہیں قرطبی اور رازی رحمہما اللہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ گندھک کے پتھر کو آگ لگنا کوئی نئی بات نہیں اس لیے مراد یہی اصنام و انداد بت اور وہ پتھر جو کسی شکل میں بھی اللہ کے سوا پوجے جاتے ہیں لیکن یہ وجہ کوئی قوی وجہ نہیں اس لیے کہ جب آگ گندھک کے پتھروں سے سلگائی جائے تو ظاہر ہے کہ اس کی تیزی اور حرارت معمولی آگ سے بہت زیادہ ہوگی اس کا بھڑکنا جلنا سوزش اور شعلے بھی بہت زیادہ ہوں گے علاوہ اس کے پھر سلف سے بھی اس کی تفسیر یہی مروی ہے اسی طرح ان پتھروں میں آگ کا لگنا بھی ظاہر ہے اور آیت کا مقصود آگ کی تیزی اور اس کی سوزش کا بیان کرنا ہے اور اس کے بیان کے لیے بھی یہاں پتھر سے مراد گندھک کے پتھر لینا زیادہ مناسب ہے تاکہ وہ آگ تیز ہو اور اس سے بھی عذاب میں سختی ہو قرآن کریم میں ہے ﴿كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيْرًا﴾ (الاسراء/ ۹۷) جہاں شعلے ہلکے ہوئے کہ ہم نے اور بھڑکا دیا۔ ایک حدیث میں ہے ہر موذی آگ میں ہے لیکن یہ حدیث محفوظ اور معروف نہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ ہر وہ شخص جو دوسروں کو ایذاء دے جہنمی ہے دوسرے یہ کہ ہر ایذاء دہندہ چیز جہنم کی آگ میں موجود ہوگی جو جہنمیوں کو عذاب دے گی۔ ﴿اُعِدَّتْ﴾ یعنی تیار کی گئی سے مراد بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ آگ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مراد پتھر ہوں یعنی وہ پتھر جو کافروں کے لیے تیار کیے گئے ہیں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے اور فی الحقیقت دونوں معنی میں کوئی اختلاف نہیں اس لیے کہ پتھروں کا تیار کیا جانا آگ کے جلانے کے لیے ہے لہٰذا آگ کی تیاری کے لیے پتھروں کا تیار کیا جانا ضروری ہے۔ پس دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہر وہ شخص جو کفر پر ہو اس کے لیے وہ آگ تیار ہے۔ [2] اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ جہنم اب موجود اور پیدا شدہ ہے کیونکہ "اعدت" کا لفظ ہی اس کی دلیل میں آیا ہے اور بہت سی حدیثیں بھی ہیں۔

ایک مطول حدیث میں ہے جنت اور دوزخ میں جھگڑا ہوا الخ، [3] دوسری حدیث میں ہے جہنم نے اللہ تعالیٰ

---

[1] [سورۃ الانبیآء: آیت ۹۸۔۹۹]

[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۳۸۳)]

[3] [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب التفسیر (۴۸۵۰) صحیح مسلم: کتاب الجنۃ (۲۸۴۶)]

سے دو سانس لینے کی اجازت چاہی اور اسے سردی میں ایک سانس لینے اور گرمی میں دوسرا سانس لینے کی اجازت دے دی گئی۔ [1] تیسری حدیث میں ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں ہم نے ایک مرتبہ بڑے زور کی ایک آواز سنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یہ کس چیز کی آواز ہے آپ نے فرمایا ستر سال پہلے ایک پتھر جہنم میں پھینکا گیا تھا آج وہ تہ کو پہنچا۔ [2] چوتھی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورج گرہن کی نماز پڑھتے ہوئے جہنم کو دیکھا۔ [3] پانچویں حدیث میں ہے کہ آپ نے شب معراج میں جہنم کو اور اس میں عذابوں کو ملاحظہ فرمایا اسی طرح اور بہت سی صحیح متواتر حدیثیں مروی ہیں معتزلہ اپنی جہالت کی وجہ سے انہیں نہیں مانتے قاضی اندلس منذر بن سعید بلوطی نے بھی ان سے اتفاق کیا ہے۔

فائدہ: یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں اور سورۂ یونس میں جو کہا گیا ہے کہ ایک ہی سورت اس کے مانند لاؤ اس میں ہر چھوٹی بڑی آیت شامل ہے اس لیے عربیت کے قاعدے کے مطابق جو اسم نکرہ ہو اور شرط کے طور پر لایا گیا ہو وہ عمومیت کا فائدہ دیتا ہے جیسے کہ نکرہ نفی کی تحت میں استغراق کا فائدہ دیتا ہے پس لمبی سورتوں اور چھوٹی سورتوں سب میں اعجاز ہے اور اس بات پر سلف و خلف کا اتفاق ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ سورت کا لفظ سورہ کوثر اور سورۃ العصر اور سورہ ﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ (الکافرون / ١) جیسی چھوٹی سورتوں پر بھی مشتمل ہے اور یہ بھی یقین ہو کہ اس جیسی یا اس کے قریب قریب کسی سورت کا بنا لینا ممکن ہے تو اسے انسانی طاقت سے خارج کہنا نری ہٹ دھرمی اور بے جا طرف داری ہے تو ہم جواب دیں گے کہ ہم نے اس کے معجزہ نما ہونے کے دو طریقے بیان کر کے دوسرے طریقہ کو اسی لیے پسند کیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اگر یہ چھوٹی سورتیں بھی فصاحت و بلاغت میں اسی پایہ کی ہیں کہ وہ معجزہ کہی جا سکیں اور ان کا تعارض ممکن نہ ہو تو مقصود حاصل ہو گیا اور اگر یہ سورتیں ایسی نہیں تو بھی ہمارا مقصود حاصل ہے اس لیے کہ ان جیسی سورتوں کو بنانے کی انسانی قدرت ہونے پر بھی سخت دشمنی اور زبردست کوششوں کے باوجود ناکام رہنا ہے۔ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ قرآن مع اپنی چھوٹی چھوٹی سورتوں کے سراسر معجزہ ہے یہ تو رازی کا کہنا ہے۔ لیکن صحیح قول یہ ہے کہ قرآن پاک کی ہر بڑی چھوٹی سورت فی الواقع معجزہ ہے اور انسان اس کی مانند بنانے سے محض عاجز اور بالکل بے بس ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر لوگ غور و تدبر سے عقل و ہوش سے سورۂ ﴿وَالْعَصْرِ﴾ کو سمجھ لیں تو انتہائی کافی ہے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ جب وفد میں شامل مسیلمہ کذاب کے پاس گئے (تب یہ خود بھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) تو مسیلمہ نے ان سے

---

[1] [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب مواقیت الصلوة: باب الابراد بالظهر فی شدة الحر (٥٣٧) صحیح مسلم: کتاب المساجد: باب استحباب الابراد بالظهر شدة الحر (٦١٧)]

[2] [**صحیح**: صحیح مسلم: کتاب الجنة: باب جهنم اعاذنا الله منها (٢٨٤٤)]

[3] [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب الکسوف: باب الصلوة الکسوف جماعة (١٠٥٢) صحیح مسلم: کتاب الکسوف: باب ما عرض علی النبی فی الصلوة الکسوف (٩٠٧)]

پوچھا کہ تم مکہ سے آرہے ہو بتاؤ تو آج کل کوئی تازہ وحی بھی نازل ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا ابھی ابھی ایک مختصر سی سورت نازل ہوئی ہے جو بے حد فصیح و بلیغ اور جامع اور مانع ہے پھر سورۃ العصر پڑھ کر سنائی تو مسیلمہ نے کچھ دیر سوچ کر اس کے مقابلہ میں کہا۔ مجھ پر بھی ایک ایسی ہی سورت نازل ہوئی ہے انہوں نے کہا ہاں تم بھی سناؤ تو اس نے کہا "یَا وَبْرُ یَا وَبْرُ اِنَّمَا اَنْتَ اُذُنَان وَصَدْرٌ وَسَائِرُكَ حَقْرٌ فَقْرٌ" یعنی اے جنگلی چوہے اے جنگلی چوہے تیرا وجود سوائے دو کانوں اور سینے کے اور کچھ بھی نہیں باقی تو تو سراسر بالکل ناچیز ہے پھر فخریہ کہنے لگا کہ کہو اے عمرو کیسی کہی؟ انہوں نے کہا مجھ سے کیا پوچھتے ہو اسے تو تو خود جانتا ہے کہ یہ سراسر کذب و بہتان ہے بھلا کہاں یہ فضول کلام اور کہاں حکمتوں سے بھرپور وہ کلام؟

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ
كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ
مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵

ایمانداروں اور نیک عمل کرنے والوں کو ان جنتوں کی خوشخبریاں دو جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ جب کبھی پھلوں کی روزیاں دیئے جائیں گے تو کہیں گے یہ وہی ہے جو ہم اس سے پہلے دیئے گئے تھے اور ہم شکل لائے جائیں گے اور ان کے لیے بیویاں ہیں صاف ستھری اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ○

مومنوں کے لیے اجر عظیم اور بشارت: چونکہ پہلے کافروں اور دشمنان دین کی سزا عذاب اور رسوائی کا ذکر ہوا تھا اس لیے یہاں ایمانداروں اور نیک صالح لوگوں کی جزا ثواب اور سرخروئی کا بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کے مثانی ہونے کے ایک معنی یہ بھی ہیں جو صحیح تر قول بھی ہے کہ اس میں ہر مضمون تقابلی جائزہ کے ساتھ بیان ہوا ہے اس کا مفصل بیان بھی کسی مناسب جگہ آئے گا مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ ہی کفر کا۔ کفر کے ساتھ ایمان کا۔ نیکوں کے ساتھ بدوں کا۔ اور بدوں کے ساتھ نیکوں کا ذکر ضرور آتا ہے جس چیز کا بیان ہوتا ہے اس کے مقابلہ کی چیز کا بھی ذکر کر دیا جاتا ہے چاہے معنی میں ﴿مُتَشَابِه﴾ ہوں یہ دونوں لفظ قرآن کے اوصاف میں وارد ہوئے ہیں اسے مثانی بھی کہا گیا ہے اور متشابہ بھی فرمایا گیا ہے۔ جنتوں میں نہریں بہنا اس کے درختوں اور بالا خانوں کے نیچے بہنا ہے حدیث شریف میں ہے کہ نہریں بہتی ہیں لیکن گڑھا نہیں (1) اور حدیث میں ہے کہ نہر کوثر کے دونوں کناروں سچے موتیوں کے قبے ہیں اس کی مٹی مشک خالص ہے اور اس کی کنکریاں لؤلؤ اور جواہر ہیں۔ (2) اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی یہ نعمتیں عطا فرمائے وہ احسان کرنے والا اور بڑا رحیم ہے حدیث میں ہے جنت

---

(1) [صحيح موقوفا ضعيف مرفوعا: ابو نعيم فى الحلية (٦/٢٠٥) وفى صفة الجنة (٣١٦)] یہ روایت موقوفا صحیح ہے مرفوعا ضعیف ہے جیسا کہ علامہ ابو اسحاق حوینی نے فرمایا ہے۔ [الفتاوى الحديثية (٤٥١/١)]

(2) [صحيح: صحيح بخارى: كتاب الرقاق: باب فى الحوض (٦٥٨١)]

کی نہریں مشکی پہاڑوں کے نیچے سے جاری ہوتی ہیں (ابن ابی حاتم) [1] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی یہ مروی ہے جنتیوں کا یہ قول کہ پہلے بھی ہم کو یہ میوے دیئے گئے تھے اس سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں بھی یہ میوے ہمیں ملے تھے صحابہ رضی اللہ عنہم اور ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اس کی تائید کی ہے بعض کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے یعنی سابقہ کل بھی یہی دیئے گئے تھے یہ اس لیے کہیں گے کہ ظاہری صورت وشکل میں وہ بالکل مشابہ ہوں گے۔ یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک پیالہ آئے گا کھائیں گے پھر دوسرا آئے گا تو کہیں گے یہ تو ابھی کھایا ہے فرشتے کہیں گے کھایئے تو اگرچہ صورت شکل میں یکساں ہیں لیکن مزہ اور ہے۔ فرماتے ہیں جنت کی گھاس زعفران ہے اس کے ٹیلے مشک کے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت غلمان ادھر ادھر سے میوے لا لا کر پیش کر رہے ہیں وہ کھا رہے ہیں وہ پھر پیش کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں اسے تو ابھی کھایا ہے وہ جواب دیتے ہیں حضرت رنگ روپ ایک ہے لیکن ذائقہ اور ہی ہے چکھ کر دیکھئے کھاتے ہیں تو اور ہی لطف پاتے ہیں یہی معنی ہیں کہ ہم شکل لائے جائیں گے۔ دنیا کے میووں سے بھی اور نام شکل اور صورت میں بھی ملتے جلتے ہوں گے لیکن مزہ کچھ دوسرا ہی ہوگا۔ [2]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ صرف نام میں مشابہت ہے ورنہ کہاں یہاں کی چیز کہاں وہاں کی؟ یہاں تو فقط نام ہی ہے [3] عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ کا قول ہے دنیا کے پھلوں جیسے پھل دیکھ کر کہہ دیں گے کہ یہ تو دنیا میں کھا چکے ہیں مگر جب چکھیں گے تو لذت کچھ اور ہی ہوگی۔ وہاں جو بیویاں انہیں ملیں گی وہ گندگی، ناپاکی، حیض ونفاس، پیشاب، پاخانہ، تھوک، رینٹ، منی وغیرہ سے پاک صاف ہوں گی۔ [4]

حضرت حوا رضی اللہ عنہا بھی حیض سے پاک تھیں لیکن نافرمانی سرزد ہوتے ہی یہ بلا آ گئی [5] یہ قول سنداً غریب ہے ایک غریب مرفوع حدیث میں ہے کہ حیض پاخانہ تھوک رینٹ سے وہ پاک ہیں۔ [6] حاکم اس کو صحیح اور شرط شیخین پر بتلاتے ہیں لیکن یہ دعویٰ صحیح نہیں اس حدیث کے راوی عبدالرزاق بن عمر بزیعی ہیں جنہیں ابوحاتم البستی نے احتجاج کے قابل نہیں سمجھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں بلکہ حضرت قتادہ کا قول ہے واللہ اعلم۔ ان تمام نعمتوں کے ساتھ اس زبردست نعمت کو دیکھئے کہ نہ یہ نعمتیں فنا ہوں۔ نہ نعمتوں والے فنا ہوں نہ نعمتیں ان سے چھنیں نہ یہ نعمتوں سے

---

[1] [حسن صحیح: صحیح ابن حبان (۷۴۰۸) ابو نعیم فی صفة الجنة (۳۱۳) عقیلی (۳۲۶/۲) ابن ابی شیبہ (۹۶/۱۳) البیهقی فی البعث (۲۶۶)] شیخ البانیؒ نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ [صحیح الترغیب (۳۷۲۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ جبکہ حافظ زبیر علی زئی کی تحقیق کے مطابق اس کی سند اعمش کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے۔]

[2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۹۰/۱) ابن ابی شیبة (۹۶/۱۳) بیهقی (۲۶۷) عبد الرزاق (۲۰۸۷۳/۱۱)]

[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (۳۹۲/۱)]

[4] [تفسیر ابن جریر الطبری (۳۹۶/۱)]

[5] [تفسیر ابن جریر الطبری (۵۵۰)]

[6] [ابو نعیم فی صفة الجنة (۳۶۳) ابن حبان فی المجروحین (۱۶۰/۲)] یہ روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں تاہم قتادہ سے موقوفاً ثابت ہے۔ جیسا کہ امام ابن حبانؒ نے یہ وضاحت فرمائی ہے۔]

الگ کیسے جائیں۔ نہ موت ہے نہ خاتمہ ہے نہ آخر ہے نہ ٹوٹنا اور کم ہونا ہے اللہ رب العالمین جواد وکریم برورحیم سے التجا ہے کہ وہ مالک ہمیں بھی اہل جنت کے زمرے میں شامل کرے اور انہیں کے ساتھ ہمارا حشر کرے۔ آمین

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ
يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ
عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ
فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٢٧﴾

یقیناً اللہ تعالیٰ کسی مثال کے بیان کرنے سے نہیں شرماتا خواہ مچھر کی ہو یا اس سے بھی ہلکی چیز کی۔ ایماندار تو اسے اپنے رب کی جانب سے صحیح سمجھتے ہیں، اور کفار کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا مراد لی ہے۔ اسی کے ساتھ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اکثر لوگوں کو راہ راست پر لاتا ہے۔ اور گمراہ تو صرف فاسقوں کو ہی کرتا ہے ○ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے مضبوط عہد کو توڑ دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو جوڑنے کا حکم دیا ہے، انہیں توڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ○

اللہ تعالیٰ کی نظر میں دنیا: ابن عباس ابن مسعود اور چند اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ جب اوپر کی تین آیتوں میں منافقوں کی دو مثالیں بیان ہوئیں یعنی آگ اور پانی کی تو وہ کہنے لگے کہ ایسی ایسی چھوٹی مثالیں اللہ تعالیٰ ہرگز بیان نہیں کرتا۔ اس پر یہ دونوں آیتیں نازل ہوئیں۔ [1] حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب قرآن پاک میں مکڑی اور مکھی کی مثال بیان ہوئی تو مشرک کہنے لگے بھلا ایسی حقیر چیزوں کے بیان کی قرآن جیسی اللہ کی کتاب میں کیا ضرورت؟ تو جواباً یہ آیتیں اتریں [2] اور کہا گیا کہ حق کے بیان سے اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا خواہ وہ کم ہو یا زیادہ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مکہ میں اتری حالانکہ ایسا نہیں۔ واللہ اعلم۔ اور بزرگوں سے بھی اسی طرح شان نزول مروی ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ خود ایک مستقل مثال ہے جو دنیا کے بارے میں بیان کی گئی۔ مچھر جب تک بھوکا ہوتا ہے زندہ رہتا ہے۔ جہاں موٹا تازہ ہوا مرا۔ اسی طرح یہ لوگ ہیں کہ جب دنیاوی نعمتیں دل کھول کر حاصل کر لیتے ہیں وہیں اللہ کی پکڑ آ جاتی ہے جیسے اور جگہ فرمایا ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ﴾ (الانعام/ ٤٤) الخ جب یہ ہماری نصیحت بھول جاتے ہیں تو ہم ان پر تمام چیزوں کے دروازے کھول دیتے ہیں یہاں تک کہ اترانے لگتے ہیں، اب دفعۃً ہم انہیں پکڑ لیتے ہیں [3] (ابن جریر، ابن ابی حاتم) امام ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلے قول کو پسند فرمایا ہے اور مناسبت بھی اسی کی زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم۔ تو مطلب یہ ہوا کہ مثال چھوٹی

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٣٩٨)]
[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٣٩٩)]
[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٣٩٨)]

سے چھوٹی ہو یا بڑی سے بڑی بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ نہ رکتا ہے نہ جھجکتا ہے۔ لفظ مـــا یہاں پر کمی کے معنی بتانے کے لیے ہے اور "بَعُوْضَةً" کا زبر بدلیت کی بنا پر عربی قاعدے کے مطابق ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پر صادق آ سکتا ہے یا "مـا" نکرہ موصوفہ ہے اور "بَعُوْضَةً" صفت ہے ابن جریر رحمہ اللہ "مـا" کا موصولہ ہونا اور "بَعُوْضَةً" کا اسی اعراب سے معرب ہونا پسند فرماتے ہیں اور کلام عرب میں یہ بکثرت رائج ہے کہ وہ ما اور من کے صلہ کو انہی دونوں کا اعراب دیا کرتے ہیں اس لیے کہ کبھی یہ نکرہ ہوتے ہیں اور کبھی معرفہ جیسے حسان بن ثابت کے شعروں میں ہے:

یَکْفِیْ بِنَـا فَضْلاً عَلٰی مَنْ غَیْرَنَا   حُـبُّ الـنَّبِـیِّ مُـحَـمَّـدٍ إِیَّـانَـا

"ہمیں غیروں پر صرف یہی فضیلت کافی ہے کہ ہمارے دل حُبِّ نبی ﷺ سے پُر ہیں"

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "بَعُوْضَةً" منصوب ہو حذف جار کی بنا پر اور اس سے پہلے اور بَیْنَ کا لفظ مقدر مانا جائے۔ کسائی رحمہ اللہ اور فراء رحمہ اللہ اسی کو پسند کرتے ہیں ضحاک رحمہ اللہ اور ابراہیم بن عبلہ رحمہ اللہ "بَعُوْضَةٌ" پڑھتے ہیں۔ ابن جنی رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ "مـا" کا صلہ ہوگا اور عائد حذف مانی جائے گی جیسے ﴿تَمَامًا عَلَى الَّذِیْٓ اَحْسَنَ﴾ [1] میں ﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ کے دو معنی بیان کیے ہیں ایک تو یہ کہ اس سے بھی ہلکی اور ردی چیز۔ جیسے کسی شخص کی بخیلی وغیرہ کا ایک شخص ذکر کرے تو دوسرا کہتا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ گرا ہوا ہے۔ کسائی اور ابوعبیدہ رحمہما اللہ یہی کہتے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر دنیا کی قدر اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پلاتا۔ [2] دوسرے یہ معنی ہیں کہ اس سے زیادہ بڑی اس لیے کہ بھلا مچھر سے ہلکی اور چھوٹی چیز اور کیا ہوگی؟ قتادہ بن دعامہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ بھی اسی کو پسند فرماتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ جس کسی مسلمان کو کانٹا چبھے یا اس سے زیادہ تو اس پر بھی اس کے درجے بڑھتے ہیں اور گناہ مٹتے ہیں [3] اس حدیث میں بھی یہی لفظ "فَمَا فَوْقَهَا" ہے تو مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان چھوٹی بڑی چیزوں کے پیدا کرنے سے شرماتا نہیں اور نہ رکتا ہے۔ اسی طرح انہیں مثال کے طور پر بیان کرنے سے بھی اسے عار نہیں۔ ایک جگہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو ایک مثال بیان کی جاتی ہے کان لگا کر سنو جنہیں اللہ کے سوا پکار سکتے ہو وہ سارے کے سارے جمع ہو جائیں تو بھی ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی اگر ان سے کچھ چھین لے جائے تو یہ اس سے واپس نہیں لے سکتے عابد اور معبود

---

[1] [سورة الانعام: آیت ١٥٤]

[2] [صحیح: ترمذی: كتاب الزهد: باب ما جآء فی هوان الدنيا على الله عزو جل (٢٣٢٠) ابن ماجه: كتاب الزهد: باب مثل الدنيا (٤١١٠) مستدرك حاكم (٣٠٦/٤) ابو نعيم فی الحلية (٢٥٣/٣) طبرانی (٥٩٢١/٦) الكامل لابن عدی (١٩٥٦/٥)] امام ترمذیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ امام حاکمؒ نے اسے صحیح الاسناد کہا ہے۔ شیخ البانیؒ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ [صحيح ابن ماجه (٣٣١٨) صحيح الجامع الصغير (٦)] حافظ زبیر علی زئی اسے شواہد کی وجہ سے حسن کہتے ہیں۔]

[3] [صحیح: صحيح مسلم: كتاب البر والصلة: باب ثواب المومن فيما يصيبه من مرض او حزن او نحو ذلك (٢٥٧٢) ترمذی (٩٦٥) مسند احمد (٢٣٧/٢)]

دونوں ہی بے حد کمزور ہیں۔ [1] دوسری جگہ فرمایا ان لوگوں کی مثال جو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو مددگار بناتے ہیں مکڑی کے جالے جیسی ہے جس کا گھر تمام گھروں سے زیادہ بودا اور کمزور ہے [2] اور جگہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی مثال پاک درخت سے دی جس کی جڑ مضبوط ہو اور جس کی شاخیں آسمان میں ہوں جو بحکم اللہ ہر وقت پھل دیتا ہو۔ ان مثالوں کو اللہ تعالیٰ لوگوں کے غور و تدبر کے لیے بیان فرماتا ہے اور ناپاک کلام کی مثال ناپاک درخت جیسی ہے جو زمین کے اوپر اوپر ہی ہو اور جڑیں مضبوط نہ ہوں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو مضبوط بات کے ساتھ دنیا اور آخرت میں برقرار رکھتا ہے اور ظالموں کو گمراہ کرتا ہے اللہ جو چاہے کرے۔ [3] دوسری جگہ فرمایا اللہ تعالیٰ اس مملوک غلام کی مثال پیش کرتا ہے جسے کسی چیز پر اختیار نہیں۔ [4] اور جگہ فرمایا۔ دو شخصوں کی مثال اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے جن میں سے ایک تو گونگا اور بالکل گرا پڑا بے طاقت ہے جو اپنے آقا پر بوجھ ہے جہاں جائے برائی ہی لے کر آئے اور دوسرا وہ جو عدل و حق کا حکم کرے کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ [5] الخ دوسری جگہ ہے اللہ تعالیٰ تمہارے لیے خود تمہاری مثال بیان فرماتا ہے کیا تم اپنی چیزوں میں اپنے غلاموں کو بھی اپنا شریک اور برابر کا حصہ دار سمجھتے ہو؟ [6] اور جگہ ارشاد ہے اس شخص کی مثال اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے جس کے بہت سے برابر کے شریک ہوں الخ۔ [7] اور جگہ ارشاد ہے ان مثالوں کو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انہیں (پوری طرح) صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں۔ [8] ان کے علاوہ اور بھی بہت سی مثالیں قرآن پاک میں بیان ہوئی ہیں۔ بعض سلف صالحین رحمہم اللہ فرماتے ہیں جب میں قرآن کی کسی مثال کو سنتا ہوں اور سمجھ نہیں سکتا تو مجھے رونا آتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ان مثالوں کو صرف عالم ہی سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں مثالیں خواہ چھوٹی ہوں خواہ بڑی ایماندار ان پر ایمان لاتے ہیں اور انہیں حق جانتے ہیں اور ان سے ہدایت پاتے ہیں۔ [9] قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ وہ انہیں اللہ کا کلام سمجھتے ہیں۔ "اَنَّهُ" کی ضمیر کا مرجع مثال ہے یعنی مومن اس مثال کو اللہ کی جانب سے اور حق سمجھتے ہیں اور کافر باتیں بناتے ہیں جیسے سورہ مدثر میں ہے ﴿وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ﴾ (المدثر/ ۳۱) الخ یعنی ہم نے آگ والے فرشتوں کی گنتی کو کفار کی آزمائش کا سبب بنایا ہے۔ اہل کتاب یقین کرتے ہیں اور ایماندار ایمان میں بڑھ جاتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کو کوئی شک نہیں رہتا لیکن بیمار دل اور کفار کہہ اٹھتے ہیں کہ اس مثال سے کیا مراد؟ اسی طرح اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہاں بھی اسی ہدایت وضلالت کو بیان کیا۔

جنہوں نے اللہ کے عہد کا پاس نہ رکھا: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اس سے گمراہ منافق ہوتے ہیں اور مومن راہ پاتے ہیں۔ گمراہ اپنی گمراہی میں بڑھ جاتے ہیں کیونکہ اس مثال کے درست اور صحیح ہونے کا علم ہونے

---

[1] [سورة الحج : آیت ۷۳]
[2] [سورة عنكبوت : آیت ٤١]
[3] [سورة ابراهيم : آیت ٢٤ ـ ٢٧]
[4] [سورة النحل : آیت ۷۵]
[5] [سورة النحل : آیت ٧٦]
[6] [سورة الروم : آیت ٢٨]
[7] [سورة الزمر : آیت ٢٩]
[8] [سورة العنكبوت : ٤٣]
[9] [تفسير ابن ابی حاتم (۹۳/۱)]

کے باوجود اسے جھٹلاتے ہیں اور مومن اقرار کر کے ہدایت و ایمان کو بڑھا لیتے ہیں۔ [1] "فَاسِقِيْنَ" سے مراد منافق ہیں۔ بعض نے کہا ہے کافر مراد ہیں جو پہچانتے ہیں اور انکار کرتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں مراد خوارج ہیں۔ اگر اس قول کی سند حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تک صحیح ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ تفسیر معنوی ہے اس سے مراد خوارج نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ فرقہ بھی فاسقوں میں داخل ہے جنہوں نے نہروان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ پر چڑھائی کی تھی تو یہ لوگ گو نزول آیت کے وقت موجود نہ تھے لیکن اپنے بدترین وصف کی وجہ سے معناً فاسقوں میں داخل ہیں۔ انہیں خارجی اس لیے کہا گیا ہے کہ امام برحق کی اطاعت سے نکل گئے تھے اور شریعت اسلام کی پابندی سے آزاد ہو گئے تھے۔ لغت میں فاسق کہتے ہیں اطاعت اور فرمانبرداری سے نکل جانے کو۔ جب چھلکا ہٹا کر خوشہ نکلتا ہے تو عرب کہتے ہیں "فَسَقَتْ" چوہے کو بھی "فُوَيْسِقَه" کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے بل سے نکل کر فساد کرتا ہے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچ جانور فاسق ہیں حرم میں اور حرم باہر کے قتل کر دیئے جائیں۔ کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کالا کتا۔ [2] پس لفظ فاسق کافر کو اور ہر نافرمان کو شامل ہے لیکن کافر فاسق سے زیادہ سخت اور زیادہ برا ہے اور آیت میں مراد فاسق سے کافر ہے واللہ اعلم۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ بعد میں ان کا وصف یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عہد توڑتے ہیں۔ اس کے فرمان کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور یہ سب اوصاف کفار کے ہیں۔

جنہوں نے اللہ کا عہد نبھایا: مومنوں کے اوصاف تو اس کے برخلاف ہوتے ہیں جیسے سورہ رعد میں بیان ہے کہ ﴿اَفَمَنْ يَّعْلَمُ﴾ (الرعد/۱۹) الخ کیا پس وہ شخص جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر اترا وہ حق ہے کیا اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اندھا ہو؟ نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے ہیں جو اللہ کے وعدوں کو پورا کرتے ہیں اور میثاق نہیں توڑتے اور اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے انہیں جوڑتے ہیں اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور حساب کی برائی سے کانپتے رہتے ہیں۔ آگے چل کر فرمایا۔ جو لوگ اللہ کے عہد کو اس کی مضبوطی کے بعد توڑ دیں اور جس چیز کے ملانے کا اللہ کا حکم ہو وہ اسے نہ ملائیں اور زمین میں فساد پھیلائیں ان کے لیے لعنتیں ہیں اور ان کے لیے برا گھر ہے۔ [3] یہاں عہد سے مراد وہ وصیت ہے جو اللہ نے بندوں کو کی تھی جو اس کے تمام احکام بجالانے اور تمام نافرمانیوں سے بچنے پر مشتمل ہے۔ اس کا توڑ دینا اس پر عمل نہ کرنا ہے۔

بعض کہتے ہیں عہد توڑنے والے اہل کتاب کے کافر اور ان کے منافق ہیں اور عہد وہ ہے جو ان سے تورات

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۴۰۸)]

[2] [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب بدء الخلق: باب اذا وقع الذباب فی شراب (۳۳۱۴) صحیح مسلم: کتاب الحج: باب ما یندب للمحرم وغیرہ قتلہ الدواب فی الحل والحرام (۱۱۹۸) نسائی: کتاب المناسك: باب قتل الحداء فی الحرم (۲۸۹۲) ترمذی: کتاب الحج: باب ما یقتل المحرم من الدواب (۸۳۷) مسند احمد (۶/۱۶۴)]

[3] [سورۃ الرعد: آیت ۲۵]

میں لیا گیا تھا کہ وہ اس کی تمام باتوں پر عمل کریں اور محمد ﷺ کی اتباع کریں جب بھی آپ تشریف لے آئیں آپ کی نبوت کا اقرار کریں اور جو کچھ آپ اللہ کی جانب سے لے کر آئیں اس کی تصدیق کریں اور اس عہد کو توڑ دینا یہ ہے کہ انہوں نے آپ کی نبوت کا علم ہونے کے باوجود الٹا اطاعت سے انکار کر دیا اور باوجود عہد کا علم ہونے کے اسے چھپایا دنیاوی مصلحتوں کی بنا پر اس کا الٹ کیا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اس قول کو پسند کرتے ہیں اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی خاص جماعت نہیں بلکہ شرک وکفر ونفاق والے سب کے سب مراد ہیں۔ عہد سے مراد اپنی توحید اور نبی ﷺ کی نبوت کا اقرار کرانا ہے جن کی دلیل میں کھلی ہوئی نشانیاں اور بڑے بڑے معجزے موجود ہیں اور اس عہد کو توڑ دینا توحید وسنت سے منہ موڑنا اور انکار کرنا ہے یہ قول اچھا ہے زمخشری رحمہ اللہ کا میلان بھی اسی طرح ہے وہ کہتے ہیں عہد سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید ماننے کا اقرار ہے جو فطرت انسان میں داخل ہونے کے علاوہ روز میثاق بھی منوایا گیا ہے فرمایا گیا تھا کہ ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (اعراف/ ۱۷۲) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے جواب دیا تھا "بَلٰی" بے شک تو ہمارا رب ہے۔ پھر جو کتابیں دی گئیں ان میں بھی اقرار کرایا گیا جیسے فرمایا ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ﴾ الخ[1] میرے عہد کو نبھاؤ میں بھی اپنے وعدے پورے کروں گا۔ بعض کہتے ہیں وہ عہد مراد ہے جو روحوں سے لیا گیا تھا جب وہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے نکالی گئی تھیں جیسے فرماتا ہے ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ﴾ (اعراف/ ۱۷۲) الخ جب تیرے رب نے اولاد آدم سے وعدہ لیا کہ میں ہی تمہارا رب ہوں اور ان سب نے اقرار کیا۔ اور اس کا توڑنا اس سے انحراف ہے۔ یہ تمام اقوال تفسیر ابن جریر میں منقول ہیں۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں عہد اللہ کو توڑنا منافقوں کا کام ہے جن میں یہ چھ خصلتیں ہوتی ہیں۔ بات کرنے میں جھوٹ بولنا' وعدہ خلافی کرنا' امانت میں خیانت کرنا' اللہ کے عہد کو مضبوطی کے بعد توڑ دینا' اللہ تعالیٰ نے جن رشتوں کے ملانے کا حکم دیا ہے' انہیں نہ ملانا' زمین میں فساد پھیلانا۔ یہ چھ خصلتیں ان کی اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب کہ ان کا غلبہ ہو اور جب وہ مغلوب ہوتے ہیں تو تین اگلے کام کرتے ہیں۔ سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قرآن کے احکام کو پڑھنا جاننا سچ کہنا پھر نہ ماننا بھی عہد کو توڑنا تھا اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے جوڑنے کا حکم دیا ہے ان سے مراد صلہ رحمی کرنا' قرابت کے حقوق ادا کرنا وغیرہ ہے جیسے اور جگہ قرآن مجید میں ہے ﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ﴾ (محمد/ ۲۲) قریب ہے کہ تم اگر لوٹو تو زمین میں فساد کرو اور رشتے ناتے توڑ دو۔[2] ابن جریر رحمہ اللہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیت عام ہے یعنی جسے ملانے اور ادا کرنے کا حکم دیا تھا انہوں نے اسے توڑا اور حکم عدولی کی۔ "خٰسِرُوْنَ" سے مراد آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں[3] جیسے فرمان باری ہے ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ﴾ (الرعد/ ۲۵) ان لوگوں کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ اہل اسلام کے سوا جہاں دوسروں کو قرآن نے "خٰسِر" کہا ہے

---

[1] [سورۃ البقرہ: آیت ۴۰] [2] [تفسیر طبری (۱/ ۴۱۶)] [3] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۱۰۱)]

وہاں مراد کافر ہے اور اہل اسلام کے لیے جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں مراد گنہگار ہیں۔ [1] ﴿خَاسِرُوْنَ﴾ جمع ہے "خَاسِر" کی ۔چونکہ ان لوگوں نے نفسانی خواہشوں اور دنیوی لذتوں میں پڑ کر رحمت اللہ سے علیحدگی کر لی اس لیے انہیں نقصان یافتہ کہا گیا جیسے وہ شخص جسے اپنی تجارت میں گھاٹا آئے اسی طرح یہ کافر و منافق ہیں یعنی قیامت والے دن جب رحم و کرم کی بہت ہی حاجت ہوگی اس دن رحمت الٰہی سے محروم رہ جائیں گے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸

تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مار ڈالے گا پھر زندہ کرے گا پھر اسی کی طرف لوٹا کر لائے جاؤ گے ○

زندگی اور موت کا حقیقی مالک: اس بات کا ثبوت دیتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے وہ قدرتوں والا ہے وہی پیدا کرنے والا اور اختیار والا ہے۔ اس آیت میں فرمایا تم اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کیسے کر سکتے ہو؟ یا اس کے ساتھ دوسرے کو عبادت میں شریک کیسے کر سکتے ہو؟ جبکہ تمہیں عدم سے وجود میں لانے والا ایک وہی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا کیا یہ بغیر کسی چیز کے پیدا کیے گئے؟ یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ انہوں نے زمین و آسمان بھی پیدا کیا ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ یہ بے یقین لوگ ہیں۔ [2] اور جگہ ارشاد ہوتا ہے ﴿هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا﴾ [3] یقیناً انسان پر وہ زمانہ بھی آیا ہے جس وقت یہ قابل ذکر چیز ہی نہ تھا۔ اور بھی اسی طرح کی بہت سی آیتیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کفار جو کہیں گے ﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ﴾ [4] الخ اے اللہ دو دفعہ تو نے ہمیں مارا اور دو دفعہ جلایا ہمیں اپنے گناہوں کا اقرار ہے الخ۔ اس سے مراد یہی ہے جو اس آیت ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ الخ میں ہے مطلب یہ ہے کہ تم اپنے باپوں کی پیٹھ میں مردہ تھے یعنی کچھ بھی نہ تھے۔ اس نے تمہیں زندہ کیا یعنی پیدا کیا پھر تمہیں مارے گا یعنی موت ایک روز ضرور آئے گی پھر تمہیں قبروں سے وہ اٹھائے گا۔ پس ایک حالت مردہ پن کی دنیا میں آنے سے پہلے پھر دوسری دنیا میں مرنے اور قبروں کی طرف جانے کی پھر قیامت کے روز اٹھ کھڑے ہونے کی۔ دو زندگیاں اور دو موتیں۔ [5] ابو صالح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قبر میں انسان کو زندہ کر دیا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیٹھ میں انہیں پیدا کیا پھر ان سے عہد و پیمان لے کر بے جان کر دیا پھر ماں کے پیٹ میں انہیں پیدا کیا پھر دنیوی موت ان پر آئی پھر قیامت والے دن انہیں زندہ کرے گا لیکن یہ قول غریب ہے۔ پہلا قول ہی درست ہے۔ ابن مسعودؓ ابن عباس رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ قرآن میں اور جگہ ہے ﴿قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۴۱۷)]
[2] [سورۃ الطور : آیت ۳۵۔ ۳۶]
[3] [سورۃ الدھر : آیت ۱]
[4] [سورۃ غافر : آیت ۱۱]
[5] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۴۱۹)]

﴿يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾ (الجاثية/٢٦) الخ اللہ ہی تمہیں پیدا کرتا ہے پھر مارتا ہے پھر تمہیں قیامت کے دن جمع کرے گا الخ۔ ان پتھروں اور تصویروں کو جنہیں مشرکین پوجتے تھے قرآن نے مردہ کہا۔ فرماتا ہے: ﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ﴾ (النحل/٢١) وہ سب مردہ ہیں زندہ نہیں۔ زمین کے بارے میں فرمایا ﴿وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ﴾ (یٰسین/٣٣) الخ ان کے لیے مردہ زمین بھی ہماری صداقت کی نشانی ہے جسے ہم زندہ کرتے ہیں اور اس سے دانے نکالتے ہیں جسے یہ کھاتے ہیں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۤ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ
٢٩ سَمٰوٰتٍ ۭ وَھُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾

وہی اللہ جس نے تمہارے لیے زمین کی کل چیزوں کو پیدا کیا پھر آسمان کی طرف قصد کیا اور ان ساتوں کو ٹھیک ٹھاک کیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے ○

ارض وسماء کی تخلیق: اوپر کی آیات میں ان دلائل قدرت کا بیان تھا جو خود انسان کے اندر ہیں اب اس مبارک آیت میں ان دلائل کا بیان ہو رہا ہے جو روزمرہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ "اِسْتَوٰٓى" یہاں پر قصد کرنے اور متوجہ ہونے کے معنی میں ہے اس لیے کہ اس کا صلہ "اِلٰى" ہے "سَوّٰىهُنَّ" کے معنی درست کرنے اور ساتوں آسمان بنانے کے ہیں سَمَاۗءٌ اسم جنس ہے۔ پھر بیان فرمایا کہ اس کا علم محیط کل ہے جیسے اور جگہ ارشاد ہے ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ (الملك/١٤) کیا وہ بے علم ہو سکتا ہے جو خالق ہو؟ سورہ سجدہ کی آیت ﴿قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ﴾ (حم السجده/٩) الخ گویا اس آیت کی تفصیل ہے۔ جس میں فرمایا ہے کیا تم اس اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ جس نے زمین کو صرف دو دن میں پیدا کیا تم اس کے لیے شریک ٹھہراتے ہو؟ جو رب العالمین ہے جس نے زمین میں مضبوط پہاڑ اوپر سے گاڑ دیئے جس نے اس زمین میں برکتیں اور روزیاں رکھیں اور چار دن میں زمین کی سب چیزیں درست کر دیں۔ جس میں دریافت کرنے والوں کی تشفی ہے پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہو کر جو دھویں کی شکل میں تھے فرمایا کہ اے زمینو اور آسمانو خوشی یا ناخوشی سے آؤ تو دونوں نے کہا باری تعالیٰ ہم تو برضا و خوشی حاضر ہیں۔ دو دن میں ان ساتوں آسمانوں کو پورا کر دیا اور ہر آسمان میں اس کا کام بانٹ دیا اور دنیا کے آسمان کو ستاروں کے ساتھ مزین کر دیا اور انہیں (شیطانوں سے) بچاؤ کا سبب بنایا۔ یہ ہے اندازہ اس اللہ کا جو بہت بڑا غالب اور بہت بڑے علم والا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے زمین پیدا کی پھر ساتوں آسمان۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عمارت کا یہی قاعدہ ہے کہ پہلے نیچے کا حصہ بنایا جائے پھر اوپر کا۔ مفسرین نے بھی اس کی تصریح کی ہے جس کا بیان بھی ابھی آتا ہے۔ (ان شاء اللہ) لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَاۗءُ﴾ (النزعت/٢٧) الخ تمہاری پیدائش مشکل ہے یا آسمانوں کی؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی موٹائی بلند کر کے انہیں ٹھیک ٹھاک کیا اور ان میں سے رات دن پیدا کیے پھر اس کے بعد زمین پھیلائی اس سے پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو گاڑا جو سب تمہارے اور تمہارے جانوروں کے کام کی چیزیں ہیں۔ اس آیت میں

یہ فرمایا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان کے بعد ہے تو بعض بزرگوں نے تو فرمایا ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں "ثُـمَّ" صرف عطف خبر کے لیے ہے عطف فعل کے لیے نہیں [1] یعنی یہ مطلب نہیں کہ زمین کے بعد آسمان کی پیدائش شروع کی بلکہ صرف خبر دینا مقصود ہے کہ آسمانوں کو بھی پیدا کیا اور زمینوں کو بھی۔ عرب شاعروں کے اشعار میں یہ موجود ہے کہ کہیں "ثُـمَّ" صرف خبر کا خبر پر عطف ڈالنے کے لیے ہوتا ہے تقدیم تاخیر مراد نہیں ہوتی۔ اور بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آیت "ءَ اَنْتُـمْ" میں آسمانوں کی پیدائش کے بعد زمین کا پھیلانا اور بچھانا وغیرہ بیان ہوا ہے نہ کہ پیدا کرنا۔ تو ٹھیک یہ ہے کہ پہلے زمین کو پیدا کیا پھر آسمان کو پھر زمین کو ٹھیک ٹھاک کیا اسی طرح دونوں آیتیں ایک دوسرے کے مخالف نہ رہیں گی۔ اس عیب سے اللہ کا کلام بالکل محفوظ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہی معنی بیان فرمائے ہیں (یعنی پہلے زمین کی پیدائش پھر آسمانوں کی۔ البتہ زمین کی درستی وغیرہ یہ بعد کی چیز ہے) حضرت ابن مسعود حضرت ابن عباس اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور کسی چیز کو پیدا نہیں کیا تھا جب اور مخلوق کو پیدا کرنا چاہا تو پانی سے دھواں بلند کیا وہ اونچا چڑھا اور اس سے آسمان بنائے پھر پانی خشک ہو گیا اور اس کی زمین بنائی پھر اس کو الگ الگ کر کے ساتھ زمینیں بنائیں اتوار اور پیر کے دو دن میں یہ ساتوں زمینیں بن گئیں۔ زمین مچھلی پر ہے اور مچھلی وہ ہے جس کا ذکر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾ (القلم / ۱) مچھلی پانی میں ہے اور پانی صفاۃ پر ہے اور صفاۃ فرشتے پر اور فرشتے پتھر پر اور یہ پتھر وہ ہے جس کا ذکر حضرت لقمان علیہ السلام نے کیا ہے۔ یہ پتھر ہوا پر ہے مچھلی کے ہلنے سے زمین کانپنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو گاڑ دیا' اور وہ ٹھہر گئی' یہی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿وَجَعَلْنَا فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِهِمْ﴾ (الانبیاء / ۳۱) الخ زمین نہ ہلے اس لیے ہم نے اس میں پہاڑ جما دیئے ہیں۔ پہاڑ زمین کی پیداوار درخت وغیرہ زمین کی کل چیزیں منگل اور بدھ کے دو دنوں میں پیدا کیں اسی کا بیان ﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ﴾ [2] الخ' والی آیت میں ہے پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی جو دھواں تھا آسمان بنایا پھر اسی میں ساتھ آسمان بنائے جمعرات اور جمعہ کے دو دنوں میں جمعہ کے دن کو اس لیے جمعہ کہا جاتا ہے کہ اس میں زمین وآسمان کی پیدائش جمع ہو گئی ہر آسمان میں اس نے فرشتوں کو پیدا کیا اور ان چیزوں کو جن کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں کہ دنیا آسمان کو ستاروں کے ساتھ زینت دی اور انہیں شیطان سے حفاظت کا سبب بنایا ان تمام چیزوں کو پیدا کر کے پروردگار نے عرش عظیم پر قرار پکڑا جسے فرماتا ہے ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ﴾ (اعراف / ٥٤) یعنی چھ دن میں آسمانوں اور زمین کو پیدا کر کے پھر عرش پر مستوی ہو گیا اور جگہ فرمایا ﴿كَانَتَا رَتْقًا﴾ (الانبیاء / ۳۰) الخ یعنی یہ دونوں دھواں سے تھے ہم نے انہیں پھاڑا اور پانی سے ہر چیز کو زندگی دی (تفسیر سدی) (یہ موقوف قول جس میں کئی قسم کا احتمال ہے بہ ظاہراً ایسی اہم بات میں حجت تامہ نہیں ہو سکتا۔ واللہ اعلم) ابن جریر میں ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اتوار سے مخلوق کی پیدائش شروع ہوئی۔ دو دن میں زمینیں

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ٤۳۷)] [2] [سورہ حم السجدہ : آیت ۹]

پیدا ہوئیں دو دن میں ان میں موجود تمام چیزیں پیدا کیں اور دو دن میں آسمانوں کو پیدا کیا جمعہ کے دن آخری وقت ان کی پیدائش ختم ہوئی اور اسی وقت حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور اسی وقت میں قیامت قائم ہو گی۔ مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا اس سے جو دھواں اوپر چڑھا اس کے آسمان بنائے جو ایک پر ایک اس طرح سات ہیں اور زمینیں ایک نیچے ایک اوپر اس طرح سات ہیں۔ [1] اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے ہے جیسے سورہ ﴿ حٰـمٓ ﴾ سجدہ کی آیت میں ہے۔ علماء بھی اسی پر متفق ہیں۔ صرف قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آسمان زمین سے پہلے پیدا ہوئے ہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ اسی میں توقف کرتے ہیں۔ ﴿ وَالنّٰزِعٰتِ ﴾ کی آیت کی وجہ سے یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں آسمان کی پیدائش کا ذکر زمین سے پہلے ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جب یہ سوال ہوا تو آپ نے جواب دیا کہ زمین پیدا تو آسمانوں سے پہلے کی گئی ہے لیکن بعد میں پھیلائی گئی ہے۔ [2] یہی جواب اگلے پچھلے علماء کا ہے۔ سورہ ﴿ وَالنّٰزِعٰتِ ﴾ کی تفسیر میں بھی اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حاصل امر یہ ہے کہ زمین کا پھیلانا اور بچھانا بعد میں ہے اور ﴿ دَحٰىهَا ﴾ کا لفظ قرآن میں ہے اور اس کے بعد جو پانی، چارہ، پہاڑ وغیرہ کا ذکر ہے یہ گویا اس لفظ کی تشریح ہے جن جن چیزوں کی نشوونما کی قوت اس زمین میں رکھی تھی ان سب کو ظاہر کر دیا اور زمین کی پیداوار طرح طرح کی مختلف شکلوں اور مختلف قسموں میں نکل آئی۔ اسی طرح آسمان میں بھی ٹھہرے رہنے والے چلنے والے ستارے وغیرہ بنائے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ صحیح مسلم اور نسائی میں حدیث میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا مٹی کو اللہ تعالیٰ نے ہفتہ والے دن پیدا کیا، پہاڑوں کو اتوار کے دن، درختوں کو پیر کے دن، برائیوں کو منگل کے دن، نور کو بدھ کے دن، جانوروں کو جمعرات کے دن، آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن اور عصر کے بعد جمعہ کی آخری ساعت میں عصر کے بعد سے رات تک۔ [3] یہ حدیث غرائب مسلم میں سے ہے۔ امام ابن مدینی رحمہ اللہ اور امام بخاری رحمہ اللہ وغیرہ نے اس پر بحث کی ہے اور فرمایا ہے کہ کعب رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب رضی اللہ عنہ کا یہ قول سنا ہے اور بعض راویوں نے اسے غلطی سے مرفوع حدیث قرار دے لیا ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ یہی کہتے ہیں۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن
يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا
تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۴۳۶)] [2] [بخاری : کتاب التفسیر (۸/۵۵۵۔مع الفتح)]

[3] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب صفات المنافقین باب ابتداء الخلق و خلق آدم (۲۷۸۹) تفسیر ابن ابی حاتم (۳۰۵) النسائی فی السنن الکبری (۱۱۰۱۰) تفسیر ابن جریر (۹۵/۲۴) بیہقی فی الاسماء والصفات (۱۴۲/۲) مسند احمد (۳۲۷/۲)]

جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا ایسے شخص کو کیوں پیدا کرتا ہے جو زمین میں فساد کرے اور خون بہائے اور ہم تیری تسبیح، حمد اور پاکیزگی بیان کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ ○

خلیفہ بنانے کا مقصد: اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو دیکھو کہ اس نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے سے پہلے فرشتوں میں ان کا ذکر کیا جس کا بیان اس آیت میں ہے۔ فرماتا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم یاد کرو اور اپنی امت کو یہ خبر پہنچاؤ۔ ابوعبیدہ تو کہتے ہیں کہ لفظ "اِذْ" یہاں زائد ہے لیکن ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ مفسرین اس کی تردید کرتے ہیں ﴿ خَلِیْفَة ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کے یکے بعد دیگرے بعض کے بعض جانشین ہوں گے اور ایک زمانہ کے بعد دوسری زمانہ میں یونہی صدیوں تک یہ سلسلہ رہے گا۔ جیسے اور جگہ ارشاد ہے ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ﴾ (الانعام ۱٦٥) دوسری جگہ فرمایا ﴿ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾ (النمل/ ٦٢) یعنی تمہیں اس نے زمین کا خلیفہ بنا دیا اور ارشاد ہے کہ ان کے بعد ان کے خلیفہ یعنی جانشین برے لوگ ہوئے۔ [1] ایک شاذ قرات میں ﴿ خَلِیْقَةٌ ﴾ بھی ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ خلیفہ سے مراد صرف حضرت آدم علیہ السلام ہیں لیکن اس میں تامل ہے۔ تفسیر رازی کے مفسر نے اختلاف کو ذکر کیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطلب نہیں۔ اس کی ایک دلیل تو فرشتوں کا یہ قول ہے کہ وہ زمین میں فساد کریں گے اور خون بہائیں گے تو ظاہر ہے کہ انہوں نے اولاد آدم علیہ السلام کی نسبت یہ فرمایا تھا نہ کہ خاص حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا علم فرشتوں کو کیونکر ہوا؟ یا تو کسی خاص ذریعہ سے انہیں یہ معلوم ہوا یا بشری طبیعت کے اقتضاء کو دیکھ کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہوگا کیونکہ یہ فرما دیا گیا تھا کہ اس کی پیدائش مٹی سے ہوگی یا لفظ خلیفہ کے مفہوم سے انہوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ فیصلے کرنے والا مظالم کی روک تھام کرنے والا اور حرام کاموں اور گناہوں کی باتوں سے روکنے والا ہوگا یا انہوں نے چونکہ زمین کی پہلی مخلوق کو دیکھا تھا اسی بنا پر اسے بھی قیاس کیا ہوگا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ فرشتوں کی یہ عرض بطور اعتراض کے نہ تھی نہ بنی آدم کے حسد کے طور پر تھی۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے وہ قطعی غلطی کر رہے ہیں۔ فرشتوں کی شان میں قرآن فرماتا ہے ﴿ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ ﴾ (الانبیاء/ ۲۷) یعنی جس بات کے دریافت کرنے کی انہیں اجازت نہ ہو اس میں وہ لب نہیں ہلاتے (اور یہ بھی ظاہر ہے کہ فرشتوں کی طبیعت حسد سے پاک ہے) بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ یہ سوال صرف اس حکمت معلوم کرنے کے لیے اور اس راز کے ظاہر کرانے کے لیے تھا جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ [2] یہ تو جانتے تھے کہ اس مخلوق میں فسادی لوگ بھی ہوں گے تو اب باادب سوال کیا کہ پروردگار ایسی مخلوق کے پیدا کرنے میں کون سی حکمت ہے؟ اگر عبادت مقصود ہے تو عبادت تو ہم کرتے ہی ہیں۔ تسبیح و تقدیس و تحمید ہر وقت ہماری زبانوں پر ہے اور پھر فساد وغیرہ سے پاک ہیں تو پھر اور مخلوق جن میں فسادی اور خونی بھی ہوں گے کس مصلحت پر پیدا کی جا رہی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کا جواب دیا کہ باوجود اس کے فساد کے اسے جن مصلحتوں اور حکمتوں کی بنا پر میں پیدا کر رہا ہوں

---

[1] [سورۃ مریم : آیت ٥٩]
[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (٤٦٤/١)]

انہیں میں ہی جانتا ہوں تمہارا علم ان حکمتوں تک نہیں پہنچ سکتا میں جانتا ہوں کہ ان میں انبیاء اور رسول ہوں گے ان میں صدیق اور شہید ہوں گے۔ ان میں عابد' زاہد' اولیاء' ابرار' نیکوکار' مقرب بارگاہ' علماء' صلحاء' متقی' پرہیزگار' خوف الٰہی' حب باری تعالیٰ رکھنے والے بھی ہوں گے۔ میرے احکام کی بسر و چشم تعمیل کرنے والے' میرے نبیوں کے ارشاد پر لبیک پکارنے والے بھی ہوں گے۔ صحیحین کی حدیث میں ہے کہ دن کے فرشتے صبح صادق کے وقت آتے ہیں اور عصر کو چلے جاتے ہیں تب رات کے فرشتے آتے ہیں اور صبح کو جاتے ہیں۔ آنے والے جب آتے ہیں تب بھی اور جب جاتے ہیں تب بھی صبح کی اور عصر کی نماز میں لوگوں کو پاتے ہیں اور دربار الٰہی میں پروردگار کے سوال کے جواب میں دونوں جماعتیں یہی کہتی ہیں کہ گئے تو نماز میں پایا اور آئے تو نماز میں چھوڑ کر آئے [1] یہی وہ مصلحت اللہ ہے جسے فرشتوں کو بتایا گیا کہ میں جانتا ہوں اور تم نہیں جانتے۔ ان فرشتوں کو اسی چیز کو دیکھنے کے لیے بھیجا جاتا ہے اور دن کے اعمال رات سے پہلے اور رات کے دن سے پہلے اللہ العالمین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ [2] غرض تفصیلی حکمت جو پیدائش انسان میں تھی اس کی نسبت فرمایا کہ یہ میرے مخصوص علم میں ہے۔ جو تمہیں معلوم نہیں بعض کہتے ہیں یہ جواب فرشتوں کے اس قول کا ہے کہ ہم تیری تسبیح وغیرہ کرتے رہتے ہیں تو انہیں فرمایا گیا کہ میں ہی جانتا ہوں تم جیسا کہ اپنے آپ کو سمجھتے ہو اور سب کو یکساں کر رہے ہو' ایسا نہیں بلکہ تم میں ایک ابلیس بھی ہے۔ ایک تیسرا قول یہ ہے کہ فرشتوں کا یہ سب کہنا دراصل یہ مطلب رکھتا تھا کہ ہمیں زمین میں بسایا جائے تو جواباً کہا گیا کہ تمہاری آسمانوں میں رہنے کی مصلحت میں ہی جانتا ہوں اور مجھے علم ہے کہ تمہارے لائق جگہ یہی ہے واللہ اعلم۔

حسن' قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو خبر دی۔ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں مشورہ لیا۔ لیکن اس کے معنی بھی خبر دینے کے ہو سکتے ہیں۔ اگر نہ ہوں تو پھر یہ بات بے وزن ہو جاتی ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مکہ سے زمین پھیلائی اور بچھائی گئی تو بیت اللہ شریف کا طواف سب سے پہلے فرشتوں نے کیا اور زمین میں خلیفہ بنانے سے مراد مکہ میں خلیفہ بنانا ہے۔ [3] یہ حدیث مرسل ہے پھر اس میں ضعف ہے اور مدرج ہے یعنی زمین سے مراد مکہ لینا راوی کا اپنا خیال ہے۔ واللہ اعلم۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے مراد عام ہے ساری زمین مراد ہے۔ فرشتوں نے جب یہ سنا تو پوچھا تھا کہ وہ خلیفہ کیا ہوگا ؟ اور جواب میں کہا گیا تھا کہ اس کی اولاد میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو زمین میں فساد کریں' حسد و بغض کریں' قتل و خون کریں ان میں وہ عدل و انصاف کرے گا اور میرے احکام جاری کرے گا تو اس سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ جو ان کے قائم مقام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور مخلوق میں عدل و انصاف کرنے کی بنا پر فساد پھیلانے اور خون بہانے والے خلیفہ نہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ یہاں مراد خلافت سے ایک زمانہ والوں کا دوسرے زمانہ کے بعد آنا ہے۔ 'خلیفہ فعیلہ' کے وزن

---

[1] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب مواقیت الصلوۃ : باب فضل صلاۃ العصر (٥٥٥) صحیح مسلم : کتاب المساجد : باب فضل صلاتی الصبح والعصر (٦٣٢)]

[2] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الایمان : باب فی قوله ان الله لا ینام (١٧٩)]

[3] [ضعیف جدا : تفسیر ابن جریر الطبری (٥٩٩) تفسیر ابن ابی حاتم (٣١٨) الدر المنثور (٤٦/١)]

پر ہے۔ جب ایک کے بعد دوسرا اس کے قائم مقام ہو تو عرب کہتے ہیں "خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا" فلاں شخص فلاں کا خلیفہ ہوا جیسے قرآن میں ہے کہ ہم ان کے بعد تمہیں زمین کا خلیفہ بنا کر دیکھتے ہیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو [1] اور اسی لیے سلطان اعظم کو خلیفہ کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اگلے بادشاہ کا جانشین ہوتا ہے۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ زمین کا ساکن اس کا آبادی کرنے والا ہے۔

یہ آثار اہل کتاب سے لیے گئے ہیں ان میں سے کوئی چیز حجت نہیں اور ضحاک کی ابن عباس سے ملاقات ثابت نہیں نیز بشر بن عمارہ ضعیف ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں پہلے زمین میں جنات بستے تھے۔ انہوں نے اس میں فساد کیا اور خون بہایا اور قتل وغارت کیا ابلیس کو بھیجا گیا اس نے اور اس کے ساتھیوں نے انہیں مار مار کر جزیروں اور پہاڑوں میں بھگا دیا پھر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے زمین میں بسایا تو گویا یہ ان پہلے والوں کے خلیفہ اور جانشین ہوئے۔ پس فرشتوں کے قول سے مراد اولاد آدم ہیں۔ [2] جس وقت ان سے کہا گیا کہ میں زمین کو اور اس میں بسنے والی مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت زمین تھی لیکن اس میں آبادی نہ تھی۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ بھی مروی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں معلوم کروا دیا تھا کہ اولاد آدم ایسے ایسے کام کرے گی تو انہوں نے یہ پوچھا اور یہ بھی مروی ہے کہ جنات کے فساد پر انہوں نے بنی آدم کے فساد کو قیاس کر کے یہ سوال کیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آدم علیہ السلام سے دو ہزار سال پہلے سے جنات زمین میں آباد تھے۔ ابوالعالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں فرشتے بدھ کے دن پیدا ہوئے اور جنات کو جمعرات کے دن پیدا کیا اور جمعہ کے دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے حضرت حسن اور حضرت قتادہ رحمہم اللہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی تھی کہ ابن آدم ایسا ایسا کریں گے اس بنا پر انہوں نے سوال کیا۔

ابوجعفر محمد بن علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سجل نامی ایک فرشتہ ہے جس کے ساتھ ہاروت ماروت تھے اسے ہر دن تین مرتبہ لوح محفوظ پر نظر ڈالنے کی اجازت تھی۔ ایک مرتبہ اس نے آدم علیہ السلام کی پیدائش اور دیگر امور کا جب مطالعہ کیا تو چپکے سے اپنے ان دونوں ساتھیوں کو بھی اطلاع کر دی۔ اب جو اللہ تعالیٰ نے اپنا ارادہ ظاہر فرمایا تو ان دونوں نے یہ سوال کیا لیکن یہ روایت غریب ہے اور صحیح مان لینے پر بھی ممکن ہے کہ ابوجعفر رحمہ اللہ نے اسے اہل کتاب یہود ونصاریٰ سے اخذ کیا ہو۔ بہرصورت یہ ایک واہی تواہی روایت ہے اور قابل تردید ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر اس روایت میں ہے کہ دو فرشتوں نے یہ سوال کیا۔ یہ قرآن کی روانی عبارت کے بھی خلاف ہے۔ یہ بھی روایت مروی ہے کہ یہ کہنے والے فرشتے دس ہزار تھے اور وہ سب کے سب جلا دیئے گئے۔ یہ بھی بنی اسرائیلی روایت ہے اور بہت ہی غریب ہے امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس سوال کی انہیں اجازت دی گئی تھی اور یہ بھی معلوم کرا دیا گیا تھا کہ یہ مخلوق نافرمان بھی ہوگی تو انہوں نے نہایت تعجب کے ساتھ اللہ کی مصلحت معلوم کرنے کے لیے یہ سوال کیا نہ کہ کوئی مشورہ دیا یا انکار کیا یا اعتراض کیا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش شروع ہوئی تو فرشتوں نے کہا ناممکن ہے کہ کوئی مخلوق ہم سے زیادہ بزرگ اور عالم ہو تو اس پر یہ امتحان اللہ کی طرف سے آیا اور کوئی مخلوق امتحان سے نہیں

---

[1] [سورة يونس : آيت ١٤]

[2] [تفسير ابن جرير الطبرى (٦٠٣) تفسير ابن ابى حاتم (٣٢٧)]

چھوٹی۔ زمین اور آسمان پر بھی امتحان آیا تھا اور انہوں نے سرخم کر کے اطاعت الٰہیہ کے لیے آمادگی ظاہر کی فرشتوں کی تسبیح وتقدیس سے مراد اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا نماز پڑھنا بے ادبی سے بچنا' بڑائی اور عظمت کرنا ہے۔ فرماں برداری کرنا سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ وغیرہ پڑھنا ہے۔ قدوس کے معنی پاک کے ہیں۔ پاک زمین کو مقدس کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ سے سوال ہوتا ہے کہ کون سا کلام افضل ہے؟ جواب دیتے ہیں وہ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے لیے پسند فرمایا ہے ﴿سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ﴾ [1] (صحیح مسلم) حضور ﷺ نے معراج والی رات آسمانوں پر فرشتوں کی یہ تسبیح سنی ﴿سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْاَعْلٰى سُبْحَانَهُ﴾ [2] امام قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ہے تاکہ وہ لوگوں کے اختلافات کا فیصلہ کرے' ان کے جھگڑے چکائے' مظلوم کا بدلہ ظالم سے لے حدیں قائم کرے' برائیوں کے مرتکب لوگوں کو ڈانٹے ڈپٹے وغیرہ وغیرہ' وہ بڑے بڑے کام جو بغیر امام کے انجام نہیں پا سکتے۔ چونکہ یہ کام واجب ہیں اور یہ بغیر امام کے پورے نہیں ہو سکتے اور جس چیز کے بغیر واجب پورا نہ ہو وہ بھی واجب ہو جاتی ہے لہٰذا خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ثابت ہوا۔

امامت یا تو قرآن وحدیث کے ظاہری لفظوں سے ملے گی جیسے کہ اہل سنت کی ایک جماعت کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت خیال ہے کہ ان کا نام حضور ﷺ نے خلافت کے لیے لیا تھا یا قرآن وحدیث سے اس کی جانب اشارہ ہو۔ جیسے اہل سنت ہی کی دوسری جماعت کا خلیفہ اول کی بابت یہ خیال ہے کہ اشارۃً ان کا ذکر حضور ﷺ نے خلافت کے لیے کیا۔ یا ایک خلیفہ اپنے بعد دوسرے کو نامزد کر جائے جیسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ یا وہ صالح لوگوں کی ایک کمیٹی بنا کر انتخاب کا کام ان کے سپرد کر دیا جائے جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا' یا اہل حل وعقد (یعنی با اثر سرداران لشکر علماء وصلحاء وغیرہ) اس کی بیعت پر اجماع کر لیں یا ان میں سے کوئی اس کی بیعت کر لے تو جمہور کے نزدیک اس کا لازم پکڑنا واجب ہو جائے گا۔ امام الحرمین رحمہ اللہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے واللہ اعلم۔ یا کوئی شخص لوگوں کو بزور وجبر اپنی ماتحتی پر بے بس کر دے تو بھی واجب ہو جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں تاکہ پھوٹ اور اختلاف نہ پھیلے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے صاف لفظوں میں فیصلہ کیا ہے۔ اس بیعت کے وقت گواہوں کی موجودگی کے واجب ہونے میں اختلاف ہے بعض تو کہتے ہیں یہ شرط نہیں' بعض کہتے ہیں شرط ہے اور دو گواہ کافی ہیں۔ جبائی کہتا ہے بیعت کرنے والے اور جس کے ہاتھ پر بیعت ہو رہی ہے ان دونوں کے علاوہ چار گواہ چاہئیں' جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شوریٰ کے چھ ارکان مقرر کیے تھے پھر انہوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اختیار کر دیا اور آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر باقی چاروں کی موجودگی میں بیعت کی لیکن اس استدلال میں اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔ امام کا مرد ہونا' آزاد ہونا'

---

[1] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الذکر والدعاء: باب فضل سبحان اللہ وبحمدہ (۲۷۳۱) بخاری فی الادب المفرد (۶۳۸) ترمذی (۳۵۹۳) مسند احمد (۱۶۱/۵)]

[2] [ضعیف: الطبرانی فی الاوسط (۳۷۴۲) الدر المنثور للسیوطی (۱۸۳/۴) ابو نعیم فی الحلیۃ (۷/۲)] امام ہیثمی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ مسکین بن میمون کی حدیث منکر ہے۔ [مجمع الزوائد (۷۸/۱)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [کتاب الاسراء والمعراج (ص: ۷۱)]

بالغ ہونا، عقلمند ہونا، مسلمان ہونا، عادل ہونا، مجتہد ہونا، آنکھوں والا ہونا، صحیح سالم اعضاء والا ہونا، فنون جنگ سے اور رائے سے خبردار ہونا، قریشی ہونا واجب ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔ ہاں ہاشمی ہونا اور خطا سے معصوم ہونا شرط نہیں۔ یہ دونوں شرطیں متشدد رافضی لگاتے ہیں امام اگر فاسق ہو جائے تو اسے معزول کر دینا چاہیے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے اور صحیح یہ ہے کہ معزول نہ کیا جائے کیونکہ حدیث میں آ چکا ہے کہ جب تک ایسا کھلا کفر نہ دیکھ لو جس کے کفر ہونے کی ظاہر دلیل اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ہو۔(1) اسی طرح خود امام اپنے آپ معزول ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ خود بخود آپ ہی معزول ہو گئے تھے اور امر امامت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سونپ دیا تھا لیکن یہ عذر کے باعث تھا جس پر ان کی تعریف کی گئی ہے۔

روئے زمین پر ایک سے زیادہ امام ایک وقت میں نہیں ہو سکتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب تم میں اتفاق ہو اور کوئی اگر تم میں جدائی ڈالنی چاہے تو اسے قتل کر دو خواہ کوئی بھی ہو۔(2) جمہور کا یہی مذہب ہے اور بہت سے بزرگوں نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ جن میں سے ایک امام الحرمین رحمہ اللہ ہیں۔ کرامیہ (شیعہ) کا قول ہے کہ دو اور زیادہ بھی ایک وقت میں امام ہو سکتے ہیں جیسے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں اطاعت کے لائق تھے۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ جب ایک وقت میں دو دو اور زیادہ نبیوں کا ہونا جائز ہے تو اماموں کا ہونا جائز کیوں نہ ہو؟ نبوت کا مرتبہ تو یقیناً امامت کے مرتبے سے بہت زیادہ ہے (لیکن صحیح مسلم والی حدیث آپ ابھی اوپر پڑھ چکے ہیں کہ دوسرے کو قتل کر ڈالو۔ اس لیے صحیح مذہب وہی ہے جو پہلے بیان ہوا) امام الحرمین رحمہ اللہ نے استاد ابو اسحاق رحمہ اللہ سے بھی حکایت کی ہے کہ وہ دو اور زیادہ اماموں کا مقرر کرنا اس وقت جائز جانتے ہیں جب مسلمانوں کی سلطنت بہت بڑی وسیع ہو اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ہو اور دو اماموں کے درمیان کئی ملکوں کا فاصلہ ہو۔ امام الحرمین رحمہ اللہ اس میں تردد میں ہیں، خلفائے بنی عباس کا عراق میں اور خلفائے بنی فاطمہ کا مصر میں اور خاندان بنی امویہ کا مغرب میں میرے خیال سے یہی حال تھا۔ اس کی بسط و تفصیل ان شاء اللہ کتاب الاحکام کی کسی مناسب جگہ ہم کریں گے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿31﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿32﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿33﴾

---

(1) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الفتن: باب قول النبی ﷺ سترون بعدی اموراً تنکرونها (۷۰۵٦) صحیح مسلم: کتاب الطهارة: باب وجوب طاعة الامراء فی غیر معصیة (۱۷۰۹) صحیح ابن حبان (٤٥٤٧) مسند احمد (٥/٣١٦)]

(2) [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الامارة؛ باب حکم من فرق امر المسلمین وهو مجتمع (۱۸۵۲) ابو داؤد: کتاب السنة: باب فی الخوارج (٤٧٦٢) نسائی: کتاب المحاربة: باب قتل من فارق الجماعة (٤٠٢٦) مسند احمد (٤/٢٦١)]

اور اللہ تعالیٰ نے آدم (علیہ السلام) کو تمام نام سکھا کر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو ان چیزوں کے نام بتاؤ ○ ان سب نے کہا اے اللہ تیری ذات پاک ہے ہمیں تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھا رکھا ہے پورے علم و حکمت والا تو تو ہی ہے ○ اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) سے فرمایا تم ان کے نام بتا دو۔ جب انہوں نے بتا دیئے تو فرمایا کیا میں نے تمہیں (پہلے ہی سے) نہ کہا تھا کہ زمین اور آسمان کا غیب میں ہی جانتا ہوں اور میرے علم میں ہے جو تم ظاہر کر رہے ہو اور جو تم چھپاتے تھے ○

فرشتوں پر آدم علیہ السلام کی فضیلت کا سبب: یہاں سے اس بات کا بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم میں حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر بھی فضیلت دی۔ یہ واقعہ فرشتوں کے سجدہ کرنے کے بعد کا ہے لیکن اللہ کی جو حکمت آپ کے پیدا کرنے میں تھی اور جس کا علم فرشتوں کو نہ تھا اور اس کا اجمالی بیان اوپر کی آیت میں گذرا ہے اس کی مناسبت کی وجہ سے اس واقعہ کو پہلے بیان کیا اور فرشتوں کا سجدہ کرنا جو اس سے پہلے واقعہ ہوا تھا بعد میں بیان کر دیا تا کہ خلیفہ کے پیدا کرنے کی مصلحت اور حکمت ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شرافت اور فضیلت حضرت آدم علیہ السلام کو اس لیے ملی کہ انہیں وہ علم حاصل ہے جس سے فرشتے خالی ہیں۔

فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو تمام نام بتائے یعنی ان کی تمام اولاد کے سب جانوروں، زمین، آسمان، پہاڑ، تری، خشکی، گھوڑے، گدھے، برتن، چرند، پرند، فرشتے، تارے وغیرہ تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے۔ [1] امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرشتوں اور انسانوں کے نام معلوم کرائے گئے تھے کیونکہ اس کے بعد ﴿عَرَضَهُمْ﴾ آتا ہے اور یہ ذی عقل لوگوں کے لیے آتا ہے۔ لیکن یہ کوئی ایسی معقول وجہ نہیں جہاں ذی عقل اور غیر ذی عقل جمع ہوتے ہیں وہاں جو لفظ لایا جاتا ہے وہ عقل و ہوش رکھنے والوں کا ہی لایا جاتا ہے جیسے قرآن میں ہے ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ﴾ (النور/٤٥) الخ اللہ تعالیٰ نے تمام جانوروں کو پانی سے پیدا کیا جن میں سے بعض تو پیٹ کے بل گھسٹتے ہیں بعض دو پیروں پر چلتے ہیں بعض چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے وہ ہر چیز پر قادر ہے پس اس آیت سے ظاہر ہے کہ غیر ذی عقل بھی داخل ہیں مگر صیغے سب ذی عقل کے ہیں۔

علاوہ ازیں "عَرَضَهُنَّ" بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں ہے اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرات میں "عَرَضَهَا" بھی ہے۔ صحیح قول یہی ہے کہ تمام چیزوں کے نام سکھائے تھے ذاتی نام بھی صفاتی نام بھی اور کاموں کے نام بھی، جیسے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ گوز کا نام تک بھی بتایا گیا تھا۔

صحیح بخاری کتاب التفسیر میں اس آیت کی تفسیر میں حضرت امام بخاری رحمہ اللہ یہ حدیث لائے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایماندار قیامت کے دن جمع ہوں گے اور کہیں گے کیا اچھا ہوتا اگر کسی کو ہم اپنا سفارشی بنا کر اللہ کے پاس بھیجیں چنانچہ یہ سب کے سب حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے کہیں گے کہ آپ ہم سب کے باپ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اپنے فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہماری سفارش لے جائیں۔ جو ہم اس سے راحت پائیں۔

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٤٥٨)]

حضرت آدم علیہ السلام یہ سن کر جواب دیں گے کہ میں اس قابل نہیں۔ انہیں اپنا گناہ یاد آ جائے گا۔ تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا۔ سب لوگ یہ جواب سن کر حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے، آپ بھی یہی جواب دیں گے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اپنے بیٹے کے لیے اپنا دعا مانگنا یاد کر کے شرما جائیں گے، اور فرمائیں گے تم خلیل الرحمٰن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ یہ سب آپ کے پاس آئیں گے لیکن یہاں سے بھی یہی جواب پائیں گے۔ آپ فرمائیں گے تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ جن سے اللہ نے کلام کیا اور جنہیں تورات عنایت فرمائی۔ یہ سن کر سب کے سب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور آپ سے بھی یہی درخواست کریں گے لیکن یہاں سے بھی جواب پائیں گے آپ کو بھی ایک شخص کو بغیر قصاص کے مار ڈالنا یاد آ جائے گا اور شرمندہ ہو جائیں گے اور فرمائیں گے تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ یہ سب ان کے پاس بھی جائیں گے لیکن یہاں سے بھی یہی جواب ملے گا کہ میں اس لائق نہیں تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ جن کے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے گئے ہیں۔ اب وہ سارے کے سارے میرے پاس آئیں گے میں آمادہ ہو جاؤں گا اور اپنے رب سے اجازت طلب کروں گا۔ مجھے اجازت دے دی جائے گی میں اپنے رب کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑوں گا جب تک اللہ کو منظور ہو گا سجدے میں ہی پڑا رہوں گا پھر آواز آئے گی کہ سر اٹھایئے سوال کیجیے پورا کیا جائے گا، کہیے سنا جائے گا، شفاعت کیجیے قبول کی جائے گی۔ اب میں اپنا سر اٹھاؤں گا اور اللہ تعالیٰ کی وہ وہ تعریفیں بیان کروں گا جو اسی وقت اللہ تعالیٰ مجھے سکھائے گا پھر میں شفاعت کروں گا۔ میرے لیے حد مقرر کر دی جائے گی میں انہیں جنت میں پہنچا کر پھر آؤں گا۔ پھر اپنے رب کو دیکھ کر اسی طرح سجدہ میں گر پڑوں گا۔ پھر شفاعت کروں گا پھر حد مقرر ہو گی انہیں بھی جنت میں پہنچا کر تیسری مرتبہ آؤں گا پھر چوتھی بار حاضر ہوں گا یہاں تک کہ جہنم میں صرف وہی رہ جائیں گے جنہیں قرآن نے روک رکھا ہو اور جن کے لیے جہنم کی مداومت واجب ہو گئی ہو [1] (یعنی شرک و کفر کرنے والے) صحیح مسلم میں، نسائی میں، ابن ماجہ وغیرہ میں یہ حدیث شفاعت موجود ہے۔ [2]

صرف اللہ ہی عالم الغیب: یہاں اس کے وارد کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اس حدیث میں یہ جملہ بھی ہے کہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور ان سے فرمایا کہ لو اگر تم اپنے قول میں سچے ہو کہ تم ساری مخلوق سے زیادہ علم والے ہو یا اپنی اس بات میں سچے ہو کہ اللہ تعالیٰ زمین میں خلیفہ نہ بنائے گا تو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ یہ بھی مروی ہے کہ اگر تم اپنی اس بات میں کہ "بنی آدم فساد کریں گے اور خون بہائیں گے" سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ۔ [3] لیکن قول پہلا ہی ہے۔ گویا اس میں انہیں ڈانٹا گیا کہ بتاؤ تمہارا قول کہ تم ہی زمین کی خلافت کے لائق ہو اور انسان نہیں۔ تم ہی میرے

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب التفسیر: (٤٤٧٦)]

[2] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب ادنی اهل الجنة منزلة فیها (١٩٣) ابن ماجه: کتاب الزهد: باب ذکر الشفاعة (٤٣١٢) مسند احمد (٢٤٤/٣)]

[3] [عبدالرزاق (٤٢/١)]

تسبیح خواں اور اطاعت گزار ہو اور انسان نہیں اگر تم صحیح ہو تو لو یہ چیزیں جو تمہارے سامنے موجود ہیں۔ انہی کے نام بتاؤ۔ اور اگر تم نہیں بتا سکتے تو سمجھ لو کہ جب موجودہ چیزوں کے نام بھی تمہیں معلوم نہیں تو آئندہ آنے والی چیزوں کی نسبت تمہیں علم کیسے ہوگا ؟ فرشتوں نے یہ سنتے ہی اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی اور بڑائی اور اپنے علم کی کمی بیان کرنا شروع کر دی اور کہہ دیا کہ جسے جتنا کچھ اے اللہ تو نے سکھا دیا اتنا ہی علم اسے حاصل ہے تمام چیزوں پر احاطہ رکھنے والا علم تو صرف تجھی کو ہے تو ہر چیز کا جاننے والا ہے اپنے تمام احکام میں حکمت رکھنے والا ہے جسے جو سکھائے وہ بھی حکمت سے اور جسے نہ سکھائے وہ بھی حکمت تو حکمتوں والا اور عدل والا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: سبحان اللہ کے معنی اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کے ہیں کہ وہ ہر برائی سے منزہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اپنے پاس کے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ایک مرتبہ سوال کیا کہ ﴿ لَآ اِلٰـهَ اِلاَّ اللّٰهُ ﴾ تو ہم جانتے ہیں لیکن "سُبْحَانَ اللّٰهِ" کیا کلمہ ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ اس کلمہ کو باری تعالیٰ نے اپنے نفس کے لیے پسند فرمایا ہے اور اس سے وہ خوش ہوتا ہے اور اس کا کہنا اسے محبوب ہے۔ حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے اور تمام برائیوں سے پاکیزگی کا بیان ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے نام بتا دیئے کہ تمہارا نام جبرئیل ہے تمہارا نام میکائیل ہے، تم اسرافیل ہو یہاں تک کہ چیل کوے وغیرہ سب کے نام بھی جب ان سے پوچھے گئے تو انہوں نے بتا دیئے۔ [1] جب حضرت آدم علیہ السلام کی یہ فضیلت فرشتوں کو معلوم ہوئی تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا دیکھو میں نے تم سے پہلے نہ کہا تھا کہ میں ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہوں جیسے اور جگہ ہے ﴿ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴾ (طٰہٰ / ۷) تم بلند آواز سے کہو (یا نہ کہو) اللہ تو پوشیدہ سے پوشیدہ چیز کو جانتا ہے اور ارشاد فرمایا ﴿ اَلَّا يَسْجُدُوْا ﴾ (النمل / ۲۵-۲۶) الخ کیوں یہ لوگ اس اللہ تعالیٰ کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزوں کو نکالتا ہے اور جو تمہارے ہر باطن اور ظاہر کو جانتا ہے اللہ تعالیٰ اکیلا ہی معبود ہے اور وہی عرش عظیم کا رب ہے۔ جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے تھے اسے بھی میں جانتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ ابلیس کے دل میں تکبر اور غرور تھا اسے میں جانتا تھا۔

فرشتوں کا یہ کہنا کہ زمین میں ایسی شخصیت کو کیوں پیدا کرتا ہے جو فساد کرے اور خون بہائے یہ تو وہ قول تھا جسے انہوں نے ظاہر کیا تھا اور جو چھپایا تھا وہ ابلیس کے دل میں غرور اور تکبر تھا۔ ابن عباس، ابن مسعود اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور سعید بن جبیر، مجاہد اور سدی اور ضحاک اور ثوری رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ بھی اسی کو پسند فرماتے ہیں اور ابو العالیہ ربیع بن انس حسن اور قتادہ رحمہم اللہ کا قول ہے کہ ان کی باطن بات ان کا یہ کہنا تھا کہ جس مخلوق کو بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرے گا ہم اس سے زیادہ عالم اور زیادہ بزرگ ہوں گے لیکن بعد میں ثابت ہو گیا اور خود انہوں نے بھی جان لیا کہ آدم علیہ السلام کو علم اور فضیلت دونوں میں ان پر فوقیت حاصل ہے۔ حضرت عبد الرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: جس طرح تم ان چیزوں کے ناموں سے بے خبر ہو اسی طرح تم یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ان میں بھلے برے ہر طرح کے ہوں گے فرمانبردار بھی ہوں گے اور نافرمان

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۱۱۸-۱۱۹)]

بھی۔ اور میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ مجھے جنت دوزخ دونوں کو بھرنا ہے لیکن تمہیں میں نے اس کی خبر نہیں دی۔ اب جب کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیا ہوا علم دیکھا تو ان کی بندگی کا اقرار کر لیا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں سب سے اولیٰ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے کہ آسمان و زمین کے غیب کا علم تمہارے ظاہر و باطن کا علم مجھے ہے ان کے ظاہری قول کو اور ابلیس کے باطنی عجب و غرور کو بھی جانتا تھا۔[1] اس میں چھپانے والا صرف ایک ابلیس ہی تھا لیکن صیغہ جمع کا لایا گیا ہے اس لیے کہ عرب میں یہ دستور ہے اور ان کے کلام میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ ایک کے یا بعض کے ایک کام کو سب کی طرف نسبت کر دیا کرتے وہ کہتے ہیں کہ لشکر مارڈالا گیا یا انہیں شکست ہوئی حالانکہ شکست اور قتل ایک کا یا بعض کا ہوتا ہے اور صیغہ جمع کا لاتے ہیں۔ بنو تمیم کے ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے حجرے کے آگے سے پکارا تھا لیکن قرآن میں اس کا بیان ان لفظوں میں ہے کہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ﴾ (الحجرات/ ٤) جو لوگ تمہیں اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) حجروں کے آگے سے پکارتے ہیں۔ تو دیکھئے کہ پکارنے والا ایک تھا اور صیغہ جمع کا لایا گیا۔ اسی طرح ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ میں بھی اپنے دل میں بدی کو چھپانے والا صرف ایک ابلیس ہی تھا لیکن صیغہ جمع کا لایا گیا۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۗ وَكَانَ مِنَ
الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ تھا ہی کافروں میں ○

تخلیق آدم اور انعامات الٰہی: حضرت آدم علیہ السلام کی اس بہت بڑی بزرگی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنا بہت بڑا احسان فرمایا اور خبر دی کہ اس نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ اس کی تصدیق میں بہت سی حدیثیں ہیں ایک تو حدیث شفاعت جو ابھی بیان ہوئی۔ دوسری حدیث میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ میری ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے کرا دیجیے جو خود بھی جنت سے نکلے اور ہم سب کو بھی نکالا۔ جب دونوں پیغمبر علیہما السلام جمع ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ تم وہ آدم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی روح تم میں پھونکی اور اپنے فرشتوں سے تمہیں سجدہ کرایا[2] (آخر تک) پوری حدیث عنقریب بیان ہو گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ابلیس فرشتوں کے ایک قبیلہ میں سے تھا جنہیں جن کہتے تھے جو آگ کے

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/ ٤٩٨)]

[2] [حسن: ابوداؤد: کتاب السنة: باب فی القدر (٤٧٠٢)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [السلسلة الصحیحة (١٧٠٢)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے حسن کہتے ہیں۔]

شعلوں سے پیدا ہوئے تھے۔ اس کا نام حارث تھا اور جنت کا خازن تھا۔ اس قبیلے کے سوا اور فرشتے سب کے سب نوری تھے۔ قرآن نے بھی ان جنوں کی پیدائش کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے ﴿مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ﴾ (الرحمن/۱۵) آگ کے شعلے کی جو تیزی سے بلند ہوتے ہیں اسے ﴿مَارِجٍ﴾ کہتے ہیں جس سے جن پیدا کیے گئے تھے اور انسان مٹی سے پیدا کیا گیا۔ زمین میں پہلے جن بستے تھے۔ انہوں نے فساد اور خون ریزی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو فرشتوں کا لشکر دے کر بھیجا انہی کو ''جن'' کہا جاتا تھا۔ ابلیس نے لڑ بھڑ کر مارتے اور قتل کرتے ہوئے انہیں سمندر کے جزیروں اور پہاڑوں کے دامنوں میں پہنچا دیا اور ابلیس کے دل میں یہ تکبر سما گیا کہ میں نے وہ کام کیا ہے جو کسی اور سے نہ ہو سکا۔ چونکہ دل کی اس بدی اور اس پوشیدہ خودی کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو تھا۔ جب پروردگار نے فرمایا کہ زمین میں میں خلیفہ پیدا کرنا چاہتا ہوں تو ان فرشتوں نے عرض کیا کہ ایسے کو کیوں پیدا کرتا ہے جو اگلی قوم کی طرح فساد و خون ریزی کریں تو انہیں جواب دیا گیا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے یعنی ابلیس کے دل میں جو کبر و غرور ہے اس کا مجھی کو علم ہے تمہیں خبر نہیں پھر آدم علیہ السلام کی مٹی اٹھائی گئی جو چکنی اور اچھی تھی۔ جب اس کا خمیر اٹھا تب اس سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور چالیس دن تک وہ یونہی پتلے کی شکل میں رہے ابلیس آتا تھا اور اس پر لات مار کر دیکھتا تھا تو وہ بجتی مٹی ہوتی جیسے کوئی کھوکھلی چیز ہو پھر منہ کے سوراخ سے گھس کر پیچھے کے سوراخ سے اور اس کے خلاف آتا جاتا رہا اور کہتا رہا کہ درحقیقت یہ کوئی چیز نہیں اور اگر میں اس پر مسلط کیا گیا تو اسے برباد کر کے چھوڑوں گا اور اسے مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں ہرگز تسلیم نہ کروں گا۔

پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان میں روح پھونکی اور وہ سر کی طرف سے نیچے آئی تو جہاں جہاں تک پہنچتی گئی خون گوشت بنتا گیا۔ جب ناف تک روح پہنچی تو اپنے جسم کو دیکھ کر خوش ہوئے اور فوراً اٹھنا چاہا لیکن نیچے کے دھڑ میں روح نہیں پہنچی تھی اس لیے اٹھ نہ سکے اسی جلدی کا بیان اس آیت میں ہے ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾ (الاسراء/۱۱) یعنی انسان ہے بے صبرا اور جلد باز ہے نہ تو خوشی میں نہ رنج میں۔ جب روح جسم میں پہنچی اور چھینک آئی تو کہا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ﴿يَرْحَمُكَ اللّٰهُ﴾ پھر صرف ابلیس کے ساتھی فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو سب نے تو سجدہ کر لیا لیکن ابلیس کا وہ غرور و تکبر ظاہر ہو گیا اس نے نہ مانا اور سجدے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا میں اس سے بہتر ہوں اس سے بڑی عمر والا ہوں۔ اور اس سے قوی اور مضبوط ہوں۔ یہ مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں اور آگ مٹی سے قوی ہے۔ اس کے انکار پر اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی رحمت سے ناامید کر دیا اور اسی لیے اسے ابلیس کہا جاتا ہے۔ اس کی نافرمانی کی سزا میں اسے راندہ درگاہ شیطان بنا دیا پھر حضرت آدم علیہ السلام کو انسان جانور زمین سمندر پہاڑ وغیرہ کے نام بتا کر ان کو ان فرشتوں کے سامنے پیش کیا جو ابلیس کے ساتھی تھے اور آگ سے پیدا شدہ تھے اور ان سے فرمایا کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ میں زمین میں اسے خلیفہ نہ بناؤں تو ذرا مجھے ان چیزوں کے نام تو بتا دو۔ جب ان فرشتوں نے دیکھا کہ ہماری اگلی بات سے اللہ العالمین ناراض ہے تو وہ کہنے لگے کہ اللہ عزوجل تو اس بات سے پاک ہے کہ تیرے سوا اور غیب کو جانے ہماری توبہ ہے اور اقرار ہے کہ ہم غیب داں نہیں۔ ہم تو صرف وہی جان سکتے ہیں جس کا

علم تو ہمیں دے دے۔ جیسے تو نے ان کے نام صرف حضرت آدم علیہ السلام کو ہی سکھائے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم انہیں ان تمام چیزوں کے نام بتادو چنانچہ انہوں نے بتادیئے تو فرمایا اے فرشتو! کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان زمین کے غیب کا جاننے والا صرف میں اکیلا ہی ہوں اور کوئی نہیں۔ میں ہر پوشیدہ چیز کو بھی ویسا ہی جانتا ہوں جیسے ظاہر کو یعنی ابلیس کا اندرونی کبر وغرور بھی میں جانتا ہوں، اور تم سب اس سے بے خبر ہو لیکن یہ قول بھی غریب ہے اور اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں خامیاں ہیں ہم اگر انہیں الگ الگ بیان کریں تو مضمون بہت بڑھ جائے گا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما تک اس اثر کی سند بھی وہی ہے جس سے ان کی مشہور تفسیر مروی ہے۔ ایک اور حدیث میں بھی اسی طرح مروی ہے جس کے متن میں کچھ کمی زیادتی بھی ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ زمین کی مٹی لینے کے لیے جب جبرائیل علیہ السلام گئے تو زمین نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی ہوں کہ تو مجھ میں سے کچھ گھٹائے وہ واپس چلے گئے پھر ملک الموت کو بھیجا۔ زمین نے ان سے بھی یہی کہا لیکن انہوں نے جواب دیا کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں اللہ کا حکم پورا کیے بغیر واپس چلا جاؤں چنانچہ انہوں نے تمام روئے زمین سے ایک ایک مٹھی مٹی لی۔ چونکہ مٹی کا رنگ کہیں سرخ تھا کہیں سفید کہیں سیاہ اسی وجہ سے انسانوں کی رنگتیں بھی طرح طرح کی ہوئیں لیکن یہ روایت بھی بنو اسرائیل کی روایات سے ماخوذ ہے غالباً اس میں بہت سی باتیں پیچھے کے لوگوں کی ملائی گئی ہیں۔ صحابی کا بیان ہی نہیں اگر صحابی کا قول بھی ہو تو انہوں نے بعض اگلی کتابوں سے لیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

ابلیس کی معرفت: حاکم اپنی مستدرک میں بہت سی ایسی روایتیں لائے ہیں اور ان کی سند کو بخاری سے مشروط کیا ہے۔ [1] مقصد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ تم حضرت آدم کو سجدہ کرو تو اس خطاب میں ابلیس بھی داخل تھا اس لیے کہ گو وہ ان میں سے نہ تھا لیکن ان ہی جیسا اور ان ہی جیسے کام کرنے والا تھا اس لیے اس خطاب میں داخل تھا اور پھر نافرمانی کی سزا بھگتی۔ اس کی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ﴾ [2] کی تفسیر میں آئے گی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں نافرمانی سے پہلے وہ فرشتوں میں تھا۔ عزازیل اس کا نام تھا زمین پر اس کی رہائش تھی اجتہاد اور علم میں بہت بڑا تھا اور اسی وجہ سے دماغ میں رعونت تھی اور اس کی جماعت کا اور اس کا تعلق جنوں سے تھا۔ [3] اس کے چار پر تھے۔ جنت کا خازن تھا زمین اور آسمان دنیا کا سلطان تھا۔ حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابلیس کبھی فرشتہ نہ تھا اس کی اصل جنات سے ہے جیسے کہ آدم علیہ السلام کی اصل انس سے ہے اس کی اسناد صحیح ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم رحمہ اللہ اور شہر بن حوشب رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے سعد بن مسعود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ فرشتوں نے جنات کو جب مارا تب اسے قید کیا تھا اور آسمان پر لے گئے تھے وہاں کی عبادت کی وجہ سے رہ پڑا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ پہلے ایک مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا انہیں حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کو کہا۔ انہوں نے انکار کیا جس پر وہ جلا دیئے گئے پھر دوسری مخلوق پیدا کی ان کا بھی یہی حشر ہوا پھر تیسری مخلوق پیدا کی انہوں نے تعمیل ارشاد کی لیکن یہ اثر بھی غریب ہے اور اس کی اسناد بھی تقریباً غیر صحیح ہے۔ اس میں

---

[1] [صحیح: مستدرك حاكم (٢٦١/٢) حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔]

[2] [سورة الكهف: آیت ٥٠]   [3] [تفسیر ابن جریر الطبری (٥٠٢/١)]

ایک راوی مبہم ہے اس وجہ سے یہ روایت قابل حجت نہیں "کَـافِـرِیْـنَ" سے مراد نافرمان ہے۔ ابلیس کی ابتداء آفرینش ہی کفر وضلالت پر تھی کچھ دن ٹھیک ٹھاک رہا لیکن پھر اپنی اصلیت پر آ گیا۔ سجدہ کرنے کا حکم بجالانا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور آدم علیہ السلام کا اکرام تھا۔

بعض لوگوں کا قول ہے کہ یہ سجدہ سلام اور عزت و اکرام کا تھا جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں فرمان ہے کہ انہوں نے اپنے ماں باپ کو تخت پر بٹھا لیا اور سب کے سب سجدہ میں گر پڑے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا ابا یہی میرے اس خواب کی تعبیر ہے جسے میرے رب نے سچا کر دکھایا۔ [۱] اگلی امتوں میں سجدہ تعظیم جائز تھا لیکن ہمارے دین میں یہ منسوخ ہو گیا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے شامیوں کو اپنے سرداروں اور علماء کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے گذارش کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس کے زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں کسی انسان کو کسی انسان کے سامنے سجدہ کرنے کی اجازت دینے والا ہوتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کریں کیونکہ ان کا ان پر بہت بڑا حق ہے۔ [۲]

امام رازی رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے بعض کہتے ہیں کہ سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام بطور قبلہ (یعنی سمت) کے تھے جیسے قرآن کریم میں ہے ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ (الاسراء / ۷۸) لیکن اس میں بھی اختلاف ہے اور پہلے ہی قول کا زیادہ صحیح ہونا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کے اکرام بڑائی احترام اور سلام کے طور پر تھا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ماتحت تھا کیونکہ اس کا حکم تھا جس کی بجا آوری ضروری تھی۔ امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو قوی قرار دیا ہے اور اس کے سوا دوسرے اقوال کو ضعیف قرار دیا ہے ایک تو حضرت آدم علیہ السلام کا بطور قبلہ کے ہونا جس میں کوئی بڑا اشرف ظاہر نہیں ہوتا دوسرے سجدے سے مراد پست عاجز ہونا نہ کہ زمین میں ماتھا ٹکا کر حقیقی سجدہ کرنا لیکن یہ دونوں تاویلیں ضعیف ہیں۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں سب سے پہلا گناہ یہی تکبر ہے جو ابلیس سے سرزد ہوا۔ صحیح حدیث میں ہے جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ [۳] اسی تکبر کفر و عناد کی وجہ سے ابلیس کے گلے میں طوق لعنت پڑا اور رحمت سے مایوس ہو کر جناب باری سے دھتکارا گیا۔ یہاں "كَانَ صَارَ" کے معنی میں بھی بتلایا گیا ہے جیسے کہ ﴿فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ﴾ (ہود / ۴۳) اور ﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (البقرہ ۳۵) شاعروں کے شعروں میں بھی اس کا ثبوت ہے تو معنی یہ ہوئے کہ وہ کافر ہو گیا ابن فورک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کافروں میں سے تھا۔

---

[۱] [سورة یوسف : آیت ۱۰۰]

[۲] [**صحیح** : ابن ماجہ : کتاب النكاح : باب حق الزوج علی المراۃ (۱۸۵۲) مسند احمد (۴/ ۳۸۱) بزار (۱۴۶۱) طبرانی (۷۲۹۴) بیهقی (۷/ ۲۹۲) ابن حبان (۴۱۷۱) عبدالرزاق (۲۰۰۰۹)] امام ابن حبانؒ، امام حاکمؒ اور امام ذہبیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ شیخ البانیؒ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ [ارواء الغلیل (۷/ ۵۵-۵۶) السلسلہ الصحیحہ (۱۲۰۳)] حافظ زبیر علی زئی اس کی سند کو حسن کہتے ہیں۔]

[۳] [**صحیح** : صحیح مسلم : کتاب الایمان : باب تحریم الکبر و بیانہ (۹۱)]

قرطبی رحمہ اللہ اس کو ترجیح دیتے ہیں اور یہاں ایک مسئلہ بیان فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے ہاتھ سے کچھ کرامتیں سرزد ہو جانا اس کے ولی اللہ ہونے کی دلیل نہیں گو بعض صوفی اور رافضی اس کے خلاف بھی کہتے ہیں اس لیے کہ ہم اس بات کا کسی کے لیے فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ ایمان ہی کی حالت میں اللہ سے جا ملے گا اسی شیطان کو دیکھئے ولی ہی نہیں بلکہ فرشتہ بنا ہوا تھا لیکن آخر سردار کفر و کفار ہو گیا۔ علاوہ ازیں ایسی خلاف عادت و عقل باتیں جو بظاہر کرامات نظر آتی ہیں اولیاء اللہ کے سوا اور لوگوں کے ہاتھوں سے بھی سرزد ہوتی ہیں بلکہ فاسق فاجر مشرک کافر سے بھی ظاہر ہو جاتی ہیں۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ﴾ (الدخان / ۱۰) کی آیت دل میں سوچ کر جب ابن صیاد کافر سے پوچھا کہ میں نے کیا سوچا ہے تو اس نے کہا تھا دُخ۔ [1]

بعض روایات میں ہے کہ غصہ کے وقت وہ اتنا پھول جاتا کہ اس کے جسم سے تمام راستہ رک جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے مارا۔ [2] دجال کی تو ایسی بہت سی باتیں احادیث میں وارد ہیں مثلاً اس کا آسمان سے بارش برسانا زمین سے پیداوار اگانا زمین کے خزانوں کا اس کے پیچھے لگنا۔ ایک نوجوان کو قتل کر کے پھر جلانا وغیرہ وغیرہ۔ [3]

حضرت لیث بن سعد رضی اللہ عنہ اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر تم کسی کو پانی پر چلتے ہوئے اور ہواؤں میں اڑتے ہوئے دیکھو تو اسے ولی نہ سمجھ بیٹھو جب تک کہ اس کے تمام اعمال و افعال قرآن و حدیث کے مطابق نہ پاؤ۔ اس سجدے کا حکم زمین و آسمان کے تمام فرشتوں کو تھا گو ایک جماعت کا قول یہ بھی ہے کہ صرف زمین کے فرشتوں کو یہ حکم تھا لیکن یہ ٹھیک نہیں قرآن کریم میں ہے ﴿فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ○ إِلَّا إِبْلِيسَ﴾ (الحجر ۳۰-۳۱) یعنی ابلیس کے سوا تمام فرشتوں نے سجدہ کیا پس اول تو جمع کا صیغہ لانا پھر "كُلُّهُمْ" سے تاکید کرنا پھر "أَجْمَعُونَ" کہنا اس کے بعد صرف ابلیس کا استثناء کرنا ان چاروں وجوہات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حکم عام تھا۔ واللہ اعلم۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿٣٥﴾ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿٣٦﴾

اور ہم نے کہہ دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے ○ لیکن شیطان نے بہکا کر وہاں سے نکلوا ہی دیا اور ہم نے کہہ دیا کہ اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور ایک وقت مقرر تک تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ○

آدم علیہ السلام جنت میں اور حواء علیہا السلام کی تخلیق: حضرت آدم علیہ السلام کی یہ اور بزرگی بیان ہو رہی ہے کہ فرشتوں سے سجدہ

---

[1] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الجنائز : باب اذا اسلم الصبی فمات (۱۳۵٤) صحیح مسلم : کتاب الفتن : باب ذکر ابن صیاد (۲۹۳۰)]

[2] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الفتن : باب ذکر ابن صیاد (۲۹۳۲)]

[3] [صحیح : بخاری : کتاب الفتن : باب ذکر الدجال (۷۱۲۲) صحیح مسلم : کتاب الفتن : باب ذکر ابن صیاد (۲۹۳۳)]

کرانے کے بعد انہیں جنت میں رکھا اور ہر چیز کی رخصت دے دی۔ ابن مردویہ کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے؟ آپ نے فرمایا ہاں! نبی بھی، رسول بھی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے آمنے سامنے بات چیت کی اور انہیں فرمایا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ (1) عام مفسرین کا بیان ہے کہ آسمانی جنت میں انہیں بسایا گیا تھا لیکن معتزلہ اور قدریہ کہتے ہیں کہ یہ جنت زمین پر تھی۔ سورۂ اعراف میں اس کا بیان آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اس عبارت قرآنی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں رہنے سے پہلے حضرت حوا رضی اللہ عنہا پیدا کی گئی تھیں۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب وغیرہ کے علماء سے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے کہ ابلیس کے مردود قرار دینے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کے علم کو ظاہر کر کے پھر ان پر اونگھ کی فوقیت طاری کر دی گئی اور ان کی بائیں پسلی سے حضرت حوا رضی اللہ عنہا کو پیدا کیا۔ جب آنکھ کھول کر حضرت آدم علیہ السلام نے انہیں دیکھا تو اپنے خون اور گوشت کی وجہ سے ان میں انس ومحبت ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ پھر پروردگار نے انہیں ان کے نکاح میں دیا اور جنت میں رہائش کا حکم عطا فرمایا۔ (2) بعض کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے جنت میں داخل ہو جانے کے بعد حضرت حوا پیدا کی گئیں۔ حضرت ابن عباس، ابن مسعود وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ ابلیس کو جنت سے نکالنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں جگہ دی گئی لیکن تن تنہا تھے اس وجہ سے ان کی نیند میں حضرت حوا رضی اللہ عنہا کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ جاگے انہیں دیکھا تو پوچھا تم کون ہو؟ اور کیوں پیدا کی گئی ہو؟ حضرت حوا رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں ایک عورت ہوں اور آپ کے ساتھ رہنے اور تسکین کا سبب بننے کے لیے پیدا کی گئی ہوں تو فوراً فرشتوں نے پوچھا فرمایئے ان کا نام کیا ہے؟ حضرت آدم نے کہا "حوا" انہوں نے کہا اس نام کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ فرمایا اس لیے کہ یہ ایک زندہ سے پیدا کی گئی ہیں۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ کی آواز آئی، اے آدم اب تم اور تمہاری بیوی جنت میں با آرام واطمینان رہو اور جو چاہو کھاؤ۔

لیکن ایک خاص درخت سے روکنا دراصل امتحان تھا۔ بعض کہتے ہیں یہ انگور کی بیل تھی۔ کوئی کہتا ہے۔ گیہوں کا درخت تھا۔ کسی نے سنبلہ کہا ہے۔ کسی نے کھجور کسی نے انجیر کہا ہے۔ کسی نے کہا ہے اس درخت کے کھانے سے انسانی حاجت ہوتی تھی جو جنت کے لائق نہیں۔ کسی نے کہا ہے، اس درخت کا پھل کھا کر فرشتے ہمیشہ کی زندگی پا گئے ہیں۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کوئی ایک درخت تھا جس سے اللہ نے روک دیا۔ نہ قرآن سے اس کا تعین ثابت ہوتا ہے نہ کسی صحیح حدیث سے اور مفسرین میں اختلاف ہے اور اس کے معلوم ہونے سے کوئی اہم فائدہ اور نہ معلوم ہونے سے کوئی نقصان نہیں لہٰذا اس کی جستجو کی کیا ضرورت؟ اللہ ہی کو اس کا بہتر علم ہے۔ امام رازی وغیرہ نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے اور ٹھیک بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے "عنہا" کی ضمیر کا مرجع بعض نے جنت

---

(1) [صحیح: ابن حبان (٣٦١) ابن عدی (٢٦٩٩/٧) مسند احمد (١٧٨/٥) مجمع الزوائد (١٦٠/١) بیہقی فی السنن (٤/٩) ابونعیم فی الحلیة (١٦٨/١) طبرانی اوسط (٤٢٥٩)] حافظ زبیر علی زئی کی تحقیق کے مطابق اس کی سند صحیح ہے۔]

(2) [تفسیر ابن جریر الطبری (٥١٤/١)]

کہا ہے اور بعض نے شجرہ۔ ایک قرات "فَاَزَالَهُمَا" بھی ہے تو معنی یہ ہوئے کہ اس جنت سے ان دونوں کو بے تعلق اور الگ کر دیا اور دوسرے معنی یہ بھی ہوئے کہ اسی درخت کے سبب شیطان نے انہیں بہکا دیا۔

زمین پر انسانی زندگی کی ابتدا: لفظ عن سبب کے معنی میں بھی آیا ہے "يُؤْفَكُ عَنْهُ" (1) میں ۔اس نافرمانی کی وجہ سے جنتی لباس اور وہ پاک مکان، نفیس روزی وغیرہ سب چھن گئی اور دنیا میں اتار دیئے گئے اور کہہ دیا گیا کہ اب تو زمین میں ہی تمہارا رزق ہے، قیامت تک یہیں پڑے رہو گے اور اس سے فائدہ حاصل کرتے رہو گے۔ سانپ اور ابلیس کا قصہ، یعنی ابلیس کس طرح جنت میں پہنچا۔ کس طرح وسوسہ ڈالا وغیرہ، اس کے بارے میں لمبے چوڑے قصے مفسرین نے وارد کیے ہیں لیکن وہ سب بنی اسرائیل کے ہاں کا خزانہ ہے، تاہم ہم انہیں سورۂ اعراف میں بیان کریں گے کیونکہ اس واقعہ کا بیان وہاں کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہے۔

ابن ابی حاتم کی ایک حدیث میں ہے کہ درخت کا پھل چکھتے ہی جنتی لباس اتر گیا۔ اپنے آپ کو ننگا دیکھ کر ادھر ادھر دوڑنے لگے لیکن چونکہ قد طویل تھا اور سر کے بال لمبے تھے، وہ ایک درخت میں اٹک گئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے آدم علیہ السلام کیا مجھ سے بھاگتے ہو؟ عرض کیا نہیں الٰہی میں تو شرمندگی سے منہ چھپائے پھرتا ہوں۔ (2) ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے آدم! میرے پاس سے چلے جاؤ، مجھے میری عزت کی قسم میرے پاس میرے نافرمان نہیں رہ سکتے، اگر اتنی مخلوق میں تم جیسی پیدا کروں کہ زمین بھر جائے اور پھر وہ میری نافرمانی کرے تو یقیناً اسے بھی نافرمانوں کے گھر میں پہنچا دوں۔ یہ روایت غریب ہے اور ساتھ ہی اس میں انقطاع بلکہ اعضال بھی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نماز عصر کے بعد سے لے کر سورج کے غروب ہونے تک کی ایک ساعت ہی جنت میں رہے۔ (3) حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ ایک ساعت ایک سو تیس سال کی تھی۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں نویں یا دسویں ساعت میں حضرت آدم علیہ السلام کا اخراج ہوا۔ ان کے ساتھ جنت کی ایک شاخ تھی اور جنت کے درخت کا ایک تاج سر پر تھا۔ سدی رحمہ اللہ کا قول ہے حضرت آدم علیہ السلام ہند میں اترے، آپ کے ساتھ حجر اسود تھا اور جنتی درخت کے پتے جو ہند میں پھیلا دیئے اور اس سے خوشبودار درخت پیدا ہوئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ہند کے شہر "دھنا" میں اترے تھے۔ (4) ایک روایت میں ہے کہ مکہ اور طائف کے درمیان اترے تھے۔ (5) حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام ہند میں اور مائی حوا رضی اللہ عنہا

---

(1) [سورة الذاريات : آيت ٩]

(2) [تفسير ابن ابی حاتم (١٣٩/١) بيهقى فى البعث (١٩٣)] امام حاکمؒ اور امام ذہبیؒ نے اسے صحیح کہا ہے جبکہ حافظ زبیر علی زئی کی تحقیق کے مطابق اس میں قتادہ اور حسن مدلس راوی ہیں لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔]

(3) [**حسن** : مستدرك حاكم (٥٤٢/٢)] حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔]

(4) [**ضعيف** : مستدرك حاكم (٥٤٢/٢) شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔]

(5) [**ضعيف** : تفسير ابن ابی حاتم (١٣١/١)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ یہ روایت جریر نے عطاء سے اختلاط کے بعد سنی (اس لیے ضعیف ہے)۔]

جدہ میں اتریں اور ابلیس بصرہ سے چند میل کے فاصلہ پر 'دست میساں' میں پھینکا گیا اور سانپ 'اصبہان' میں۔ (١) ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام صفا پر اور حضرت حوا مروہ پر اترے۔ اترتے وقت دونوں ہاتھ گھٹنوں پر تھے اور سر جھکا ہوا تھا اور ابلیس انگلیوں میں انگلیاں ڈالے آسمان کی طرف نظریں جمائے اترا۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام صفتیں سکھا دیں اور پھلوں کا توشہ دیا۔ (٢) ایک حدیث میں ہے کہ تمام دنوں میں بہتر دن جمعہ کا دن ہے' اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے' اسی میں جنت میں داخل کیے گئے۔ اور اسی دن نکالے گئے ملاحظہ ہو صحیح مسلم اور نسائی۔ (٣)

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی وجوہات مضمر ہیں اول تو یہ سوچنا چاہیے کہ ذرا سی لغزش پر حضرت آدم علیہ السلام کو کس قدر سزا ہوئی۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ تم گناہوں پر گناہ کیے جاتے ہو اور جنت کے طالب ہو کیا تم بھول گئے کہ تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو محض ایک ہلکے سے گناہ پر جنت سے نکال دیا گیا۔ ہم تو یہاں دشمن کی قید میں ہیں' دیکھیے ! کب صحت وسلامتی کے ساتھ اپنے وطن پہنچیں۔ فتح موصلی کہتے ہیں ہم جنتی ہیں' ابلیس کے بہکانے میں آ کر دنیا کی قید میں آ پھنسے' اب سوائے غم ورنج کے یہاں کیا رکھا ہے؟ یہ قید وبند اسی وقت ٹوٹے گی جب ہم وہیں پہنچ جائیں جہاں سے نکالے گئے ہیں۔

اگر کوئی معترض اعتراض کرے کہ جب آدم علیہ السلام آسمانی جنت میں تھے اور ابلیس راندۂ درگاہ ہو چکا تھا تو پھر وہ وہاں کیسے پہنچا؟ تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ وہ جنت زمین میں تھی لیکن اس کے علاوہ اور بھی بہت سے جواب ہیں کہ بطور اکرام کے اس کا داخل ہونا منع تھا نہ کہ بطور اہانت کے اور چوری کے۔ چنانچہ توراۃ میں ہے کہ سانپ کے منہ میں بیٹھ کر جنت میں گیا اور یہ بھی جواب ہے کہ وہ جنت میں نہیں گیا تھا بلکہ باہر ہی سے اس نے وسوسہ ان کے دل میں ڈالا تھا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ زمین میں سے ہی وسوسہ ان کے دل میں ڈالا۔ قرطبی رحمہ اللہ نے یہاں پر سانپوں کے بارے میں اور ان کے مار ڈالنے کے حکم سے متعلق حدیثیں بھی تحریر کی ہیں جو بہت مفید اور باموقع ہیں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (٣٧)

حضرت آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے ○

آدم وحوا علیہما السلام کی معافی: جو کلمات حضرت آدم علیہ السلام نے سیکھے تھے ان کا بیان خود قرآن میں موجود ہے ﴿ قَالَا

(١) [ضعیف : تفسیر ابن ابی حاتم (١ / ١٣٢)] اس کی سند میں عباد بن میسرہ راوی لین الحدیث اور صدقہ بن عمر غسانی مجہول ہے۔]

(٢) [موقوف : مستدرك حاكم (٢ / ٥٤٣) ابن جرير (٥٣٧) تفسير عبد الرزاق (١ / ٤٣) بزار في كشف الاستار (٢٢٤٥)]

(٣) [صحیح : صحیح مسلم : كتاب الجمعة : باب فضل يوم الجمعة (٨٥٤) ترمذی : ابواب الجمعة : باب ما جاء في فضل يوم الجمعة (٤٨٨) مسند احمد (٢ / ٤٠١) نسائی : كتاب الجمعة : باب ذكر فضل يوم الجمعة (٣٧٤)]

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ (اعراف/ ۲۳) یعنی ان دونوں نے کہا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو یقیناً ہم نقصان والے ہو جائیں گے۔ اکثر بزرگوں کا یہی قول ہے۔ [1] ابن عباس رضی اللہ عنہما سے احکام حج سیکھنا بھی مروی ہے۔ عبید بن عمیر کہتے ہیں وہ کلمات یہ تھے کہ انہوں نے کہا الٰہی جو خطا میں نے کی کیا اسے میرے پیدا کرنے سے پہلے میری تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا؟ یا میں نے خود اس کی ایجاد کی؟ جواب ملا کہ ایجاد نہیں بلکہ پہلے ہی لکھ دیا گیا اسے سن کر آپ نے کہا پھر اے اللہ مجھے بخشش اور معافی مل جائے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا الٰہی کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا؟ اور مجھ میں اپنی روح نہیں پھونکی؟ میرے چھینکنے پر "يَـرْحَمُكَ اللّٰهُ" نہیں کہا؟ کیا تیری رحمت غضب پر سبقت نہیں کر گئی؟ کیا میری پیدائش سے پہلے یہ خطا میری تقدیر میں نہیں لکھی تھی؟ جواب ملا کہ ہاں۔ [2] یہ سب میں نے کیا ہے تو کہا پھر یا اللہ میری توبہ قبول کر کے مجھے پھر جنت مل سکتی ہے یا نہیں؟ جواب ملا ہے کہ ہاں۔ یہ کلمات یعنی چند باتیں تھیں جو آپ نے اللہ سے سیکھ لیں۔ ابن ابی حاتم کی ایک مرفوع روایت میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہا کہ الٰہی اگر میں توبہ کروں اور رجوع کروں تو کیا جنت میں پھر بھی جا سکتا ہوں؟ جواب ملا کہ ہاں۔ اللہ سے کلمات کی تلقین حاصل کرنے کے یہی معنی ہیں۔ [3] لیکن یہ حدیث غریب ہونے کے علاوہ منقطع بھی ہے۔ بعض بزرگوں سے مروی ہے کہ کلمات کی تفسیر "رَبَّنَا ظَلَمْنَآ" الخ اور ان سب باتوں پر مشتمل ہے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ وہ کلمات یہ ہیں ﴿اَللّٰهُمَّ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَتُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ﴾ قرآن کریم میں اور جگہ ہے کیا لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے؟ [4] اور جگہ ہے جو شخص کوئی برا کام کر گزرے یا اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے پھر توبہ استغفار کرے تو وہ دیکھ لے گا کہ اللہ اس کی توبہ قبول کر لے گا اور اسے اپنے رحم و کرم میں لے لے گا۔ [5] اور جگہ ہے ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ (الفرقان/ ۷۱) الخ ان سب آیتوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اسی طرح یہاں بھی یہی فرمان ہے کہ وہ اللہ توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے والا اور بہت بڑے رحم و کرم والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس عام لطف و کرم اس کے اس فضل و رحم کو دیکھو کہ وہ اپنے گنہگار بندوں کو بھی اپنے در سے محروم نہیں کرتا۔ سچ ہے اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں نہ اس سے زیادہ کوئی مہر و کرم کرنے والا نہ اس سے زیادہ کوئی خطا بخشنے والا اور رحم و بخشش عطا فرمانے والا۔

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۵۴۳) تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۱۳٦)]

[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/ ۵۴۳)]

[3] [منقطع وضعیف : تفسیر ابن ابی حاتم (۴۱۰)، (۱/ ۱۳۵)]

[4] [سورة التوبة : آیت ۱۰۴] [5] [سورہ النسآء : آیت ۱۱۰]

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

ہم نے کہا تم سب یہاں سے چلے جاؤ جب کبھی تمہارے پاس میری ہدایت پہنچے اس کی تابعداری کرنے والوں پر کوئی خوف وغم نہیں ہوگا ○ اور جو انکار کر کے ہماری آیتوں کو جھٹلائیں وہ جہنمی ہیں اور ہمیشہ اسی میں رہیں گے ○

انبیاء کے متبعین اور منکرین کا انجام: جنت سے نکالتے ہوئے جو ہدایت حضرت آدم علیہ السلام حضرت حوا رضی اللہ عنہا اور ابلیس کو دی گئی اس کا بیان یہاں ہو رہا ہے کہ ہماری طرف سے کتابیں انبیاء اور رسول بھیجے جائیں گے، معجزات ظاہر کیے جائیں گے، دلائل بیان فرمائے جائیں گے، راہ حق واضح کر دی جائے گی، آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی آئیں گے، آپ پر قرآن کریم بھی نازل فرمایا جائے گا، جو بھی اپنے زمانے کی کتاب اور نبی کی تابعداری کرے گا اسے آخرت کے میدان میں کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ ہی دنیا کے کھو جانے پر کوئی غم ہوگا۔ سورۂ طٰہٰ میں بھی یہی فرمایا گیا ہے کہ میری ہدایت کی پیروی کرنے والے نہ گمراہ ہوں گے، نہ بدبخت و بے نصیب۔ مگر میری یاد سے منہ موڑنے والے دنیا کی تنگی اور آخرت کے اندھاپن کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ [1] یہاں بھی فرمایا کہ انکار اور تکذیب کرنے والے ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔ ابن جریر رحمہ اللہ کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو اصلی جہنمی ہیں انہیں تو جہنم میں نہ موت آئے گی، نہ ہی خوشگوار زندگی ملے گی، ہاں جن موحد، متبع سنت لوگوں کو ان کی بعض خطاؤں پر جہنم میں ڈالا جائے گا یہ جل کر کوئلے ہو کر مر جائیں گے اور پھر شفاعت کی وجہ سے نکال لیے جائیں گے۔ [2] صحیح مسلم شریف میں بھی یہ حدیث ہے کہ بعض تو کہتے ہیں دوسری دفعہ جنت سے نکل جانے کے حکم کو ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہاں دوسرے احکام بیان کرنا تھے اور بعض کہتے ہیں پہلی مرتبہ جنت سے آسمان اول اتار دیا گیا تھا دوبارہ آسمان اول سے زمین کی طرف اتارا گیا لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے۔ واللہ اعلم۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ
وَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠
وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اے بنی اسرائیل میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں گا اور صرف مجھ ہی سے ڈرو ○ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے تمہاری کتابوں کی تصدیق میں نازل فرمائی ہے اور اس

---

[1] [سورۃ طٰہٰ: آیت ۱۲۳-۱۲۴]

[2] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب اثبات الشفاعة و اخراج الموحدين من النار (۱۸۵) ابن ماجه: کتاب الزهد: باب ذکر الشفاعة (۴۳۰۹)]

بنی اسرائیل کو نصیحت: ان آیتوں میں بنی اسرائیل کو اسلام قبول کرنے اور حضور ﷺ کی تابعداری کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور انتہائی لطیف پیرایہ میں انہیں سمجھایا گیا ہے کہ تم ایک پیغمبر کی اولاد میں سے ہو تمہارے ہاتھوں میں کتاب اللہ موجود ہے اور قرآن اس کی تصدیق کر رہا ہے پھر تمہیں نہیں چاہیے کہ سب سے پہلے انکار تمہیں سے شروع ہو۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام تھا تو گویا ان سے کہا جاتا ہے کہ تم میرے صالح اور فرمانبردار بندے کی اولاد ہو۔ تمہیں چاہیے کہ اپنے جدامجد کی طرح حق کی تابعداری میں لگ جاؤ۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ تم سخی کے لڑکے ہو سخاوت میں آگے بڑھو تم پہلوان کی اولاد ہو داد شجاعت دو۔ تم عالم کے بچے ہو علم میں کمال پیدا کرو۔ دوسری جگہ اسی طرز کلام کو اسی طرح ادا کیا گیا ہے ﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا﴾ (الاسراء/۳) یعنی ہمارے شکر گذار بندے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ جنہیں ہم نے ایک عالمگیر طوفان سے بچایا تھا یہ ان کی اولاد ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت سے حضور ﷺ نے دریافت کیا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام تھا۔ وہ سب قسم کھا کر کہتے ہیں کہ واللہ یہ سچ ہے حضور ﷺ نے کہا اے اللہ تو گواہ رہ۔[1] اسرائیل کے لفظی معنی عبداللہ کے ہیں[2] ان نعمتوں کو یاد دلایا جاتا ہے جو قدرت کاملہ کی بڑی بڑی نشانیاں تھیں مثلاً پتھر میں سے نہروں کو جاری کرنا۔ من وسلویٰ اتارنا۔ فرعونیوں سے آزاد کرنا۔[3] انہیں میں سے انبیاء اور رسولوں کو مبعوث کرنا۔ ان میں سلطنت اور بادشاہی عطا فرمانا وغیرہ ان کو ہدایت دی جاتی ہے میرے وعدوں کو پورا کرو یعنی میں نے جو عہد تم سے لیا تھا کہ جب محمد ﷺ تمہارے پاس آئیں اور ان پر میری کتاب قرآن کریم نازل ہو تو تم اس پر اور آپ کی ذات پر ایمان لانا۔ وہ تمہارے بوجھ ہلکے کریں گے اور تمہاری زنجیریں توڑ دیں گے اور تمہارے طوق اتار دیں گے اور میرا وعدہ بھی پورا ہو جائے گا کہ میں تمہیں اس دین کے سخت احکام کے متبادل آسان دین دوں گا۔ دوسری جگہ اس کا بیان اس طرح ہوتا ہے ﴿وَقَالَ اللّٰهُ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ﴾ (المائدہ/ ۱۲) الخ یعنی اگر تم نمازوں کو قائم کرو گے زکوٰۃ دیتے رہو گے میرے رسولوں کی ہدایت مانتے رہو گے مجھے اچھا قرضہ دیتے رہو گے تو میں تمہاری برائیاں دور کر دوں گا اور تمہیں بہتی ہوئی نہروں والی جنت میں داخل کروں گا۔ یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ توراۃ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک اتنا بڑا عظیم الشان پیغمبر پیدا کر دوں گا جس کی تابعداری تمام مخلوق پر فرض ہو گی ان کے تابعداروں کو بخشوں گا انہیں جنت میں داخل کروں گا اور دوہرا اجر دوں گا۔ حضرت امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بڑے بڑے انبیاء علیہم السلام سے آپ کی بابت پیشین گوئی نقل کی ہے یہ بھی مروی ہے کہ اللہ کا عہد اسلام کو ماننا اور اس پر عمل کرنا تھا۔[4] اللہ کا اپنے عہد کو پورا کرنا ان سے خوش ہونا اور

---

[1] [حسن : ابوداود طیالسی (۳۵۶)] شیخ مصطفی السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اس کی سند کو حسن کہتے ہیں۔]

[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۵۵۳)]

[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۵۵۶)]

[4] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۵۵۸)]

جنت عطا فرماتا ہے [1] مزید فرمایا مجھ سے ڈرو ایسا نہ ہو جو عذاب تم سے پہلے لوگوں پر نازل ہوئے کہیں تم پر بھی نہ آ جائیں۔ اس لطیف پیرایہ کو بھی ملاحظہ فرمائیے کہ ترغیب کے بیان کے ساتھ ہی کس طرح ترہیب کے بیان کو ملحق کر دیا گیا ہے۔ رغبت ورہبت دونوں جمع کر کے اتباع حق اور نبوت محمد ﷺ کی دعوت دی گئی۔ قرآن کے ساتھ نصیحت حاصل کرنے اس کے بتلائے ہوئے احکام کو ماننے اور اس کے روکے ہوئے کاموں سے رک جانے کی ہدایت کی گئی۔

اسی لیے اس کے بعد ہی فرمایا کہ تم اس قرآن حکیم پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتاب کی بھی تصدیق اور تائید کرتا ہے جسے لے کر وہ نبی آئے ہیں جو امی ہیں عربی ہیں' جو بشیر ہیں' جو نذیر ہیں' جو سراج منیر ہیں جن کا اسم شریف محمد ﷺ ہے جو توراۃ وانجیل کو سچ ماننے والے اور حق کو پھیلانے والے ہیں چونکہ توراۃ وانجیل میں بھی آپ کا ذکر تھا تو آپ کا تشریف لانا توراۃ کی سچائی کی دلیل تھی اس لیے کہا گیا کہ وہ تمہارے ہاتھوں میں موجود کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ علم ہونے کے باوجود تم ہی سب سے پہلے انکار نہ کرو۔ بعض کہتے ہیں: "بِـہٖ" کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے اور پہلے آ بھی چکا ہے ﴿بِمَآ اَنْزَلْتُ﴾ اور دونوں قول درحقیقت سچے اور ایک ہی ہیں۔ قرآن کو ماننا رسول کو ماننا ہے اور رسول ﷺ کی تصدیق قرآن کی تصدیق ہے۔ اَوَّلَ كَـافِـرٍ سے مراد بنی اسرائیل کے اولین منکر ہیں کیونکہ کفار قریش بھی انکار اور کفر کر چکے تھے لہٰذا بنی اسرائیل کا انکار اہل کتاب میں سے پہلی جماعت کا انکار تھا اس لیے انہیں اول کافر کہا گیا ان کے پاس وہ علم تھا جو دوسروں کے پاس نہ تھا۔ میری آیتوں کے بدلے تھوڑا مول نہ لو یعنی دنیا کے بدلے جو قلیل اور فانی ہے میری آیات پر ایمان لانا اور میرے رسول ﷺ کی تصدیق کرنا نہ چھوڑو اگرچہ دنیا ساری کی ساری بھی مل جائے جب بھی وہ آخرت کے مقابلہ میں تھوڑی بہت تھوڑی ہے اور یہ خود ان کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

سنن ابوداود میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جو شخص اس علم کو جس سے اللہ کی رضا مندی حاصل ہوتی ہے اس لیے سیکھے کہ اس سے دنیا کمائے وہ قیامت کے روز جنت کی خوشبو تک نہ پائے گا [2] علم سکھانے کی اجرت بغیر مقرر کیے ہوئے لینا جائز ہے اسی طرح علم سکھانے والے علماء کو بیت المال سے لینا بھی جائز ہے تا کہ وہ خوش حال رہ سکیں اور اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ اگر بیت المال سے کچھ مال نہ ملتا ہو اور علم سکھانے کی وجہ سے کوئی کام دھندا بھی نہ کر سکتے ہوں تو پھر اجرت مقرر کر کے لینا بھی جائز ہے اور امام مالک' امام شافعی' اور امام احمد' اور جمہور علماء رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے اس کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جو صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے کہ انہوں نے اجرت مقرر کر لی اور ایک سانپ کے کاٹے ہوئے شخص پر قرآن پڑھ کر دم کیا

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (١/١٤٣)]

[2] [صحیح: ابو داؤد: کتاب العلم: باب فی طلب العلم لغیر اللہ تعالی (٣٦٦٤) ابن ماجہ: مقدمہ: باب الانتفاع بالعلم والعمل بہ (٢٥٢) ابن حبان (٧٨) حاکم (١/٨٥) مسند احمد (٢/٣٣٨) ابن ابی شیبۃ (٨/٥٤٣) العقیلی (٣/٤٦٧)] امام ابن حبانؒ، امام حاکمؒ اور امام ذہبیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ امام نوویؒ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ [ریاض الصالحین (١/٤٠٢)] حافظ عراقیؒ نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔ [تخریج الاحیاء (١٤٣)] شیخ البانیؒ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح ابن ماجہ (٢٠٤) صحیح الترغیب (١٠٥) صحیح ابوداود (٣٦٦٤) المشکاۃ (٢٢٧)]

جب حضور ﷺ کے سامنے یہ قصہ پیش ہوا تو آپ نے فرمایا ﴿إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللَّهِ﴾ یعنی جن چیزوں پر تم اجرت لے سکتے ہو ان سب میں زیادہ حقدار کتاب اللہ ہے [1] دوسری مطول حدیث میں ہے کہ ایک شخص کا نکاح ایک عورت سے آپ کر دیتے ہیں اور فرماتے ہیں ﴿زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ میں نے اس کو تیری زوجیت میں دیا [2] اور تو اسے قرآن حکیم جو تجھے یاد ہے اسے بطور حق مہر کرا دے۔

ابوداؤد کی ایک حدیث میں ہے ایک شخص نے اہل صفہ میں سے کسی کو کچھ قرآن سکھایا اس نے اسے ایک کمان بطور ہدیہ دی اس نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ پوچھا۔ آپ نے فرمایا اگر تجھے آگ کی کمان لینی ہے تو اسے لے چنانچہ اس نے اسے چھوڑ دیا۔ [3] حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی ایسی ہی ایک مرفوع حدیث مروی ہے۔ [4] ان دونوں احادیث کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے خالص اللہ کے واسطے کی نیت سے سکھایا پھر اس پر تحفہ اور ہدیہ لے کر اپنے ثواب کو کھونے کی کیا ضرورت؟ اور جبکہ شروع ہی سے اجرت پر تعلیم دی ہے تو پھر بلاشک وشبہ جائز ہے جیسے اوپر کی دونوں احادیث میں بیان ہو چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

صرف اللہ ہی سے ڈرنے کے یہ معنی ہیں کہ اللہ کی رحمت کی امید پر اس کی عبادت و اطاعت میں لگا ہے اور اس کے عذابوں سے ڈر کر اس نافرمانیوں کو چھوڑ دے اور دونوں حالتوں میں اپنے رب کی طرف سے دیئے گئے نور پر گامزن رہے۔ [5] غرض اس جملہ سے انہیں خوف دلایا گیا کہ وہ دنیاوی لالچ میں آ کر حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق کو جو اس کی کتابوں میں ہے نہ چھپائیں اور دنیوی ریاست کی طمع پر آپ کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوں بلکہ رب سے ڈر کر اظہار حق کرتے رہیں۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿٤٣﴾

حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کیا کرو اور نہ حق کو چھپاؤ تمہیں تو خود اس کا علم ہے ○ اور نمازوں کو قائم رکھا کرو۔ اور زکوۃ دیتے رہا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کیا کرو ○

---

(1) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الطب: باب الشروط فی الرقیۃ بفاتحۃ الکتاب (٥٧٣٧)]

(2) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب النکاح: باب التزویج علی القرآن و بغیر صداق (٥١٤٩) صحیح مسلم: کتاب النکاح: باب الصداق و جواز کونہ تعلیم قرآن و خاتم حدید (١٤٢٥)]

(3) [صحیح: ابو داؤد: کتاب العلم: باب کسب المعلم (٣٤١٦) مستدرک حاکم (٤١/٢) بیہقی (١٢٥/٦)] شیخ البانی ؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح ابوداود (٢٩١٥)] حافظ زبیر علی زئی اور مولانا مبشر احمد ربانی اس کی سند کو حسن کہتے ہیں۔ جبکہ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس کی تحقیق کے مطابق اس کی سند ضعیف ہے۔]

(4) [صحیح: ابن ماجہ: کتاب التجارات: باب الاجر علی تعلیم القرآن (٢١٥٨) بیہقی فی السنن الکبری (١٢٥/٦)] شیخ البانی ؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح ابن ماجہ (١٧٥١)]

(5) [حسن: تفسیر ابن ابی حاتم (١٤٧/١)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔]

کتمانِ حق کے مرتکب یہود کے دوست: یہودیوں کی اس بدخصلت پر ان کو تنبیہہ کی جارہی ہے کیونکہ وہ جاننے کے باوجود کبھی تو حق و باطل کو خلط ملط کر دیا کرتے تھے کبھی حق کو چھپالیا کرتے تھے۔ کبھی باطل کو ظاہر کیا کرتے تھے لہٰذا انہیں ان ناپاک عادتوں کے چھوڑنے کو کہا گیا ہے اور حق کو ظاہر کرنے اور اسے کھول کھول کر بیان کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے' حق و باطل سچ جھوٹ کو آپس میں نہ ملاؤ اللہ کے بندوں کی خیر خواہی کرو۔ یہودیت ونصرانیت کی بدعات کو اسلام کی تعلیم کے ساتھ نہ ملاؤ۔ رسول اللہ ﷺ کی بابت پیشین گوئیاں جو تم اپنی کتابوں میں پاتے ہو انہیں عوام الناس سے نہ چھپاؤ "تَكْتُمُوا" مجزوم بھی ہوسکتا ہے اور منصوب بھی یعنی اسے اور اسے جمع نہ کرو۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں "تَكْتُمُوْنَ" بھی ہے۔ یہ حال ہوگا اور اس کے بعد کا جملہ بھی حال ہے معنی یہ ہوئے کہ حق کو حق جانتے ہوئے ایسی بے حیائی نہ کرو۔ اور یہ بھی معنی ہے کہ علم کے باوجود اسے چھپانے اور ملاوٹ کرنے کا کیسا عذاب ہوگا۔ اس کا علم ہو کر بھی افسوس کہ تم بدکرداری پر آمادہ نظر آتے ہو۔ پھر انہیں حکم دیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھو زکوۃ دو اور امت محمد ﷺ کے ساتھ رکوع وسجود میں شامل رہا کرو' انہیں میں مل جاؤ اور خود بھی آپ ہی کی امت بن جاؤ'[1] اطاعت واخلاص کو بھی زکوۃ کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں یہی فرماتے ہیں زکوۃ دوسو درہم پر۔ پھر اس سے زیادہ رقم پر واجب ہوتی ہے نماز و زکوۃ فرض وواجب ہے۔ اس کے بغیر سبھی اعمال غارت ہیں۔ زکوۃ سے بعض لوگوں نے صدقۃ الفطر بھی مراد لیا ہے۔ رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو سے مراد یہ ہے کہ اچھے اعمال میں ایمانداروں کا ساتھ دو اور ان میں بہترین چیز نماز ہے اس آیت سے اکثر علماء نے نماز باجماعت کے فرض ہونے پر بھی استدلال کیا ہے اور یہاں پر امام قرطبی رحمہ اللہ نے مسائل جماعت کو بسط سے بیان فرمایا ہے۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

کیا لوگوں کو بھلائیوں کا حکم کرتے ہو؟ اور خود اپنے تئیں بھول جاتے ہو؟ باوجود یہ کہ تم کتاب کو پڑھتے ہو۔ کیا اتنی بھی تم میں سمجھ نہیں؟ ○

دوسروں کو نیکی کا حکم اور خود اس سے فرار: یعنی اہل کتاب اس علم کے باوجود جو'' کہے اور نہ کرے'' اس پر کتنا عذاب نازل ہوتا ہے پھر تم خود ایسا کیوں کرنے لگے ہو؟ جیسا دوسروں کو تقوی طہارت اور پاکیزگی سکھاتے ہو خود بھی تو اس کے عامل بن جاؤ لوگوں کو روزے نماز کا حکم دینا اور خود اس کے پابند نہ ہونا یہ تو بڑی شرم کی بات ہے دوسروں کو کہنے سے پہلے انسان کو خود عامل ہونا ضروری ہے اپنی کتاب کے ساتھ کفر کرنے سے لوگوں کو روکتے ہو لیکن اللہ کے اس نبی ﷺ کو جھٹلا کر تم خود اپنی ہی کتاب کے ساتھ کفر کیوں کرتے ہو؟ یہ بھی مطلب ہے کہ دوسروں کو اس دین اسلام کو قبول کرنے کے لیے کہتے ہو مگر دنیاوی ڈر خوف سے خود قبول نہیں کرتے۔

وعظ ونصیحت کرنے والے متوجہ ہوں: حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں انسان پورا سمجھ دار نہیں ہوسکتا جب تک کہ لوگوں کو اللہ کے خلاف کام کرتے ہوئے دیکھ کر ان کا دشمن نہ بن جائے اور اپنے نفس کا ان سے بھی زیادہ۔ ان لوگوں

---

[1] [تفسیر الکشاف (۱/۱۳۳)]

گو اگر رشوت وغیرہ نہ ملتی تو حق بتا دیتے لیکن خود عامل نہ تھے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی۔ یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اچھی چیز کا حکم دینے پر ان کی برائی نہیں کی گئی بلکہ خود نہ کرنے پر برائی بیان کی گئی ہے۔

اچھی بات کو کہنا تو خود اچھائی ہے بلکہ یہ تو واجب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انسان کو خود بھی اس پر عمل کرنا چاہیے جیسے حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا ﴿وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ﴾ (ھود/۸۸) الخ یعنی میں ایسا نہیں ہوں کہ تمہیں جس کام سے روکوں وہ خود کروں میرا ارادہ تو اپنی طاقت کے مطابق اصلاح کا ہے میری توفیق اللہ کی مدد سے ہے میرا بھروسہ اسی پر ہے اور میری رغبت ورجوع بھی اسی کی طرف ہے۔ پس نیک کاموں کے کرنے کے لیے کہنا بھی واجب ہے اور خود کرنا بھی۔ ایک واجب کو نہ کرنے سے دوسرا بھی چھوڑ دینا نہیں چاہیے۔ علماء سلف وخلف کا قول یہی ہے گو بعض کا ایک ضعیف قول یہ بھی ہے کہ برائیوں والا دوسروں کو اچھائیوں کا حکم نہ دے لیکن یہ قول ٹھیک نہیں، پھر ان حضرات کا اس آیت سے دلیل پکڑنا تو بالکل ہی ٹھیک نہیں بلکہ صحیح یہی ہے کہ بھلائی کا حکم کرے اور برائی سے روکے اور خود بھی بھلائی کرے اور برائی سے رکے۔ اگر دونوں چھوڑے گا تو دوہرا گنہگار ہوگا ایک کے ترک پر اکہرا۔

طبرانی کی معجم کبیر میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو عالم لوگوں کو بھلائی سکھائے اور خود عمل نہ کرے اس کی مثال چراغ جیسی ہے کہ لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن وہ خود جل رہا ہے [1] یہ حدیث غریب ہے مسند احمد کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں معراج والی رات میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں میں نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں تو کہا گیا کہ یہ آپ کی امت کے خطیب اور واعظ اور عالم ہیں جو لوگوں کو بھلائی سکھاتے تھے مگر خود نہیں کرتے تھے علم کے باوجود سمجھتے نہیں تھے۔ [2] دوسری حدیث میں ہے کہ ان کی زبانیں اور ہونٹ دونوں کاٹے جا رہے تھے یہ حدیث صحیح ہے ابن حبان ابن ابی حاتم ابن مردویہ وغیرہ میں موجود ہے۔ [3]

ابو وائل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کچھ نہیں کہتے آپ نے جواب دیا کہ تمہیں سنا کر ہی کہوں تو ہی کہنا ہوگا میں تو انہیں پوشیدہ طور پر ہر وقت کہتا رہتا ہوں لیکن

---

[1] [جید : طبرانی کبیر (۱۶۸۱)، (۱۶۵/۲)] امام ہیثمیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔[مجمع الزوائد (۱۸۵/۱)] شیخ البانیؒ نے اس کی سند کو جید اور بعض جگہ حسن کہا ہے۔[السلسلة الصحيحة (۱۱۳۳/۷) صحيح الترغيب (۲۳۲۸) السلسلة الصحيحة (تحت الحديث / ۳۳۷۹)] تاہم حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ اس کی سند اعمش کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف ہے اور اس کے ضعیف شواہد بھی ہیں۔]

[2] [صحیح بالشواهد : مسند احمد (۱۲۸۷۹)، (۱۲۰/۳، ۱۸۰، ۲۳۱، ۲۳۹) ابن ابی شیبه (۳۰۸/۱٤) ابو يعلى (۳۹۹٦) الدر المنثور للسيوطی (۱۲٦/۱) الحلية لابی نعيم (۱۷۲/۸)] اس میں علی بن زید بن جدعان راوی ضعیف ہے، تاہم یہ روایت اپنے شواہد کی وجہ سے صحت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔]

[3] [صحیح : ابن حبان (الموارد - ۵۳) تفسیر ابن ابی حاتم (٤۷٦)، (۱۵۱/۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔]

میں کسی بات کو چھپانا نہیں چاہتا اللہ کی قسم میں کسی شخص کو سب سے افضل نہیں کہوں گا اس لیے کہ میں نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ایک شخص کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اسے جہنم میں ڈالا جائے گا اس کی آنتیں نکل آئیں گی اور وہ اس کے اردگرد چکر کھاتا رہے گا جہنمی جمع ہو کر اس سے پوچھیں گے کہ حضرت آپ تو ہمیں اچھی باتوں کا حکم کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے تھے یہ آپ کی کیا حالت ہے؟ وہ کہے گا افسوس میں تمہیں کہتا تھا لیکن خود نہیں کرتا تھا' میں تمہیں روکتا تھا لیکن خود نہیں رکتا تھا۔ (مسند احمد) بخاری و مسلم میں بھی یہ روایت ہے۔ ①

مسند کی ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پڑھ لوگوں سے اتنا درگذر کرے گا جتنا جاننے والوں سے نہیں کرے گا بعض آثار میں یہ بھی وارد ہے کہ عالم کو ایک دفعہ بخشا جائے تو عام آدمی کو ستر دفعہ بخشا جاتا ہے عالم جاہل یکساں نہیں ہو سکتے قرآن کریم میں ہے ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ (الزمر/۹) جاننے والے اور انجان برابر نہیں نصیحت صرف عقلمند لوگ ہی حاصل کر سکتے ہیں ابن عساکر میں ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ جنتی لوگ جہنمیوں کو دیکھ کر کہیں گے کہ تمہاری نصیحتیں سن سن کر ہم تو جنتی بن گئے مگر تم جہنم میں کیوں آ پڑے وہ کہیں گے افسوس ہم تمہیں کہتے تھے لیکن خود نہیں کرتے تھے۔ ②

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے کہا حضرت میں بھلائیوں کا حکم کرنا اور برائیوں سے لوگوں کو روکنا چاہتا ہوں آپ نے فرمایا کیا تم اس درجہ تک پہنچ گئے ہو؟ اس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا اگر تم ان تین آیتوں کی فضیحت سے نڈر ہو گئے ہو تو شوق سے وعظ شروع کرو۔ اس نے پوچھا وہ تین آیتیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک تو ﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾ کیا تم لوگوں کو بھلائیوں کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے تئیں بھولے جا رہے ہو؟ دوسری آیت ﴿لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ (الصف/۲'۳) کیوں تم وہ کہتے ہو جو خود نہیں کرتے؟ اللہ کے نزدیک یہ بڑی ناپسندیدہ بات ہے کہ تم وہ کہو جو خود نہ کرو۔ تیسری آیت حضرت شعیب علیہ السلام کا فرمان ﴿وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ﴾ (ھود/۸۸) یعنی میں جن کاموں سے تمہیں منع کرتا ہوں ان میں تمہاری مخالفت کرنا نہیں چاہتا' میرا ارادہ صرف اپنی طاقت بھر اصلاح کرنا ہے کہو تم ان تینوں آیتوں سے بے خوف ہو؟ اس نے کہا نہیں فرمایا پھر تم اپنے نفس سے شروع کرو۔ (تفسیر مردویہ) ایک ضعیف

---

① [صحیح: صحیح بخاری: کتاب بدء الخلق: باب صفة النار و انها مخلوقة (۳۲۶۷) صحیح مسلم: کتاب الزهد: باب عقوبة من يامر بالمعروف ولا يفعله (۲۹۸۹)]

② [ضعیف: طبرانی کبیر (۱۵۰/۲۲)، (۴۰۵) وفی الاوسط (۹۹) الخطیب فی اقتضاء العلم العمل (۷۳) ابن عساکر (۸۶۷/۱۷)] امام ہیثمیؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں ابوبکر عبداللہ بن حکیم داہری راوی سخت ضعیف ہے۔ [مجمع الزوائد (۱۸۵/۱)] شیخ البانیؒ نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف الترغیب (۱۳۹۶)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو سخت ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

حدیث طبرانی میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کو کسی قول وفعل کی طرف بلائے اور خود نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے غضب وغصہ میں رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خود آپ عمل کرنے لگ جائے۔ (1) حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی تینوں آیتیں پیش کر کے فرمایا کہ میں ان کی وجہ سے قصہ گوئی پسند نہیں کرتا۔ (2)

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ع

صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔ یہ بڑی چیز ہے مگر ڈر رکھنے والوں پر ○ جو جانتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں ○

نماز وصبر کے ساتھ مدد طلب کرنا: اس آیت میں حکم فرمایا جاتا ہے کہ تم دنیا اور آخرت کے کاموں پر نماز اور صبر کے ساتھ مدد طلب کیا کرو فرائض بجالاؤ اور نماز کو ادا کرتے رہو روزہ رکھنا بھی صبر کرنا ہے اور اسی لیے رمضان کو صبر کا مہینہ کہا گیا ہے (3) حضور ﷺ فرماتے ہیں روزہ آدھا صبر ہے۔ (4) صبر سے مراد گناہوں سے رک جانا بھی ہے اس آیت میں اگر صبر سے یہ مراد لی جائے تو برائیوں سے رکنا اور نیکیاں کرنا دونوں کا بیان ہو گیا' نیکیوں میں سب سے اعلیٰ چیز نماز ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں صبر کی دو قسمیں ہیں مصیبت کے وقت صبر اور گناہوں کے ارتکاب سے صبر اور یہ صبر پہلے سے زیادہ اچھا ہے۔ (5)

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں انسان کا ہر چیز کا اللہ کی طرف سے ہونے کا اقرار کرنا۔ ثواب کا طلب کرنا اللہ کے پاس مصیبتوں کے اجر کا ذخیرہ سمجھنا یہ صبر ہے حضرت ابو عالیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سمجھو نیکیوں کے کاموں پر نماز سے بڑی مدد ملتی ہے خود قرآن میں ہے ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ

---

(1) [ضعیف: ابو نعیم فی الحلیة (۷/۲)] امام ہیثمیؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں عبداللہ بن خراش راوی ہے جسے جمہور نے ضعیف کہا ہے۔ [مجمع الزوائد (۲۷۶/۷)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

(2) [تفسیر قرطبی (۳۶۷/۱)]

(3) [مسند احمد (۲/۲۶۳۔ ۳۸٤)، (۳٦۳/۵)]

(4) [ضعیف: ترمذی: کتاب الدعوات (۳۵۱۹) بیهقی فی شعب الایمان (۲۹۱/۳)، (۳۵۷۵) مسند احمد (۲۳۱۷۹، ۲۳۲۰۵)] حافظ بوصیریؒ نے فرمایا ہے کہ یہ سند ضعیف ہے۔ [مصباح الزجاجة (۷۹/۲)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف ترمذی (۳۷٦۵) ضعیف ابن ماجه (۱۷٤۵) ضعیف الجامع الصغیر (۳۵۸۱) ضعیف الترغیب و الترهیب (۵۷۹) المشکاة (۲۹٦)] حافظ زبیر علی زئی اس کی سند کو ضعیف کہتے ہیں کہ کیونکہ اس میں موسیٰ بن عبیدہ ربذی ضعیف ہے۔ [کما فی المیزان (۲۱۳/٤)] مولانا مبشر احمد ربانی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

(5) [منقطع: تفسیر ابن ابی حاتم (۱۵۵/۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ ابوسنان کا عمرؓ سے سماع ثابت نہیں۔]

﴿الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ (العنكبوت / ٤٥) نماز کو قائم رکھ یہ تمام برائیوں اور بدیوں سے روکنے والی ہے اور یقیناً اللہ کا ذکر بہت بڑی چیز ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی کام مشکل اور غم میں ڈال دیتا تو آپ نماز پڑھا کرتے فوراً نماز میں لگ جاتے۔ ① چنانچہ جنگ خندق کے موقعہ پر رات کے وقت جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ خدمت نبوی میں حاضر ہوتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں پاتے ہیں۔ ② حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کی لڑائی کی رات میں نے دیکھا کہ ہم سب سو گئے تھے مگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات نماز میں مشغول رہے صبح تک نماز میں اور دعا میں لگے رہے۔ ③

ابن جریر میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ بھوک کے مارے پیٹ کے درد سے بیتاب ہو رہے ہیں آپ نے ان سے (فارسی زبان میں) دریافت فرمایا کہ درد شکم داری؟ کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے؟ انہوں نے کہا ہاں آپ نے فرمایا اٹھو نماز شروع کر دو اس میں شفا ہے۔ ④ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سفر میں اپنے بھائی حضرت قثم رضی اللہ عنہ کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو آپ ﴿اِنَّـا لِلّٰهِ﴾ الخ پڑھ کر راستہ سے ایک طرف ہٹ کر اونٹ بٹھا کر نماز شروع کر دیتے ہیں اور بہت لمبی نماز ادا کرتے ہیں پھر اپنی سواری کی طرف جاتے ہیں اور اس آیت کو پڑھتے ہیں غرض ان دونوں چیزوں صبر وصلوٰۃ سے اللہ کی رحمت میسر آتی ہے۔

"اِنَّهَـا" کی ضمیر کا مرجع بعض لوگوں نے صلوٰۃ یعنی نماز کو کہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مدلول کلام یعنی وصیت اس کا مرجع ہے جیسے قارون کے قصہ میں "وَلَا يُـلَقّٰهَا" ⑤ کی ضمیر اور برائی کے بدلے بھلائی کرنے کے حکم میں "وَمَـا يُـلَقّٰهَا" کی ضمیر۔ مطلب یہ ہے کہ صبر وصلوٰۃ ہر شخص کے بس کی چیز نہیں یہ حصہ اللہ کا خوف رکھنے والی

---

① [حسن: ابوداؤد: كتاب الصلوة: باب وقت قيام النبى صلى الله عليه وسلم من الليل (١٣١٩) مسند احمد (٢٣٤٠٦)، (٣٨٨/٥) صحيح ابن حبان (١٩٧٥)] شیخ البانی نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحيح الجامع الصغير (٤٧٠٣) صحيح ابو داود (١٣١٩)]

② [تعظيم قدر الصلاة (٢١٢)، (٢٣١/١)]

③ [حسن: تعظيم قدر الصلاة (٢١٣) النسائى فى السنن الكبرى (٨٢٣) مسند احمد (١/١٢٥-١٣٨) صحيح ابن حبان (٢٢٥٧) بيهقى فى دلائل النبوة (٤٩/٣)]

④ [ضعيف: ابن ماجه: كتاب الطب: باب الصلوة شفاء (٣٤٥٨) مسند احمد (٤٠٣/٢) ابن حبان فى المجروحين (١٩٦/١) ابن عدى فى الكامل (٩٨٥/٣) العقيلى (٤٨/٢)] اس کی سند میں لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔ [تقريب (١٣٨/٢)] حافظ بوصیری فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی ضعیف ہے اور اس میں انقطاع بھی ہے۔ [مصباح الزجاجة (٥٩/٤)] شیخ البانی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [السلسلة الضعيفة (٤٠٦٦) ضعيف الجامع الصغير (٤١١٣)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس روایت کو منکر کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی اس کی سند کو ضعیف کہتے ہیں۔]

⑤ [سورة القصص: آيت ٨٠]

جماعت کا ہے یعنی قرآن کے ماننے والے سچے مومن کانپنے والے متواضع اطاعت کی طرف جھکنے والے وعدے وعید کو سچا ماننے والے ہیں اس وصف سے موصوف ہوتے ہیں جیسے حدیث میں ایک سائل پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا یہ بڑی چیز ہے لیکن جس پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہو اس پر آسان ہے' [1] ابن جریر رحمہ اللہ نے اس آیت کے معنی کرتے ہوئے اسے بھی یہودیوں سے ہی خطاب قرار دیا ہے لیکن ظاہر بات یہ ہے کہ گویہ بیان انہی کے بارے میں ہے' لیکن حکم کے اعتبار سے عام ہے۔ واللہ اعلم۔ آگے چل کر ﴿ خَاشِعِيْنَ ﴾ کی صفت ہے اس میں ظن معنی میں یقین کے ہیں گو ظن شک کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے کہ سدفہ اندھیرے کے معنی میں بھی آتا ہے اور روشنی کے معنی میں بھی اور صارخ کا لفظ بھی فریادرس اور فریادکن دونوں کے لیے بولا جاتا ہے اور اسی طرح کے بہت سے نام ہیں جو ایسی دو مختلف چیزوں پر بولے جاتے ہیں۔ ظن یقین کے معنی میں عرب شعراء کے شعروں میں بھی آیا ہے خود قرآن کریم میں ﴿ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا ﴾ (الكهف/ ٥٣) یعنی گنہگار جہنم کو دیکھ کر یقین کرلیں گے کہ اب ہم اس میں جھونک دیئے جائیں گے یہاں بھی ظن یقین کے معنی میں ہے بلکہ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں قرآن میں ایسی جگہ ظن کا لفظ یقین اور علم کے معنی میں ہے ابوالعالیہ رحمہ اللہ بھی یہاں ظن کے معنی یقین کرتے ہیں۔ حضرت مجاہد' سدی' ربیع بن انس' اور قتادہ رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ ہے ﴿ اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ﴾ (الحاقة/ ٢٠) یعنی مجھے یقین تھا کہ مجھے حساب سے دوچار ہونا ہے۔

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک گنہگار بندے سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں نے تجھے بیوی بچے نہیں دیئے تھے؟ کیا تجھ پر طرح طرح کے اکرام نہیں کیے تھے؟ کیا تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کیے تھے؟ کیا تجھے راحت و آرام کھانا پینا میں نے نہیں دیا تھا؟ یہ کہے گا ہاں پروردگار یہ سب کچھ دیا تھا۔ پھر کیا تیرا علم و یقین اس بات پر نہ تھا کہ تو مجھ سے ملنے والا ہے؟ وہ کہے گا ہاں اللہ تعالیٰ اسے نہیں مانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا بس تو جس طرح مجھے بھول گیا تھا آج میں بھی تجھے بھلا دوں گا' [2] اس حدیث میں بھی لفظ ظن کا ہے اور معنی میں یقین کے ہے اس کی مزید تحقیق و تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ ﴿ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ﴾ (الحشر/ ١٩) کی تفسیر میں آگے آئے گی۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾

اے اولاد یعقوب میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور میں نے تمہیں تمام جہانوں پر فضیلت دی ○

---

[1] [صحیح: ترمذی: کتاب الایمان: باب ما جآء فی حرمة الصلوة (٢٦١٦) ابن ماجه: کتاب الفتن: باب کف اللسان فی الفتنة (٣٩٧٣)] امام ترمذیؒ نے اسے حسن صحیح کہا ھے۔ شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ھے۔ [صحیح ترمذی (٢١١٠)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے حسن کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے حسن کہتے ہیں۔]

[2] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الزهد: باب الدنیا سجن المومن وجنة النار (٢٩٦٨)]

بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد پر انعامات الٰہی: بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد پر جو نعمت الٰہیہ انعام کی گئی تھی اس کا ذکر ہو رہا ہے کہ ان میں سے رسول ہوئے ان پر کتابیں اتریں انہیں ان کے زمانہ کے دوسرے لوگوں پر مرتبہ دیا گیا جیسے فرمایا ﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنَاهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ﴾ (الدخان / ۳۲) یعنی انہیں ان کے زمانے کے (اور لوگوں پر) ہم نے علم میں فضیلت دی [۱] اور فرمایا ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ﴾ [۲] یعنی موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے میری قوم تم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر انعام کی گئی ہے تم میں اس نے پیغمبر پیدا کیے تمہیں بادشاہ بنایا اور وہ دیا جو تمام زمانے کو نہیں دیا۔ تمام لوگوں پر فضیلت ملنے سے مراد ان کے زمانے کے تمام اور لوگ ہیں اس لیے کہ امت محمدیہ ان سے یقیناً افضل ہے اس امت کی نسبت فرمایا گیا ہے ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ (ال عمران / ۱۱۰) الخ تم بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے بنائی گئی ہو تم بھلائیوں کا حکم کرنے والے اور برائیوں سے روکنے والے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔ مسانید اور سنن میں مروی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم سترویں امت ہو اور سب سے بہتر اور بزرگ ہو [۳] اس قسم کی اور بہت سی احادیث کا ذکر ان شاءاللہ ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ [۴] کی تفسیر میں آئے گا اور کہا گیا ہے کہ تمام لوگوں پر خاص قسم کی فضیلت مراد ہے جس سے ہر قسم کی فضیلت لازم نہیں آتی رازی رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے مگر یہ غور طلب بات ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی فضیلت اور تمام امتوں پر ہے اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام انہی میں سے ہوتے چلے آئے ہیں لیکن اس میں بھی غور و خوض کی ضرورت ہے اس لیے کہ اس طرح کا اطلاق ان سے اگلے لوگوں پر بھی ہوتا ہے۔ اور حقیقت میں اگلے انبیاء علیہم السلام ان میں شمار نہ تھے جیسے حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آنحضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو ان سب کے بعد ہوئے لیکن تمام مخلوق سے افضل تھے اور جو تمام اولاد آدم کے سردار ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ صَلَوٰةُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ۔

وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٤٨﴾

اس دن سے ڈرتے رہو جب کوئی کسی کو نفع نہ دے سکے گا اور نہ شفاعت اور سفارش قبول ہوگی اور نہ کوئی بدلہ اور فدیہ لیا جائے گا اور نہ وہ مدد کیے جائیں گے ○

---

[۱] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱۵۸/۱)] [۲] [سورۃ المائدہ : آیت ۲۰]

[۳] [حسن : مسند احمد (۴۴۷/۴) ترمذی : کتاب تفسیر القرآن : باب ومن سورۃ آل عمران (۳۰۰۱) ابن ماجہ : کتاب الزھد : باب صفۃ امۃ محمد (۴۲۸۷) دارمی : کتاب الرقاق : باب فی قول النبی : أنتم خیر الامم (۲۷۶۳)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحیح ترمذی (۲۳۹۹)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے حسن کہتے ہیں۔]

[۴] [سورۃ آل عمران : آیت ۱۱۰]

روزِ قیامت کوئی سفارش اور فدیہ نفع نہ دے گا: نعمتوں کو بیان کرنے کے بعد اب عذاب سے ڈرایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کوئی کسی کو کچھ فائدہ نہ دے گا جیسے فرمایا ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ [1] یعنی کسی کا بوجھ کسی پر نہ پڑے گا اور فرمایا ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾ (عبس / ۳۷) یعنی اس دن ہر شخص نفسا نفسی میں پڑا ہوا ہو گا اور فرمایا: اے لوگو اپنے رب کا خوف کھاؤ اور اس دن سے ڈرو جس دن باپ بیٹے کو اور بیٹا باپ کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا [2] ارشاد ہے ﴿وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرہ/۴۸) یعنی کسی کافر کی نہ کوئی سفارش کرے گا نہ اس کی سفارش قبول ہو گی فرمایا ان کفار کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی [3] دوسری جگہ اہل جہنم کا یہ مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ افسوس آج ہمارا نہ کوئی سفارشی ہے نہ دوست۔ [4] یہ بھی ارشاد ہے فدیہ بھی نہ لیا جائے گا اور جگہ ہے جو لوگ کفر پر مر جاتے ہیں وہ اگر زمین بھر کر سونا دیں اور ہمارے عذابوں سے چھوٹنا چاہیں تو یہ بھی نہیں ہو سکتا [5] اور جگہ ہے کافروں کے پاس اگر تمام زمین کی چیزیں اور اس کے مثال اور بھی ہوں اور قیامت کے دن وہ اسے فدیہ دے کر عذابوں سے بچنا چاہیں تو بھی کچھ قبول نہ ہو گا اور دردناک عذابوں میں مبتلا رہیں گے [6] اور جگہ ہے۔ گو وہ زبردست فدیہ دیں پھر بھی قبول نہیں [7] دوسری جگہ ہے آج تم سے نہ بدلہ لیا جائے نہ ہی کافروں سے، تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اسی کی آگ تمہاری وارث ہے۔ [8] الخ

مطلب یہ ہے کہ ایمان کے بغیر سفارش اور شفاعت کا آسرا بیکار محض ہے قرآن میں ارشاد ہے اس دن سے پہلے نیکیاں کر لو جس دن نہ خرید و فروخت ہو گی نہ دوستی [9] اور شفاعت مزید فرمایا ﴿لَا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ﴾ (ابراهيم / ۳۱) اس دن نہ بیع ہو گی نہ دوستی۔ عدل کے معنی یہاں بدلے کے ہیں اور بدلہ اور فدیہ ایک ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حدیث میں "صرف" کے معنی نفل اور عدل کے معنی فریضہ مروی ہیں [10] لیکن یہ قول یہاں غریب ہے اور صحیح قول پہلا ہی ہے ایک روایت میں ہے حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ عدل کے کیا معنی ہیں آپ نے فرمایا فدیہ۔ [11] ان کی مدد بھی نہ کی جائے گی یعنی کوئی حمایتی نہیں ہو گا، [12] قرابتیں کٹ جائیں گی جاہ و چشم جاتا رہے گا کسی کے دل میں ان کے لیے رحم نہ رہے گا نہ خود ان میں کوئی قدرت و قوت رہے گی اور جگہ ہے ﴿وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ﴾ [13] (وہ پناہ دیتا ہے اور اس کی پکڑ سے نجات دینے والا کوئی نہیں،

---

[1] [سورة الانعام: آيت ۱٦٤]
[2] [سورة لقمان: آيت ۳۳]
[3] [سورة المدثر: آيت ٤٨]
[4] [سورة الشعراء: آيت ۱۰۰-۱۰۱]
[5] [سورة آل عمران: آيت ۹۱]
[6] [سورة المائده: آيت ۳٦]
[7] [سورة الانعام: آيت ۷۰]
[8] [سورة الحديد: آيت ۱٥]
[9] [سورة البقره: آيت ۲٥٤]
[10] [صحيح: صحيح بخاری: كتاب فضائل المدينة: باب حرم المدينة (۱۸۷۰) صحيح مسلم: كتاب الحج باب فضل المدينة (۱۳۷۰)]
[11] [مرسل ومنقطع: تفسير ابن جرير الطبری (۸۸۷)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے۔ حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔]
[12] [سورة الطارق: آيت ۱۰]
[13] [سوره المومنون: آيت ۸۸]

ایک جگہ ہے آج کے دن نہ اللہ کا سا کوئی عذاب دے سکے نہ اس کی سی قید و بند۔ (۱) ارشاد ہے ﴿مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُونَ ○ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُونَ﴾ (الصافات۲۵-۲۶) تم آج کیوں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے بلکہ وہ سب کے سب آج گردنیں جھکائے تابع فرمان بنے کھڑے ہیں اور آیت میں ہے ﴿فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً﴾ (۲) الخ اللہ کی نزدیکی کے لیے وہ اللہ کے سوا جن کی پوجا پاٹ کرتے تھے آج وہ معبود اپنے ان عابدوں کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ بلکہ وہ تو غائب ہو گئے۔

مطلب یہ ہے کہ محبتیں فنا ہو گئیں رشوتیں کٹ گئیں، شفاعتیں مٹ گئیں، آپس کی امداد و نصرت نابود ہو گئی معاملہ اس عادل حاکم جبار وقہار اللہ تعالیٰ مالک الملک سے پڑا ہے جس کے ہاں سفارشیوں کی سفارش اور مددگاروں کی مدد کچھ کام نہ آئے بلکہ اپنی تمام برائیوں کا بدلہ بھگتنا پڑے، ہاں یہ اس کی کمال بندہ پروری اور رحم و کرم انعام و اکرام ہے کہ گناہ کا بدلہ برابر دے اور نیکی کا بدلہ کم از کم دس گنا بڑھ کر دے۔ قرآن کریم میں ایک جگہ ہے کہ وقفہ لینے دو تا کہ ان سے ایک سوال کر لیا جائے کہ آج یہ ایک دوسرے کی مدد چھوڑ کر نفسا نفسی میں کیوں مشغول ہیں؟ بلکہ ہمارے سامنے سر جھکائے اور تابع فرمان ہیں۔ (۳)

وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۴۹﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ
فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۵۰﴾

اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی جو تمہیں بدترین عذاب کرتے تھے۔ جو تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو چھوڑ دیتے تھے اس نجات دینے میں تمہارے رب کی بڑی مہربانی تھی ○ اور جب ہم نے تمہارے لیے دریا چیر دیا اور تمہیں اس سے پار کر دیا اور فرعونیوں کو تمہاری نظروں کے سامنے اس میں ڈبو دیا ○

بنی اسرائیل کو انعامات کی یاد دہانی: ان آیتوں میں فرمان باری ہے کہ اے اولاد یعقوب علیہ السلام میری اس مہربانی کو بھی یاد رکھو کہ میں نے تمہیں فرعون کے بدترین عذابوں سے چھٹکارا دیا، فرعون (لعنہ اللہ) نے ایک خواب دیکھا تھا کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک آگ بھڑکی جو مصر کے ہر ہر قبطی کے گھر میں گھس گئی اور بنی اسرائیل کے مکانات میں وہ نہیں گئی جس کی تعبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہو گا جس کے ہاتھوں اس کا غرور ٹوٹے گا اس کے "اللہ" کے دعویٰ کی بدترین سزا اسے ملے گی اس لیے اس ملعون نے چاروں طرف احکام جاری کر دیئے کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ بھی پیدا ہو سرکاری طور سے اس کی دیکھ بھال رکھی جائے اگر لڑکا ہو تو مار ڈالا جائے اور اگر لڑکی ہو تو چھوڑ دی جائے علاوہ ازیں بنی اسرائیل سے سخت بیگار لی جائے ہر طرح کی مشقت کے کاموں کا بوجھ ان پر ڈال دیا جائے۔

یہاں پر عذاب کی تفسیر لڑکوں کے مار ڈالنے سے کی گئی اور سورۂ ابراہیم علیہ السلام میں ایک کا دوسری پر عطف ڈالا

---

(۱) [سورۃ الفجر : آیت ۲۵-۲۶] (۲) [سورۃ الاحقاف : آیت ۲۸]

(۳) [تفسیر ابن جریر الطبری (۱/۳۵)]

جس کی پوری تشریح ان شاء اللہ سورۂ قصص کے شروع میں بیان ہوگی اللہ تعالیٰ ہمیں مضبوطی دے ہماری مدد فرمائے اور تائید کرے! آمین۔ ﴿یَسُوْمُوْنَکُمْ﴾ کے معنی مسلسل اور کرنے کے آتے ہیں یعنی وہ برابر دکھ دیئے جاتے تھے چونکہ اس آیت میں پہلے یہ فرمایا تھا کہ میری انعام کی ہوئی نعمت کو یاد کرو اس لیے فرعونیوں کے عذاب کی تفسیر کو لڑکوں کے قتل کرنے کے طور پر بیان فرمایا اور سورۂ ابراہیم علیہ السلام کے شروع میں فرمایا تھا کہ تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو[1] اس لیے وہاں عطف کے ساتھ بیان فرمایا تاکہ نعمتوں کی تعداد زیادہ ہو۔ یعنی متفرق عذابوں سے اور بچوں کے قتل ہونے سے تمہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں نجات دلوائی۔ مصر کے جتنے بادشاہ عمالیق وغیرہ کفار میں سے ہوئے تھے ان سب کو فرعون کہا جاتا تھا جیسے کہ روم کے کافر بادشاہ کو قیصر اور فارس کے کافر بادشاہ کو کسریٰ اور یمن کے کافر بادشاہ کو تُبَّع اور حبشہ کے کافر بادشاہ کو نجاشی اور ہند کے کافر بادشاہ کو بطلیموس۔ اس فرعون کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ بعض نے مصعب بن ریان بھی کہا ہے۔ عملیق بن اود بن ارم بن سام بن نوح کی اولاد میں سے تھا اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔ اصل میں اصطخر کے فارسیوں کی نسل میں تھا اللہ کی پھٹکار اور لعنت اس پر نازل ہو۔

پھر فرمایا کہ اس نجات دینے میں ہماری طرف سے ایک بڑی بھاری نعمت تھی۔ ﴿بَـلَآءٌ﴾ کے اصلی معنی آزمائش کے ہیں لیکن یہاں پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت مجاہد ابو العالیہ ابو مالک سدی رحمہم اللہ وغیرہ سے نعمت کے معنی منقول ہیں[2] امتحان اور آزمائش بھلائی برائی دونوں کے ساتھ ہوتی ہے لیکن بَـلَوْتُـهٗ ابلوہ بلاء کا لفظ عموماً برائی کی آزمائش کے لیے[3] اور "اُبْـلِیْهِ اِبْلَآءً وَبَلَآءً" کا لفظ بھلائی کے ساتھ کی آزمائش کے لیے آتا ہے یہ کہا گیا ہے کہ اس میں تمہاری آزمائش یعنی عذاب میں اور اس بچوں کے قتل ہونے میں تھی۔

قرطبی رحمہ اللہ اس دوسرے مطلب کو جمہور کا قول کہتے ہیں تو اس میں اشارہ ذبح وغیرہ کی طرف ہوگا اور ﴿بَلَآءٌ﴾ کے معنی برائی کے ہوں گے پھر فرمایا کہ ہم نے فرعون سے بچالیا۔ تم موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ شہر سے نکلے اور فرعون تمہیں پکڑنے کو نکلا تو ہم نے تمہارے لیے پانی کو پھاڑ دیا اور تمہیں اس میں سے پار اتار کر تمہارے سامنے فرعون کو اس کے لشکر سمیت ڈبو دیا۔ ان سب باتوں کا تفصیل وار بیان سورۂ شعراء میں آئے گا ان شاء اللہ۔

عمرو بن میمون اودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے اور فرعون کو خبر ہوئی تو اس نے کہا کہ جب مرغ بولے تب سب نکلو اور سب کو پکڑ کر قتل کر ڈالو۔ لیکن اس رات اللہ تعالیٰ کی قدرت سے صبح تک کوئی مرغ نہ بولا مرغ کی آواز سنتے ہی فرعون نے ایک بکری ذبح کی اور کہا کہ اس کی کلیجی سے جب میں فارغ ہو جاؤں تو اس سے پہلے چھ لاکھ قبطیوں کا لشکر جرار میرے پاس حاضر ہو جانا چاہیے چنانچہ حاضر ہو گیا اور یہ ملعون اتنی بڑی جمعیت کو لے کر بنی اسرائیل کی ہلاکت کے لیے بڑے کر وفر سے نکلا اور دریا کے کنارے انہیں پا لیا۔ اب بنی اسرائیل پر دنیا تنگ آ گئی پیچھے ہٹیں تو فرعونیوں کی تلواروں کی بھینٹ چڑھیں آگے بڑھیں تو مچھلیوں کا لقمہ بنیں۔ اس وقت حضرت یوشع بن نون علیہ السلام نے کہا کہ اے اللہ کے نبی علیہ السلام اب کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا حکم

---

[1] [سورۃ ابراھیم: آیت ٥] [2] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٤٨)]

[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (١/٤٩)]

الٰہی ہمارا راہنما ہے، یہ سنتے ہی انہوں نے اپنا گھوڑا پانی میں ڈال دیا لیکن گہرے پانی میں جب غوطے کھانے لگا تو پھر کنارے کی طرف لوٹ آئے اور پوچھا اے موسیٰ علیہ السلام رب کی مدد کہاں ہے؟ ہم نہ آپ کو جھوٹا جانتے ہیں نہ رب کو۔ تین مرتبہ ایسا ہی کہا۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی آئی کہ اپنا عصا دریا پر مارو عصا مارتے ہی پانی نے راستہ دے دیا اور پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ [1]

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ماننے والے ان راستوں سے گذر گئے انہیں اس طرح پار اترتے دیکھ کر فرعون اور فرعونی افواج نے بھی اپنے گھوڑے اسی راستہ پر ڈال دیئے۔ جب تمام کے تمام اس میں داخل ہو گئے پانی کو مل جانے کا حکم ہوا پانی کے ملتے ہی تمام کے تمام ڈوب مرے بنی اسرائیل نے قدرت الٰہی کا یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھا جس سے وہ بہت ہی خوش ہوئے اپنی آزادی اور فرعون کی بربادی ان کے لیے خوشی کا سبب بنی۔ یہ بھی مروی ہے کہ یہ دن عاشورہ کا تھا یعنی محرم کی دسویں تاریخ۔

مسند احمد میں حدیث ہے کہ جب حضور علیہ السلام مدینہ شریف میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں پوچھا کہ تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا اس لیے کہ اس مبارک دن میں بنی اسرائیل نے فرعون کے ظلم سے نجات پائی اور ان کا دشمن غرق ہوا جس کے شکریہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ روزہ رکھا آپ نے فرمایا تم سے زیادہ حقدار موسیٰ علیہ السلام کا میں ہوں پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس دن روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ بخاری مسلم نسائی ابن ماجہ وغیرہ میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ [2]

ایک اور ضعیف حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے سمندر کو پھاڑ دیا تھا اس حدیث کے راوی زید العمی ضعیف ہیں اور ان کے استاد یزید رقاشی ان سے بھی زیادہ ضعیف ہیں۔ [3]

وَإِذْ وَٰعَدْنَا مُوسَىٰٓ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ثُمَّ ٱتَّخَذْتُمُ ٱلْعِجْلَ مِنۢ بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظَٰلِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنكُم مِّنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَإِذْ ءَاتَيْنَا مُوسَى ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾

ہم نے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا۔ پھر تم نے اس کے بعد بچھڑا پوجنا شروع کر دیا اور ظالم بن گئے ○ لیکن ہم نے باوجود اس کے پھر بھی تمہیں معاف کر دیا۔ تاکہ تم شکر کرو ○ اور ہم نے (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) کو تمہاری ہدایت کے لیے کتاب اور معجزے عطا فرمائے ○

---

[1] [سورۃ الشعراء: آیت ٦٣]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الصوم: باب صوم یوم عاشوراء (٢٠٠٤) صحیح مسلم: کتاب الصیام: باب صوم یوم عاشوراء (١١٣٠) ابن ماجہ: کتاب الصیام: باب صیام یوم عاشوراء (١٧٣٤) ابو داؤد: کتاب الصیام: باب فی صوم یوم عاشوراء (٢٤٤٤)]

[3] [ضعیف جدا: مسند ابو یعلی (٤٠٩٤) مجمع الزوائد (١٨٨/٣)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو سخت ضعیف کہا ہے۔]

موسیٰ علیہ السلام سے چالیس راتوں کا عہد اور بچھڑے کی عبادت: یہاں بھی اللہ برتر و اعلیٰ اپنے احسانات یاد دلا رہا ہے جب کہ تمہارے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے وعدے پر تمہارے پاس سے گئے اور اس کے بعد تم نے گوسالہ پرستی شروع کر دی پھر ان کے آنے پر جب تم نے اس شرک سے توبہ کی تو ہم نے تمہارے اتنے بڑے کفر کو بخش دیا اور قرآن میں ہے ﴿وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ﴾ (الاعراف/ ۱۴۲) یعنی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تیس راتوں کا وعدہ کیا اور دس بڑھا کر پوری چالیس راتوں کا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ وعدے کا زمانہ ذوالقعدہ کا پورا مہینہ اور دس دن ذوالحجہ کے تھے یہ واقعہ فرعونیوں سے نجات پا کر دریا سے بچ کر نکل جانے کے بعد پیش آیا تھا۔ کتاب سے مراد توراۃ ہے اور فرقان ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو حق و باطل ہدایت و ضلالت میں فرق کرے یہ کتاب بھی اس واقعہ کے بعد ملی جیسے کہ سورۂ اعراف کے اس واقعہ کے طرز بیان سے ظاہر ہوتا ہے دوسری جگہ ﴿بَعْدِ مَا اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى﴾ (القصص ۴۳) بھی آیا ہے یعنی ہم نے اگلے لوگوں کو ہلاک کرنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہ کتاب دی جو سب لوگوں کے لیے بصیرت افزا اور ہدایت و رحمت ہے تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ واؤ زائد ہے اور خود کتاب کو فرقان کہا گیا ہے لیکن یہ غریب ہے بعض نے کہا ہے کتاب پر ''فرقان'' کا عطف ہے یعنی کتاب بھی دی اور معجزہ بھی دیا۔ دراصل معنی کے اعتبار سے دونوں کا مفاد ایک ہی ہے اور ایسی ایک چیز دو ناموں سے بطور عطف کے کلام عرب میں آیا کرتی ہے شعراء عرب کے بہت سے اشعار اس کے شاہد ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى
بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

جب (حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو اور اپنے آپس میں قتل کرو تمہاری بہتری اللہ کے نزدیک اسی میں ہے وہ تمہاری توبہ قبول کرے گا وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم و کرم کرنے والا ہے

ظلم کرنے والوں کو اللہ کی طرف رجوع کی ہدایت: یہاں ان کی توبہ کا طریقہ بیان ہو رہا ہے انہوں نے بچھڑے کو پوجا اور اس کی محبت نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سمجھانے سے ہوش آیا اور نادم ہوئے اور اپنی گمراہی کا یقین کر کے توبہ استغفار کرنے لگے تب انہیں حکم ہوا کہ تم آپس میں قتل کرو۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کی اور قاتل و مقتول دونوں کو بخش دیا۔ اس کا پورا بیان سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ فرمان کہ اپنے خالق سے توبہ کرو بتا رہا ہے کہ اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہوگا کہ تمہیں پیدا اللہ تعالیٰ کرے اور تم پوجو غیروں کو۔ ایک روایت میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے انہیں حکم الٰہی سنایا اور جن جن لوگوں نے بچھڑا پوجا تھا انہیں بٹھا دیا اور دوسرے لوگ کھڑے رہ گئے اور قتل کرنا شروع کیا قدرتی طور پر اندھیرا چھایا ہوا تھا جب اندھیرا ہٹا تو انہیں روک دیا گیا۔ شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ ستر ہزار آدمی قتل ہو

چکے ہیں اور ساری قوم کی توبہ قبول ہوئی۔ [1]

یہ ایک سخت فرمان تھا جس کی ان لوگوں نے تعمیل کی اور اپنوں اور غیروں کو یکساں تہ تیغ کیا یہاں تک کہ رحمت الٰہی نے انہیں بخشا اور موسیٰ علیہ السلام سے فرمادیا کہ اب بس کرو۔ مقتول کو شہید کا اجر دیا قاتل کی اور باقی ماندہ تمام لوگوں کی توبہ قبول فرمائی اور انہیں جہاد کا ثواب دیا۔ موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام نے جب اسی طرح اپنی قوم کا قتل دیکھا تو دعا کرنی شروع کی کہ اللہ اب تو بنی اسرائیل مٹ جائیں گے چنانچہ انہیں معاف فرمادیا گیا اور پروردگار عالم نے فرمایا کہ اے میرے پیغمبر مقتولوں کا غم نہ کرو وہ ہمارے پاس شہیدوں کے درجہ میں ہیں وہ یہاں زندہ ہیں اور غذا پا رہے ہیں اب آپ کو اور آپ کی قوم کو صبر آیا اور عورتوں اور بچوں کی گریہ وزاری موقوف ہوئی۔ تلواریں نیزے چھرے اور چھریاں چلنی بند ہوئیں۔ آپس میں باپ بیٹوں بھائیوں بھائیوں میں قتل وخون موقوف ہوا اور اللہ تواب ورحیم نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

(تم اسے بھی یاد کرو کہ) تم نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا تھا کہ جب تک ہم اپنے رب کو سامنے نہ دیکھ لیں ہرگز ایمان نہ لائیں گے (جس گستاخی کی سزا میں) تم پر تمہارے دیکھتے ہی بجلی گری ○ لیکن پھر اس لیے کہ تم شکر گزاری کرو اس موت کے بعد بھی ہم نے تمہیں زندہ کردیا ○

ایمان نہ لانے کا بہانہ اور اس کی سزا: موسیٰ علیہ السلام جب اپنے ساتھ بنی اسرائیل کے ستر شخصوں کو لے کر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق کوہ طور پر گئے اور ان لوگوں نے کلام الٰہی سنا تو حضرت موسیٰ سے کہنے لگے ہم تو تب مانیں جب اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے خود دیکھ لیں۔ اس گستاخانہ سوال پر ان پر آسمان سے ان کے دیکھتے ہوئے بجلی گری اور ایک سخت ہولناک آواز آئی جس سے سب کے سب مر گئے موسیٰ علیہ السلام یہ دیکھ کر گریہ وزاری کرنے لگے اور رو رو کر جناب باری میں عرض کرنے لگے کہ یا اللہ بنی اسرائیل کو میں کیا جواب دوں گا یہ جماعت تو ان کے سرداروں اور بہترین لوگوں کی تھی پروردگار اگر یہی چاہت تھی تو انہیں اور مجھے اس سے پہلے ہی مار ڈالتا۔ یا اللہ بیوقوفوں کی بیوقوفی کے کام پر ہمیں نہ پکڑ۔ [2] یہ دعا مقبول ہوئی اور آپ کو معلوم کرایا گیا کہ یہ بھی دراصل بچھڑا پوجنے والوں میں سے تھے انہیں سزا مل گئی۔ پھر انہیں زندہ کردیا اور ایک کے بعد ایک کرکے سب زندہ کیے گئے۔ [3] ایک دوسرے کے زندہ ہونے کو ایک دوسرا دیکھتا رہا۔

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے پاس آئے اور انہیں بچھڑا پوجتے ہوئے دیکھا اور اپنے بھائی کو اور سامری کو تنبیہ کی۔ بچھڑے کو جلادیا اور اس کی راکھ دریا میں بہادی اس کے بعد ان میں سے بہترین لوگوں کو چن کر اپنے ساتھ لیا جن کی تعداد ستر تھی اور کوہ طور پر توبہ کرنے کے لیے چلے ان سے کہا کہ تم توبہ کرو

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۱۶۷۔۱۶۸) تفسیر ابن جریر الطبری (۱۸/۳۰۶)]

[2] [سورۃ الاعراف: آیت ۱۵۵] [3] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۱۷۳)]

روزہ رکھو' پاک صاف ہو جاؤ کپڑوں کو پاک کرلو جب بحکم الٰہی طور سینا پر پہنچے تو ان لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے پیغمبر اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ اپنا کلام ہمیں بھی سنائے جب موسیٰ علیہ السلام پہاڑ کے پاس پہنچے تو ایک بادل نے آ کر سارے پہاڑ کو ڈھک لیا اور آپ اسی کے اندر اللہ تعالیٰ کے قریب ہو گئے جب کلام رب ذوالجلال شروع ہوا تب موسیٰ علیہ السلام کی پیشانی نور سے چمکنے لگی اس طرح کہ کوئی اس طرف نظر اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا۔ بادل کی اوٹ ہو گئی اور سب لوگ سجدے میں گر پڑے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے آپ کے ساتھی بنی اسرائیل بھی اللہ تعالیٰ کا کلام سننے لگے کہ انہیں حکم احکام ہو رہے ہیں جب کلام الٰہ العالمین ختم ہوا بادل چھٹ گیا اور موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس چلے آئے تو یہ لوگ کہنے لگے موسیٰ ہم تو ایمان نہ لائیں گے جب تک اپنے رب کو اپنے سامنے نہ دیکھ لیں۔ اس گستاخی پر ایک زلزلہ آیا اور سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

اب موسیٰ علیہ السلام نے خلوص دل کے ساتھ دعائیں شروع کیں اور کہنے لگے اس سے تو یہی اچھا تھا کہ ہم سب اس سے پہلے ہی ہلاک ہو جاتے۔ بیوقوفوں کے کاموں پر ہمیں ہلاک نہ کر یہ لوگ ان کے چیدہ اور پسندیدہ لوگ تھے جب میں تنہا بنی اسرائیل کے پاس جاؤں گا تو انہیں کیا جواب دوں گا کون میری اس بات کو سچا سمجھے گا اور پھر اس کے بعد کون مجھ پر ایمان لائے گا؟ اللہ ہماری توبہ ہے۔ تو قبول فرما۔ اور ہم پر فضل و کرم کر' حضرت موسیٰ علیہ السلام یونہی خشوع و خضوع سے دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ پروردگار نے ان کی اس دعا کو قبول فرمایا اور ان مردوں کو زندہ کر دیا' اب سب نے یک زبان ہو کر بنی اسرائیل کی طرف سے توبہ شروع کی ان سے فرمایا گیا کہ جب تک یہ اپنی جانوں کو ہلاک نہ کریں اور ایک دوسرے کو قتل نہ کریں ان کی توبہ قبول نہیں فرماؤں گا۔ سدی کبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ واقعہ بنی اسرائیل کے آپس میں لڑانے کے بعد کا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خطاب گو عام ہے لیکن حقیقت میں اس سے مراد وہی ستر شخص ہیں۔

رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ان ستر شخصوں کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے جینے کے بعد کہا کہ اے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں نبی بنا دے۔ آپ نے دعا کی اور وہ قبول بھی ہوئی لیکن یہ قول غریب ہے موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں سوائے ہارون علیہ السلام کے اور اس کے بعد حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے کسی اور کی نبوت ثابت نہیں۔ اہل کتاب کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی دعا کے مطابق اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے اسی جگہ دیکھا یہ بھی غلط ہے اس لیے کہ خود موسیٰ علیہ السلام نے جب دیدار باری تعالیٰ کا سوال کیا تو انہیں منع کر دیا گیا پھر بھلا یہ ستر اشخاص دیدار باری کی تاب کیسے لاتے؟ اس آیت کی تفسیر میں ایک دوسرا قول بھی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام توراۃ لے کر آئے جو احکام کا مجموعہ تھی اور ان سے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس پر عمل کرو اور مضبوطی کے ساتھ اس کے پابند ہو جاؤ تو وہ کہنے لگے کہ حضرت ہمیں کیا خبر اللہ تعالیٰ خود آ کر ظاہر ہو کر ہم سے کیوں نہیں کہتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ آپ سے باتیں کرے اور ہم سے نہ کرے؟ جب تک ہم اللہ کو خود نہ دیکھ لیں ہرگز ایمان نہ لائیں گے اس قول پر ان کے اوپر غضب الٰہی نازل ہوا اور ہلاک کر دیئے گئے پھر زندہ کیے گئے پھر موسیٰ علیہ السلام نے انہیں کہا کہ اب تو اس توراۃ کو تھام لو انہوں نے پھر انکار کیا اب کی مرتبہ فرشتے پہاڑ اٹھا کر لائے اور ان کے سروں کے اوپر معلق کر دیا

کہ اگر نہ مانو گے تو یہ پہاڑ تم پر گرا دیا جائے گا اور تم سب پیس ڈالے جاؤ گے [1] اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد یہ جی اٹھے اور پھر بھی مکلّف رہے یعنی احکام الٰہی ان پر پھر بھی جاری رہے۔

ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی یہ زبردست نشانی دیکھ لی مرنے کے بعد زندہ ہوئے تو پھر تکلیف شرعی ان پر سے ہٹ گئی اس لیے کہ اب تو یہ مجبور تھے کہ سب کچھ مان لیں۔ خود ان پر یہ واردات پیش آئی اب تصدیق ایک بے اختیاری امر ہو گیا۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ نہیں بلکہ باوجود اس کے وہ احکام شرع کے مکلّف رہے کیونکہ ہر عاقل مکلّف ہے۔

قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں ٹھیک قول یہی ہے یہ امور ان پر قدرتی طور سے آئے تھے جو انہیں پابندی شرع سے آزاد نہیں کر سکتے خود بنی اسرائیل نے بھی بڑے بڑے معجزات دیکھے خود ان کے ساتھ ایسے ایسے معاملات ہوئے جو بالکل نادر اور خلاف قیاس اور زبردست معجزات تھے باوجود اس کے وہ بھی مکلّف رہے اسی طرح یہ بھی ٹھیک قول ہے اور واضح امر بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَ ظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ
وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

ہم نے تم پر بادل کا سایہ کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارا (اور کہہ دیا کہ) ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاتے رہو انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا البتہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کیا کرتے تھے ○

بادلوں کا سایہ: سابقہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ فلاں فلاں بلائیں ہم نے تم پر سے دفع کر دیں اب بیان ہو رہا ہے کہ فلاں فلاں نعمتیں بھی ہم نے تمہیں عطا فرمائیں "غَمَامٌ غَمَامَةٌ" کی جمع ہے چونکہ یہ آسمان کو چھپا لیتا ہے اس لیے اسے "غمامه" کہتے ہیں یہ ایک سفید رنگ کا بادل تھا جو وادی تیہ میں ان کے سروں پر سایہ کیے رہتا تھا جیسے نسائی وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک لمبی حدیث میں مروی ہے ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ربیع بن انس ابومجلز ضحاک اور سدی رحمہم اللہ نے بھی یہی کہا ہے حسن اور قتادہ رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ بادل عام بادلوں سے زیادہ ٹھنڈک والا اور زیادہ عمدہ تھا حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ وہی بادل تھا جس میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آئے گا ابوحذیفہ رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ (البقرہ/ ۲۱۰) الخ اس آیت میں اس کا ذکر ہے کہ کیا ان لوگوں کو اس کا انتظار ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے بادل میں آئیں۔ یہی وہ بادل ہے جس میں بدر والے دن فرشتے نازل ہوئے تھے۔

من وسلویٰ کا نزول: جو "مَــنّ" ان پر اترا وہ درختوں پر اترتا تھا۔ یہ صبح جاتے تھے اور جمع کر کے کھا لیا کرتے تھے وہ گوند کی قسم کا تھا۔ کوئی کہتا ہے شبنم کی وضع کا تھا حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اولوں کی طرح "من" ان کے گھروں میں اترتا تھا جو دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا تھا۔ صبح صادق سے لے کر آفتاب نکلنے تک اترتا رہتا تھا ہر

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/ ۸۸)]

شخص اپنے گھر بار کے لیے اتنی مقدار میں جمع کر لیتا تھا جتنا اس دن کافی ہوا گر کوئی زیادہ لیتا تو بگڑ جاتا تھا۔ جمعہ کے دن وہ دو (دن) کا لے لیتے تھے جمعہ اور ہفتہ کا اس لیے کہ ہفتہ ان کا بڑا دن تھا ربیع بن انس رحمہ اللہ کہتے ہیں من شہد جیسی چیز تھی جس میں پانی ملا کر پیتے تھے۔ شعبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تمہارا یہ شہد اس ''من'' کا سترواں حصہ ہے شعروں میں یہی ''من'' شہد کے معنی میں آیا ہے یہ سب اقوال قریب قریب ہیں۔ غرض یہ کہ ایک ایسی چیز تھی جو انہیں بلا تکلیف وتکلف ملتی تھی اگر صرف اسے کھایا جائے تو وہ کھانے کی چیز تھی اور اگر پانی میں ملالی جائے تو پینے کی چیز تھی اور اگر دوسری چیزوں کے ساتھ مرکب کر دی جائے تو اور چیز ہو جاتی تھی لیکن یہاں ''من'' سے مراد یہی ''من'' مشہور نہیں۔

صحیح بخاری شریف کی حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کھمبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے شفا ہے [1] ترمذی رحمہ اللہ اسے حسن صحیح کہتے ہیں ترمذی میں ہے کہ عجوہ جو مدینہ کی کھجوروں کی ایک قسم ہے وہ جنتی چیز ہے اور اس میں زہر کا تریاق ہے اور کھمبی من میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے درد کی دوا ہے [2] یہ حدیث حسن غریب ہے۔ دوسرے بہت سے طریقوں سے بھی مروی ہے۔ ابن مردویہ کی حدیث میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس درخت کے بارے میں اختلاف کیا جو زمین کے اوپر ہوتا ہے جس کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ بعض کہنے لگے کھمبی کا درخت ہے آپ نے فرمایا کھمبی تو ''من'' میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے شفا ہے [3] ''سلویٰ'' ایک قسم کا پرندہ ہے چڑیا سے کچھ بڑا ہوتا ہے سرخی مائل رنگ کا جنوبی ہوائیں چلتی تھیں اور ان پرندوں کو وہاں لا کر جمع کر دیتی تھیں بنی اسرائیل اپنی ضرورت کے مطابق انہیں پکڑ لیتے تھے اور ذبح کر کے کھاتے تھے اگر ایک دن گذر کر بچ جاتا تو وہ بگڑ جاتا تھا اور جمعہ کے دن دو دن کے لیے جمع کر لیتے تھے کیونکہ ہفتہ کا دن ان کے لیے عید کا دن ہوتا تھا اس دن عبادتوں میں مشغول رہنے اور شکار وغیرہ سے بچنے کا حکم تھا۔ [4] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ پرند کبوتر کے برابر ہوتے تھے ایک میل کی لمبائی چوڑائی میں ایک نیزے کے برابر اونچا ڈھیر ان پرندوں کا ہو جاتا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ان پر وادی تیہ میں اتری تھیں جہاں انہوں نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ اس جنگل میں ہمارے کھانے کا بندوبست کیسے ہوگا تب ان پر ''من وسلویٰ'' اتارا گیا۔

اور پانی کے لیے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی گئی تو پروردگار عالم نے فرمایا کہ ''اس پتھر پر اپنا عصا مارو'' [5] عصا لگتے ہی اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے اور بنی اسرائیل کے بارہ ہی فرقے تھے۔ ہر قبیلہ نے

---

[1] [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب التفسیر (٤٤٧٨، ٤٦٣٩) و کتاب الطب: باب المن شفاء للعین (٥٧٠٨) صحیح مسلم: کتاب الاشربۃ: باب فضل الکماۃ (٢٠٤٩) ترمذی: کتاب الطب: باب ما جآء فی الکماۃ والعجوۃ (٢٠٦٧) ابن ماجہ: کتاب الطب: باب الکماۃ والعجوۃ (٣٤٥٤)]

[2] [**صحیح**: ترمذی (٢٠٦٦ ـ ٢٠٦٧) ابن ماجہ (٣٤٥٥) مسند احمد (٢/٣٠١)] مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

[3] [**صحیح بالشواھد**: ابن عدی فی الکامل (٢/ ٣٧٠)]

[4] تفسیر ابن ابی حاتم (١/ ١٧٩)] [5] [سورۃ البقرہ: آیت ٦٠]

ایک ایک چشمہ اپنے لیے بانٹ لیا' پھر سایہ کے طالب ہوئے کہ اس چٹیل میدان میں سایہ بغیر گذر مشکل ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے طور پہاڑ کا ان پر سایہ کر دیا' رہ گیا لباس تو قدرت الٰہی سے جو لباس وہ پہنے ہوئے تھے وہ ان کے قد کے بڑھنے کے ساتھ بڑھتا رہتا تھا ایک سال کے بچہ کا لباس جوں جوں اس کا قد وقامت بڑھتا لباس میں بڑھتا جاتا نہ پھٹتا نہ خراب ہوتا نہ میلا ہوتا' ان تمام نعمتوں کا ذکر مختلف جگہ قرآن پاک میں موجود ہے جیسے یہ آیت اور ﴿اِذِ اسۡتَسۡقٰى ......﴾ [1] والی آیت وغیرہ۔

ہذلی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سلوی شہد کو کہتے ہیں لیکن ان کا یہ قول غلط ہے اور جوہری رحمہ اللہ نے بھی یہی کہا ہے اور اس کی شہادت میں عرب شاعروں کے شعر اور بعض لغوی محاورے بھی پیش کیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک دوا کا نام ہے کسائی رحمہ اللہ کہتے ہیں سلویٰ واحد کا لفظ ہے اور اس کی جمع سلاوی آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ جمع میں اور مفرد میں یہی صیغہ رہتا ہے یعنی لفظ سلویٰ۔ غرض یہ اللہ کی دو نعمتیں تھیں جن کا کھانا ان کے لیے مباح کیا گیا لیکن ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی ناشکری کی اور یہی ان کا اپنی جانوں پر ظلم کرنا تھا باوجود یہ کہ اس سے پہلے بہت کچھ اللہ کی نعمتیں ان پر نازل ہو چکی تھیں۔

اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ بنی اسرائیل کے برعکس: بنی اسرائیل کی حالت کا یہ نقشہ آنکھوں کے سامنے رکھ کر پھر اصحاب رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت پر نظر ڈالو کہ باوجود سخت سے سخت مصیبتیں جھیلنے اور بے انتہا تکلیفیں برداشت کرنے کے وہ اتباع نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور عبادت الٰہی پر جمے رہے نہ معجزات طلب کئے' نہ دنیا کی راحتیں مانگیں' نہ اپنے تعیش کے لیے کوئی نئی چیز پیدا کرنے کی خواہش کی' جنگ تبوک میں جبکہ بھوک کے مارے بیتاب ہو گئے اور موت کا مزہ آنے لگا تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کھانے میں برکت کی دعا کیجیے اور جس کے پاس جو کچھ بچا کھچا تھا جمع کر کے حاضر کر دیا جو سب مل کر بھی نہ ہونے کے برابر ہی تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے قبول فرما کر اس میں برکت دی انہوں نے خوب کھایا بھی اور تمام توشے دان بھر لیے' پانی کے قطرے قطرے کو جب ترسنے لگے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ایک ابر آیا اور ریل پیل کر دی' پیا' پلایا اور مشکیں اور مشکیزے سب بھر لیے پس صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس ثابت قدمی اولو العزمی کامل اتباع اور سچی توحید نے ان کی اصحاب موسیٰ علیہ السلام پر قطعی فضیلت ثابت کر دی۔

وَاِذۡ قُلۡنَا ادۡخُلُوۡا هٰذِهِ الۡقَرۡيَةَ فَكُلُوۡا مِنۡهَا حَيۡثُ شِئۡتُمۡ رَغَدًا وَّادۡخُلُوا الۡبَابَ سُجَّدًا وَّقُوۡلُوۡا حِطَّةٌ نَّغۡفِرۡ لَكُمۡ خَطٰيٰكُمۡ‌ؕ وَسَنَزِيۡدُ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا قَوۡلًا غَيۡرَ الَّذِىۡ قِيۡلَ لَهُمۡ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۵۹﴾ ع

ہم نے تم سے کہا کہ اس بستی میں جاؤ اور جو کچھ جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو اور دروازے میں سے سجدے کرتے ہوئے گذرو اور زبان سے حِطَّةٌ کہو ہم تمہاری خطائیں معاف فرما دیں گے اور بھلے لوگوں کو اور زیادہ دیں گے ○ پھر ان

---

[1] [سورۃ البقرہ : آیت ٦٠]

ظالموں نے اس بات کو جوان سے کہی گئی تھی بدل ڈالا ہم نے بھی ان ظالموں پر ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل کیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے آئے اور انہیں ارض مقدس میں داخل ہونے کا حکم ہوا جو ان کی موروثی زمین تھی ان سے کہا گیا کہ یہاں جو عمالیق ہیں ان سے جہاد کرو تو ان لوگوں نے نامردی دکھائی جس کی سزا میں انہیں میدان تیہ میں ڈال دیا گیا جیسے کہ سورۂ مائدہ میں ذکر ہے [1] قریہ سے مراد بیت المقدس ہے۔ [2] سدی' ربیع' قتادہ' ابو مسلم رحمہم اللہ وغیرہ نے یہی کہا ہے' قرآن میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم اس پاک زمین میں جاؤ جو تمہارے لیے لکھ دی گئی ہے بعض کہتے ہیں اس سے مراد ''اریحا'' ہے بعض نے کہا ہے مصر مراد ہے لیکن صحیح قول پہلا ہی ہے کہ مراد اس سے بیت المقدس ہے یہ واقعہ تیہ سے نکلنے کے بعد کا ہے جمعہ کے دن شام کو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر فتح عطا کی بلکہ سورج کو ان کے لیے ذرا سی دیر ٹھہرا دیا تھا تاکہ فتح ہو جائے فتح کے بعد انہیں حکم ہوا کہ اس شہر میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہوں۔ جو اس فتح کے اظہار تشکر کا مظہر ہوگا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سجدے سے مراد رکوع لیا ہے۔ [3] راوی کہتے ہیں کہ سجدے سے مراد یہاں پر خشوع وخضوع ہے کیونکہ حقیقت پر اسے محمول کرنا ناممکن ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں یہ دروازہ قبلہ کی جانب تھا اس کا نام باب الحطة تھا۔ رازی رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ دروازے سے مراد جہت قبلہ ہے۔ بجائے سجدے کے اس قوم نے اپنی رانوں پر کھسکنا شروع کیا اور کروٹ کے بل داخل ہونے لگے سروں کو جھکانے کے بجائے اور اونچا کر لیا۔ [4] ﴿حِطَّةٌ﴾ کے معنی بخشش کے ہیں۔ [5] بعض نے کہا ہے کہ یہ امر حق ہے۔ عکرمہ رحمہ اللہ کہتے ہیں اس سے مراد ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہنا ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں ان میں گناہوں کا اقرار ہے۔ حسن اور قتادہ رحمہما اللہ فرماتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں اللہ ہماری خطاؤں کو ہم سے دور کر دے۔ [6] پھر ان سے وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر تم اسی طرح یہی کہتے ہوئے شہر میں جاؤ گے اور اس فتح کے وقت بھی اپنی پستی اور اللہ کی نعمت اور اپنے گناہوں کا اقرار کرو گے اور مجھ سے بخشش مانگو گے تو چونکہ یہ چیزیں مجھے بہت ہی پسند ہیں میں تمہاری خطاؤں سے درگذر کر لوں گا۔

فتح مکہ کے موقعہ پر فرمان الٰہی سورۂ ﴿اِذَا جَآءَ﴾ [7] نازل ہوئی تھی اور اس میں بھی یہی حکم دیا گیا تھا کہ جب اللہ کی مدد آ جائے مکہ فتح ہو اور لوگ دین اللہ میں فوج در فوج آنے لگیں تو اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم اپنے رب کی تسبیح اور حمد وثنا بیان کرو اس سے استغفار کرو وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اس سورت میں جہاں ذکر و استغفار کا ذکر ہے وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت کی خبر بھی ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس سورت کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا تھا [8] جسے آپ نے پسند فرمایا تھا جب مکہ فتح ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں داخل

---

[1] [سورة المائدہ : آیت ۲۱]

[2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۱۸۱)]

[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/ ۱۱۳)]

[4] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۱۸۳)]

[5] [ایضا]

[6] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۱۸۵)]

[7] [سورة النصر : آیت ۱]

[8] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب المغازی (٤٢٩٤)]

ہوئے تو انتہائی تواضع اور مسکینی کے آثار آپ پر تھے یہاں تک کہ سر جھکائے ہوئے تھے کہ اونٹنی کے پالان سے سر لگ گیا تھا۔ شہر میں جاتے ہی غسل کر کے ضحیٰ کے وقت آٹھ رکعت نماز ادا کی [1] جو ضحیٰ کی نماز بھی تھی اور فتح کے شکریہ کی بھی۔ دونوں طرح کے قول محدثین رحمہ اللہ کے ہیں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب ملک ایران فتح کیا اور کسریٰ کے شاہی محلات میں پہنچے تو اسی سنت کے مطابق آٹھ رکعتیں پڑھیں دو دو رکعت ایک سلام سے پڑھنے کا بعض کا مذہب ہے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آٹھ ایک ساتھ ایک ہی سلام سے پڑھیں۔ واللہ اعلم۔ صحیح بخاری شریف میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں بنی اسرائیل کو حکم کیا گیا کہ وہ سجدہ کرتے ہوئے اور ﴿حِطَّةٌ﴾ کہتے ہوئے دروازے میں داخل ہوں لیکن انہوں نے بدل دیا اور اپنی رانوں پر گھسٹتے ہوئے اور "حِطَّةٌ" کے بجائے "حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ" کہتے ہوئے جانے لگے۔ [2] نسائی، عبدالرزاق، ابوداود، مسلم اور ترمذی میں بھی یہ حدیث بہ اختلاف الفاظ موجود ہے اور سنداً صحیح ہے [3] حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے ذات الحنظل نامی گھاٹی کے قریب پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ اس گھاٹی کی مثال بھی بنی اسرائیل کے اس دروازے جیسی ہے جہاں انہیں سجدہ کرتے ہوئے اور "حِطَّةٌ" کہتے ہوئے داخل ہونے کو کہا گیا تھا اور ان کے گناہوں کی معافی کا وعدہ کیا گیا تھا [4] حضرت براء فرماتے ہیں ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ﴾ [5] میں "سُفَهَآءُ" یعنی جاہلوں سے مراد یہود ہیں جنہوں نے اللہ کی بات کو بدل دیا تھا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "حِطَّةٌ" کے بدلے انہوں نے "حَبَّةٌ حِنْطَةٌ حَمْرَاءُ مَثْقُوبَةٌ فِيهَا شَعِيرَةٌ سَوْدَاءُ" کہا تھا ان کی اپنی زبان میں ان کے الفاظ یہ تھے "هطا سمعاتا أزبة مزبا" ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی ان کی اس لفظی تبدیلی کو بیان فرماتے ہیں کہ رکوع کرنے کے بدلے وہ رانوں پر گھسٹتے ہوئے اور "حِطَّةٌ" کے بدلے "حِنْطَةٌ" کہتے ہوئے داخل ہوئے حضرت عطا، مجاہد، عکرمہ، ضحاک، حسن، قتادہ، ربیع، یحییٰ رحمہ اللہ نے بھی یہی بیان کیا ہے مطلب یہ ہے کہ جس قول و فعل کا انہیں حکم دیا گیا تھا انہوں نے مذاق اڑایا جو صریح مخالفت اور معاندت تھی اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب نازل فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ظالموں پر ان کے فسق کی وجہ سے آسمانی عذاب نازل فرمایا۔ "رِجْزٌ" سے مراد عذاب ہے [6] کوئی کہتا ہے غضب ہے کسی نے طاعون کہا ہے۔

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب التقصیر: باب من تطوع فی السفر (۱۱۰۳) صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین: باب استحباب الصلوۃ الضحیٰ (۳۳۶)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب التفسیر: سورۃ البقرۃ (۴۴۷۹)]

[3] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء (۳۴۰۳) صحیح مسلم: کتاب التفسیر (۳۰۱۵) ابوداؤد: کتاب الحروف (۴۰۰۷) ترمذی: کتاب تفسیر القرآن: باب ومن سورۃ البقرۃ (۲۹۵٦)]

[4] [ضعیف: مسند بزار (۱۸۱۲) مجمع الزوائد (۱۴۴/٦)] اس میں ابراہیم بن مہدی راوی ضعیف ہے۔ [میزان (٦٨/۱)] حافظ زبیر علی زئی اس کی سند کو ضعیف کہتے ہیں۔]

[5] [سورۃ البقرہ: آیت ۱۴۲]

[6] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱۸۷/۱)]

ایک مرفوع حدیث ہے طاعون رجز ہے اور یہ عذاب تم سے اگلے لوگوں پر اتارا گیا تھا۔ [1] بخاری و مسلم میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تم سنو کہ فلاں جگہ طاعون ہے تو وہاں نہ جاؤ الخ [2] ابن جریر میں ہے کہ یہ دکھ اور بیماری رجز ہے۔ تم سے پہلے لوگ انہی سے عذاب دیئے گئے تھے۔ [3]

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۭ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا اپنی لکڑی پتھر پر مارو۔ جس سے بارہ چشمے بہہ نکلے اور ہر گروہ نے اپنا چشمہ پہچان لیا (اور ہم نے کہہ دیا کہ) اللہ تعالیٰ کا رزق کھاتے پیتے رہو اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرو۔

بنی اسرائیل پر ایک اور انعام: یہ ایک اور نعمت یاد دلائی جا رہی ہے کہ جب تمہارے نبی نے تمہارے لیے پانی طلب کیا تو ہم نے اس پتھر سے چشمے بہا دیئے جو تمہارے ساتھ رہا کرتا تھا اور تمہارے ہر ہر قبیلے کے لیے اس میں سے ایک ایک چشمہ ہم نے جاری کرا دیا جسے ہر قبیلہ نے جان لیا اور ہم نے کہہ دیا کہ من و سلویٰ کھاتے رہو اور ان چشموں کا پانی پیتے رہو اور اس بے محنت کی روزی کو کھا پی کر ہماری عبادت میں لگے رہو نافرمانی کر کے زمین میں فساد مت پھیلاؤ ورنہ یہ نعمتیں چھن جائیں گی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ ایک چکور پتھر تھا جو ان کے ساتھ ہی تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بحکم اللہ اس پر لکڑی ماری چاروں طرف سے تین تین نہریں بہ نکلیں۔ یہ پتھر بیل کے سر جتنا تھا جو بیل پر لاد دیا جاتا تھا جہاں اترتے رکھ دیتے اور عصا کی ضرب لگتے ہی اس میں سے نہریں بہ نکلتیں۔ جب کوچ کرتے اٹھا لیتے نہریں بند ہو جاتیں اور پتھر کو ساتھ رکھ لیتے۔ یہ پتھر طور پہاڑ کا تھا ایک ہاتھ لمبا اور ایک ہاتھ چوڑا تھا۔

بعض کہتے ہیں یہ جنتی پتھر تھا دس دس ہاتھ لمبا چوڑا تھا دو شاخیں تھیں جو چمکتی رہتی تھیں۔ ایک اور قول میں ہے کہ یہ پتھر حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے آیا تھا اور یونہی ہاتھوں ہاتھ پہنچتا ہوا حضرت شعیب علیہ السلام کو ملا تھا انہوں نے لکڑی اور پتھر دونوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے تھے بعض کہتے ہیں یہ وہی پتھر ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام اپنے کپڑے رکھ کر نہا رہے تھے اور بحکم الٰہی یہ پتھر آپ کے کپڑے لے کر بھاگا تھا اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے مشورے سے اٹھا لیا تھا جس سے آپ کا یہ معجزہ ظاہر ہوا۔

زمخشری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حجر پر الف لام جنس کے لیے ہے عہد کے لیے نہیں یعنی کسی ایک پتھر پر عصا مارو یہ نہیں کہ فلاں پتھر ہی پر مارو۔ حضرت حسن رحمہ اللہ سے بھی یہی مروی ہے اور یہی معجزے کا کمال اور قدرت کا پورا

---

[1] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب السلام: باب الطاعون والطیرۃ والکھانۃ ونحوھا (۲۲۱۸)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الطب: باب ما یذکر فی الطاعون (۵۷۲۸) مسند احمد (۵/۲۰۶)]

[3] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء (۳۴۷۳-۶۹۷۴) صحیح ابن حبان (۲۹۵۲) موطا (۲/۸۹۶) مسند احمد (۵/۲۰۲)]

اظہار ہے آپ کی لکڑی لگتے ہی وہ بہنے لگتا اور پھر دوسری لکڑی لگتے ہی خشک ہو جاتا۔ بنی اسرائیل آپس میں کہنے لگے کہ اگر یہ پتھر گم ہو گیا تو ہم پیاسے مرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم لکڑی نہ مارو صرف زبانی کہو تا کہ انہیں یقین آ جائے۔ واللہ اعلم۔

ہر ایک قبیلہ اپنی اپنی نہر کو اس طرح جان لیتا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک آدمی پتھر کے پاس کھڑا رہ جاتا اور لکڑی لگتے ہی اس میں سے چشمے جاری ہو جاتے جس شخص کی طرف جو چشمہ جاتا وہ اپنے قبیلے کو بلا کر کہہ دیتا کہ یہ چشمہ تمہارا ہے یہ واقعہ میدان تیہ کا ہے سورۂ اعراف میں بھی اس واقعہ کا بیان ہے لیکن چونکہ وہ سورت مکی ہے اس لیے وہاں ان کا بیان غائب کی ضمیر سے کیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو احسانات ان پر نازل فرمائے تھے وہ اپنے رسول ﷺ کے سامنے دہرائے ہیں اور یہ سورت مدنی ہے اس لیے یہاں خود انہیں خطاب کیا گیا ہے۔ سورۂ اعراف میں ﴿فَانۢبَجَسَتْ﴾ [1] کہا اور یہاں ﴿فَانْفَجَرَتْ﴾ کہا اس لیے کہ وہاں اول جاری ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں آخری حال کا بیان ہے۔ واللہ اعلم۔ اور ان دونوں جگہ کے بیان میں دس وجہ سے فرق ہے جو فرق لفظی بھی ہے اور معنوی بھی۔ زمخشری رحمہ اللہ نے اپنے طور پر ان سب وجوہ کو بیان کیا ہے اور حقیقت اس میں قریب ہے واللہ اعلم۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ
الْأَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ
هُوَ أَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُمْ مَّا سَأَلْتُمْ ۭ

اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم سے ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہ ہو سکے گا۔ اپنے رب سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں زمین کی پیداوار ساگ، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز دے، آپ نے فرمایا بہتر چیز کے بدلے یہ ادنیٰ چیز کیوں طلب کرتے ہو؟ اچھا کسی شہر میں جاؤ وہاں تمہیں تمہاری چاہت کی یہ سب چیزیں ملیں گی

اچھی چیز چھوڑ کے گھٹیا کا انتخاب: یہاں بنی اسرائیل کی بے صبری اور نعمت اللہ کی ناقدری بیان کی جا رہی ہے کہ من و سلویٰ جیسے پاکیزہ کھانے پر ان سے صبر نہ ہو سکا اور ردی چیزیں مانگنے لگے ایک طعام سے مراد ایک قسم کا کھانا ہے یعنی من و سلویٰ ہے۔ ﴿فُوْمٌ﴾ کے معنی میں اختلاف ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں "ثُوْمٌ" ہے، مجاہد رحمہ اللہ نے ﴿فُوْمٌ﴾ کی تفسیر "ثُوْمٌ" کے ساتھ کی ہے یعنی لہسن، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ تفسیر مروی ہے [2] اگلی لغت کی کتابوں میں "فَوِّمُوْا لَنَا" کے معنی "اِخْتَبِزُوْا" یعنی ہماری روٹی پکاؤ کے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر یہ صحیح ہو تو یہ حروف مبتدلہ میں سے ہیں جیسے "عاثور شر، عافور شر، اثافی، اثاثی، مغافیر، مغاثیر" وغیرہ جن میں ف سے ث اور ث سے ف بدلا گیا کیونکہ یہ دونوں مخرج کے اعتبار سے بہت قریب ہیں واللہ اعلم۔ [3] اور لوگ کہتے ہیں فُوْم کے معنی گیہوں کے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی تفسیر منقول ہے اور احیحہ بن جلاح

[1] [سورۃ الاعراف : آیت ۱۶۰] [2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۱۹۳)]

[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/۱۳۰)]

کے شعر میں بھی فُوْم گیہوں کے معنی میں آیا ہے۔ بنی ہاشم کی زبان میں فُوْم گیہوں کے معنی میں مستعمل تھا۔ فُوْم کے معنی روٹی کے بھی ہیں بعض نے سنبلہ کے معنی کیے ہیں حضرت قتادہ اور حضرت عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس اناج کی روٹی پکتی ہے اسے فُوْم کہتے ہیں بعض کہتے ہیں فُوْم ہر قسم کے اناج کو کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈانٹا کہ تم ردی چیز کو بہتر کے بدلے کیوں طلب کرتے ہو؟ پھر فرمایا: شہر میں جاؤ وہاں یہ سب چیزیں پاؤ گے جمہور کی قرات "مصراً" ہی ہے اور تمام قراتوں میں یہی لکھا ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ شہروں میں سے کسی شہر میں چلے جاؤ۔ [1] ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے "مِصْرَ" کی قرات بھی ہے اور اس کی تفسیر مصر شہر سے کی گئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصراً سے بھی مراد مخصوص شہر مصر لیا گیا ہو اور یہ الف "مصراً" کا ایسا ہو جیسا ﴿قَوَارِیْرَا۟ قَوَارِیْرَا۟﴾ [2] میں ہے مصر سے مراد عام شہر لینا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جو چیز تم طلب کرتے ہو یہ تو آسان چیز ہے۔ جس شہر میں جاؤ گے یہ تمام چیزیں وہاں پالو گے میری دعا کی بھی کیا ضرورت ہے؟ کیونکہ ان کا یہ قول محض تکبر سرکشی اور بڑائی کے طور پر تھا اس لیے انہیں کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع

ان پر ذلت اور مسکینی ڈالی گئی اور اللہ کا غضب لے کر وہ لوٹے یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے ○

بغاوت و نافرمانی کی سزا: مطلب یہ ہے کہ ذلت اور مسکینی ان کا مقدر بنا دی گئی۔ اہانت و پستی ان پر مسلط کر دی گئی جزیہ ان سے وصول کیا گیا مسلمانوں کے قدموں تلے انہیں ڈال دیا گیا فاقہ کشی اور بھیک کی نوبت پہنچی اللہ کا غضب و غصہ ان پر اترا "بآءو" کے معنی لوٹنے اور "رجوع کیا" کے ہیں "بَآءَ" کبھی بھلائی کے صلہ کے ساتھ اور کبھی برائی کے صلہ کے ساتھ آتا ہے یہاں برائی کے صلہ کے ساتھ ہے یہ تمام عذاب ان کے تکبر عناد حق کی قبولیت سے انکار، اللہ کی آیتوں سے کفر اور انبیاء علیہم السلام اور ان کے تابعداروں کی اہانت اور ان کے قتل کی بنا پر تھا اس سے زیادہ کفر اور کون سا ہوگا؟ کہ اللہ کی آیتوں سے کفر کرتے اور اس کے نبیوں علیہم السلام کو بلاوجہ قتل کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تکبر کے معنی حق کو چھپانے اور لوگوں کو ذلیل سمجھنے کے ہیں۔ [3]

مالک بن مرارہ رہاوی رضی اللہ عنہ ایک روز خدمت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں خوبصورت آدمی ہوں میں نہیں چاہتا کہ کسی کی جوتی کا تسمہ بھی مجھ سے اچھا ہو تو کیا یہ تکبر اور سرکشی ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تکبر اور سرکشی حق کو رد کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے [4] چونکہ بنی اسرائیل کا تکبر کفر و قتل انبیاء تک پہنچ گیا

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۱۹٤)] [2] [سورۃ الدھر: آیت ۱۵-۱٦]

[3] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب تحریم الکبر و بیانہ (۹۱) بخاری فی تاریخہ (۳/۱/۲)]

[4] [صحیح: مسند احمد (۱/۳۸۵)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [غایۃ المرام (۱۱٤)] مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

تھا اس لیے اللہ کا غضب ان پر لازم ہو گیا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل تین تین سو نبیوں علیہم السلام کو ایک ایک دن میں قتل کر ڈالتے تھے پھر بازاروں میں جا کر اپنے لین دین میں مشغول ہو جاتے۔ (ابوداود طیالسی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سب سے زیادہ سخت عذاب قیامت کے دن اس شخص کو ہو گا جسے کسی نبی نے قتل کیا ہو یا اس نے کسی نبی کو مار ڈالا ہو اور گمراہی کا امام اور تصویریں بنانے والا یعنی مصور ہو گا۔ [1] یہ ان کی نافرمانیوں اور ظلم و زیادتی کا بدلہ تھا یہ دوسرا سبب ہے کہ وہ منع کیے ہوئے کام ہی کرتے تھے اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۞

مسلمان ہوں، یہودی ہوں، نصاریٰ ہوں یا صابی ہوں جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے ان کے اجر ان کے رب کے پاس ہیں اور ان پر نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ اداسی ○

انبیاء کے اطاعت گزار صرف مومن لوگ: اوپر چونکہ نافرمانوں کے عذاب کا ذکر تھا تو یہاں ان میں جو لوگ نیک تھے ان کے ثواب کا بیان ہو رہا ہے نبی کی تابعداری کرنے والوں کے لیے یہ بشارت تا قیامت ہے کہ نہ مستقبل کا ڈر نہ یہاں حاصل نہ ہونے والی اشیاء کا افسوس و حسرت۔ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (یونس/ ٦٢) یعنی اللہ کے دوستوں پر کوئی خوف و غم نہیں اور وہ فرشتے جو مسلمان کی روح نکلنے کے وقت آتے ہیں یہی کہتے ہیں کہ ﴿اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ (حم السجدہ/ ٣٠) تم ڈرو نہیں تم اداس نہ ہو تمہیں ہم اس جنت کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے جن ایمان والوں سے ملا تھا ان کی عبادت اور نماز روزے وغیرہ کا ذکر کیا تو یہ آیت اتری۔ (ابن ابی حاتم) ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نمازی روزہ دار ایماندار اور اس بات کے معتقد تھے کہ آپ مبعوث ہونے والے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جہنمی ہیں، [2] حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو اس کا بڑا رنج ہوا وہیں یہ آیت نازل ہوئی لیکن یہ واضح رہے کہ یہودیوں میں سے ایماندار وہ ہے جو توراۃ کو مانتا ہو اور سنت موسیٰ علیہ السلام کا عامل ہو لیکن جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آ جائیں تو ان کی تابعداری کرے اور ان کی نبوت کو برحق سمجھے۔ اگر اب بھی وہ توراۃ اور سنت موسیٰ علیہ السلام پر جما رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرے اور تابعداری نہ کرے تو پھر بے دین ہو جائے گا۔

اسی طرح نصرانیوں میں سے ایماندار وہ ہے جو انجیل کو کلام اللہ مانے شریعت عیسوی پر عمل کرے اور اگر اپنے

---

[1] [صحیح: مسند احمد (١/ ٤٠٧)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[السلسلة الصحيحة (٢٨١)] مولانا مبشر احمد ربانی نے اسے حسن کہا ہے۔]

[2] [ضعیف و منقطع: تفسیر ابن جریر الطبری (١١١٤) تفسیر ابن ابی حاتم (١/ ١٩٨)]

زمانے میں پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو پالے تو آپ کی تابعداری اور آپ کی نبوت کی تصدیق کرے اگر اب بھی وہ انجیل کو اور اتباع عیسوی کو نہ چھوڑے اور حضور ﷺ کی رسالت کو تسلیم نہ کرے تو ہلاک ہوگا۔ (ابن ابی حاتم) سدی رحمہ اللہ نے یہی روایت کی ہے اور سعید بن جبیر رحمہ اللہ بھی یہی فرماتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کا تابعدار اس کا ماننے والا ایماندار اور صالح ہے اور اللہ کے ہاں نجات پانے والا لیکن جب وہ دوسرا نبی آئے اور وہ اس سے انکار کرے تو کافر ہو جائے گا، قرآن کی ایک آیت تو یہ ہے جو آپ کے سامنے ہے اور دوسری وہ آیت جس میں بیان ہے ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (ال عمران / ۸۵) یعنی جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والا ہوگا۔ ان دونوں آیتوں میں یہی تطبیق ہے کسی شخص کا کوئی عمل کوئی طریقہ مقبول نہیں تاوقتیکہ وہ شریعت محمدیہ ﷺ کے مطابق نہ ہو مگر یہ اس وقت ہے جب کہ آپ مبعوث ہو کر دنیا میں آ گئے آپ سے پہلے جس نبی کا جو زمانہ تھا اور جو لوگ اس زمانہ میں تھے ان کے لیے ان کے زمانہ کے نبی کی تابعداری اور اس کی شریعت کے مطابق شرط ہے۔

یہود کی معرفت: لفظ یہود ھوادۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی مودۃ اور دوستی کے ہیں یا یہ ماخوذ ہے تہود سے جس کے معنی توبہ کے ہیں جیسے قرآن میں ﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾ (الاعراف / ۱۵۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم اے اللہ تیری طرف توبہ کرتے ہیں پس انہیں ان دونوں وجوہات کی بنا پر یہود کہا گیا ہے توبہ کی وجہ اور آپس میں دوستی کی وجہ سے اور بعض کہتے ہیں یہ 'یہودا' کی اولاد میں سے تھے اس لیے انہیں یہود کہا گیا ہے یہودا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے لڑکے کا نام تھا ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ توراۃ پڑھتے وقت ہلتے تھے اس بنا پر انہیں یہود یعنی حرکت کرنے والا کہا گیا ہے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ آیا تو بنی اسرائیل پر آپ کی نبوت کی تصدیق اور آپ کے فرمان کی اتباع واجب ہوئی تب ان کا نام نصاریٰ ہوا کیونکہ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کی نصرت یعنی تائید اور مدد کی تھی انہیں انصار بھی کہا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے ﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ [1] اللہ کے دین میں میرا مددگار کون ہے؟ حواریوں نے کہا ہم ہیں بعض کہتے ہیں یہ لوگ جہاں اترے تھے اس زمین کا نام ناصرہ تھا اس لیے انہیں نصاریٰ کہا گیا قتادہ اور ابن جریج رحمہ اللہ کا یہی قول ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے واللہ اعلم۔

نصاریٰ "نَصْرَان" کی جمع ہے جیسے نشوان کی جمع نشاویٰ اور سکران کی جمع سکاریٰ اس کا مونث "نَصْرَانَةٌ" آتا ہے اب جبکہ خاتم الانبیاء ﷺ کا زمانہ آیا اور آپ تمام دنیا کی طرف رسول و نبی بنا کر بھیجے گئے تو ان پر بھی اور دوسرے سب پر بھی آپ کی تصدیق و اتباع واجب ہوئی اور آپ کی امت کا نام مومن رکھا گیا ان کے ایمان ویقین کی پختگی کی وجہ سے اور اس لیے بھی کہ ان کا ایمان تمام اگلے انبیاء پر بھی ہے، اور تمام آنے والی باتوں پر بھی۔

صابی کون ہیں؟ صابی کے معنی ایک تو بے دین اور لا مذہب کیے گئے ہیں اور اہل کتاب کے ایک فرقہ کا نام بھی یہ تھا جو

---

[1] [سورۃ آل عمران : آیت ۵۲]

زبور پڑھا کرتے تھے اسی بنا پر ابو حنیفہ اور اسحاق رحمہ اللہ علیہما کا مذہب ہے کہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ ہمارے لیے حلال ہے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا بھی۔ حضرت حسن اور حضرت حکم رحمہ اللہ علیہما فرماتے ہیں یہ گروہ مجوسیوں کے مانند ہے یہ بھی مروی ہے کہ یہ لوگ فرشتوں کے پجاری تھے۔ زیاد نے جب یہ سنا تھا کہ یہ لوگ پانچ وقت نماز قبلہ کی جانب رخ کر کے پڑھا کرتے ہیں تو ارادہ کیا کہ انہیں جزیہ معاف کر دے لیکن ساتھ ہی معلوم ہوا کہ وہ مشرک ہیں تو اپنے ارادہ سے باز رہے۔

ابو الزناد رحمہ اللہ اپنے باپ سے بیان فرماتے ہیں یہ لوگ عراقی ہیں۔ بکوثی کے رہنے والے سب نبیوں علیہم السلام کو مانتے ہیں ہر سال میں تیس روزے رکھتے ہیں اور یمن کی طرف منہ کر کے ہر دن میں پانچ نمازیں پڑھتے ہیں وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ لوگ جانتے ہیں لیکن کسی شریعت کے پابند نہیں اور کفار بھی نہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ بھی ایک مذہب ہے جزیرہ موصل میں یہ لوگ تھے لَآ اِلٰـــهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھتے تھے اور کسی کتاب یا نبی کو نہیں مانتے تھے اور نہ کوئی خاص شرع کے عامل تھے۔

مشرکین اسی بنا پر آنحضور ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو صابی کہتے تھے یعنی ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ کہنے کی بنا پر۔ ان کا دین نصرانیوں سے ملتا جلتا تھا ان کا قبلہ جنوب کی طرف تھا یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت نوح علیہ السلام کے دین پر بتاتے تھے ایک قول یہ بھی ہے کہ یہود مجوس کے دین کا خلط ملط یہ مذہب تھا ان کا ذبیحہ کھانا اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنا ممنوع ہے مجاہد، حسن اور ابن ابی نجیح رحمہم اللہ کا یہی فتویٰ ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ موحد تھے لیکن تاروں کی تاثیر اور نجوم کے معتقد تھے ابو سعید اصطخری رحمہ اللہ نے ان پر کفر کا فتویٰ صادر کیا ہے۔

رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ ستارہ پرست لوگ تھے کشـــــرانیـیـــن میں سے تھے جن کی جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام بھیجے گئے تھے حقیقت حال کا علم تو محض اللہ تعالیٰ کو ہے مگر بظاہر یہی قول اچھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہ یہودی تھے نہ نصرانی نہ مجوسی نہ مشرک بلکہ یہ لوگ فطرت پر تھے کسی خاص مذہب کے پابند نہ تھے اور اسی معنی میں مشرکین اصحاب رسول اللہ ﷺ کو صابی کہا کرتے تھے یعنی ان لوگوں نے تمام مذاہب ترک کر دیئے تھے بعض علماء کا قول ہے کہ صابی وہ ہیں جنہیں کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ واللہ اعلم۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور تم پر طور پہاڑ لا کر کھڑا کر دیا (اور کہا) جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد کرو تاکہ تم بچ سکو ○ لیکن تم اس کے بعد بھی پھر گئے پس اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم نقصان والے ہو جاتے ○

عہد شکن قوم یہودی: ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کے عہد و پیمان یاد دلا رہا ہے کہ میری عبادت اور میرے نبی کی اطاعت کا وعدہ جو میں تم سے لے چکا ہوں اور اس وعدے کو پورا کرانے اور منوانے کے لیے میں نے

طور پہاڑ کو تمہارے سروں پر لا کر کھڑا کر دیا تھا جیسے اور جگہ ہے ﴿وَاِذۡ نَتَقۡنَا الۡجَبَلَ فَوۡقَهُمۡ﴾ (اعراف / ۱۷۱) الخ جب ہم نے ان کے سروں پر سائبان کی طرح پہاڑ لا کر کھڑا کیا' اور وہ یقین کر چکے کہ اب پہاڑ ان پر گر کر انہیں کچل ڈالے گا اس وقت ہم نے کہا ہماری دی ہوئی چیز کو مضبوط تھامو اور اس میں جو کچھ ہے اسے یاد کرو تو بچ جاؤ گے ''طور'' سے مراد پہاڑ ہے جیسے سورۂ اعراف کی آیت میں ہے اور جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نے اس کی تفسیر کی ہے [1] ثابت یہی ہے کہ طور اس پہاڑ کو کہتے ہیں جس پر سبزہ اگتا ہو۔ [2] حدیث فتون میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما مروی ہے کہ جب انہوں نے اطاعت سے انکار کیا اس وقت یہ پہاڑ ان کے سروں پر لا کر کھڑا کیا گیا کہ اب تو احکامات سنیں۔ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کے سجدے سے انکار کرنے کے باعث ان کے سر پر پہاڑ آ گیا لیکن اسی وقت یہ سب سجدے میں گر پڑے اور مارے ڈر کے کنکھیوں سے اوپر کی طرف دیکھتے رہے اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور پہاڑ ہٹا لیا اسی وجہ سے وہ اسی سجدے کو پسند کرتے ہیں کہ آدھا دھڑ سجدے میں ہو اور دوسری طرف سے اونچے دیکھ رہے ہوں۔ جو ہم نے دیا اس سے مراد توراۃ ہے قوت سے مراد طاعت ہے یعنی توراۃ پر مضبوطی سے جم کر عمل کرنے کا وعدہ کرو ورنہ پہاڑ تم پر گرا دیا جائے گا اور اس میں جو ہے اسے یاد کرو اور اس پر عمل کرو یعنی توراۃ پڑھتے پڑھاتے رہو۔

لیکن ان لوگوں نے اتنے پختہ میثاق اتنے اعلیٰ عہد اور اس قدر زبردست وعدے کے بعد بھی کچھ پرواہ نہ کی۔ اور عہد شکنی کی اب اگر اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی اور رحمت نہ ہوتی اگر وہ توبہ قبول نہ فرماتا اور نبیوں کے سلسلہ کو برابر جاری نہ رکھتا تو یقیناً تمہیں زبردست نقصان پہنچتا اس وعدے کو توڑنے کی بنا دنیا اور آخرت میں تم برباد ہو جاتے۔

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ الَّذِيۡنَ اعۡتَدَوۡا مِنۡكُمۡ فِى السَّبۡتِ فَقُلۡنَا لَهُمۡ كُوۡنُوۡا قِرَدَةً خٰسِـِٔيۡنَ ۞ فَجَعَلۡنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهَا وَمَا خَلۡفَهَا وَمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۞

یقیناً تمہیں ان لوگوں کا علم بھی ہے جو تم میں سے ہفتہ کے بارے میں حد سے بڑھ گئے اور ہم نے بھی کہہ دیا کہ تم ذلیل بندر بن جاؤ ○ اسے ہم نے اگلوں پچھلوں کے لئے عبرت کا سبب بنایا اور پرہیزگاروں کے لئے وعظ و نصیحت کا ○

یہود کا بندروں کی صورت میں مسخ ہونے کا سبب: اس واقعہ کا بیان تفصیل کے ساتھ سورۃ اعراف میں ہے جہاں فرمایا ﴿وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ﴾ (الاعراف / ۱۶۳) الخ وہیں اس کی تفسیر بھی پوری بیان ہوگی انشاء اللہ یہ ایلہ بستی کے باشندے تھے ان پر ہفتہ کے دن تعظیم ضروری کی گئی تھی اس دن کا شکار منع کیا گیا تھا اور حکم باری تعالیٰ سے مچھلیاں اسی دن بکثرت آیا کرتی تھیں تو انہوں نے مکاری کی۔ گڑھے کھود لئے۔ رسیاں اور کانٹے ڈال دئے۔ ہفتہ والے دن وہ آ گئیں۔ یہاں پھنس گئیں اتوار کی رات کو جا کر پکڑ لیا۔ اس جرم پر اللہ نے ان کی شکلیں بدل دیں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں صورتیں نہیں بدلی تھیں بلکہ دل مسخ ہو گئے تھے یہ صرف بطور مثال کے ہے جیسے عمل نہ کرنے والے علماء کو گدھوں سے مثال دی ہے [3] لیکن یہ قول غریب ہے اور عبارت قرآن کے ظاہر

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۲۰۳)] [2] [ایضا] [3] [سورۃ الجمعۃ : آیت ۵]

الفاظ کے بھی خلاف ہے اس آیت پر پھر سورۂ اعراف کی آیت ﴿وَسْئَلْهُمْ﴾ الخ پر اور ﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ﴾ (مائدہ ٦٠) الخ پر نظر ڈالو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جوان لوگ بندر بن گئے اور بوڑھے سور بن گئے۔ (١) حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ تمام مرد اور عورتیں دم والے بندر بنا دیئے گئے (٢) آسمانی آواز آئی کہ تم سب بندر بن جاؤ چنانچہ سب کے سب بندر بن گئے جو لوگ انہیں اس مکر وحیلہ سے روکتے تھے وہ اب آئے اور کہنے لگے دیکھو ہم پہلے سے تمہیں منع کرتے تھے؟ تو وہ سر ہلاتے تھے یعنی ہاں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں تھوڑی مدت میں وہ سب ہلاک ہو گئے ان کی نسل نہیں ہوئی (٣) تین دن سے زیادہ کوئی مسخ شدہ قوم زندہ نہیں رہتی یہ سب بھی تین دن میں ہی یونہی ناک رگڑتے رگڑتے مر گئے کھانا پینا اور نسل سب منقطع ہو گئی یہ بندر جو اب ہیں اس وقت بھی تھے یہ جانور ہیں جو اسی طرح پیدا کئے گئے تھے اللہ تعالیٰ جو چاہے اور جس طرح چاہے پیدا کرتا ہے اور جس طرح کا چاہے بنا دیتا ہے (٤) (اللہ اپنے غضب وغصہ سے اور اپنی پکڑ دھکڑ سے اور اپنے دنیوی اور آخروی عذاب سے نجات دے آمین) ﴿خَاسِئِيْنَ﴾ کے معنی ذلیل اور کمینہ۔ ان کا واقعہ تفصیل کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے جو بیان کیا ہے وہ سب سن لیجئے۔ ان پر جمعہ کی عزت وادب کو فرض کیا گیا لیکن انہوں نے جمعہ کے دن کو پسند نہ کیا اور ہفتہ کا دن رکھا اس دن کی عظمت کے طور پر ان پر شکار کھیلنا وغیرہ اس دن حرام کر دیا گیا۔ ادھر اللہ کی آزمائش کی بنا پر ہفتہ والے دن تمام کی تمام مچھلیاں اوپر آ جایا کرتی تھیں اور کودتی اچھلتی رہتی تھیں لیکن باقی دنوں میں کوئی نظر ہی نہیں آتی تھی۔ ایک مدت تک تو یہ لوگ خاموش رہے اور شکار کرنے سے رکے رہے۔

ازاں بعد ان میں سے ایک شخص نے یہ حیلہ نکالا کہ ہفتہ والے دن مچھلی کو پکڑ لیا اور پھندے میں پھانس کر ڈوری کو کنارے پر کسی چیز سے باندھ دیا تو اروالے دن جا کر نکال لایا اور پکا کر کھائی۔ لوگوں نے خوشبو پا کر پوچھا تو اس نے کہا میں نے آج اتوار کو شکار کیا ہے آخر یہ راز کھلا تو اور لوگوں نے بھی اس حیلہ کو پسند کیا اور اس طرح وہ سب مچھلیوں کا شکار کرنے لگے پھر تو بعض نے دریا کے آس پاس گڑھے کھود لئے ہفتہ والے دن مچھلیاں اس میں آ جاتیں تو اسے بند کر دیتے اور اتوار والے دن پکڑ لاتے کچھ لوگ جو ان میں نیک اور سچے مسلمان تھے وہ انہیں روکتے اور منع کرتے رہے لیکن ان کا جواب یہی ہوتا تھا کہ ہم ہفتہ کو شکار ہی نہیں کھیلتے ہم تو اتوار والے دن پکڑتے ہیں ان شکار کھیلنے والوں اور ان منع کرنے والوں کے سوا ایک گروہ ان میں اور بھی تھا جو مصلحت بروقت برتنے والا اور دونوں فرقوں کو راضی رکھنے والا وہ تو پورا ساتھ دیتا تھا۔ ان کا نہ شکار کھیلتے تھے نہ شکاریوں کو روکتے تھے بلکہ روکنے والوں سے کہتے کہ اس قوم کو کیوں وعظ ونصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرے گا یا سخت عذاب کرے گا اور تم اپنا فرض بھی ادا کر چکے انہیں منع کر چکے جب نہیں مانتے تو اب انہیں چھوڑو۔ یہ جواب دیتے کہ ایک اللہ کے ہاں ہم معذور ہو جائیں اس لئے اور دوسرے اس لئے بھی کہ شاید آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں یہ مان جائیں اور عذاب اللہ سے نجات پائیں۔

---

(١) [تفسیر ابن ابی حاتم (١/٢١٠)]
(٢) [تفسیر ابن ابی حاتم (١/٢٠٩)]
(٣) [تفسیر ابن ابی حاتم (١/٢٠٩)]
(٤) [تفسیر ابن جریر الطبری (٢/١٦٧)]

بالآخر اس مسلم جماعت نے اس حیلہ جو فرقہ کا بالکل بائیکاٹ کر دیا اور ان سے بالکل الگ ہو گئے بستی کے درمیان ایک دیوار کھینچ لی اور دروازہ اپنے آنے جانے کا رکھا اور ایک دروازہ ان حیلہ جو نافرمانوں کے لئے اس پر بھی ایک مدت اسی طرح گذر گئی ایک صبح مسلمان جاگے دن چڑھ گیا لیکن اب تک ان لوگوں نے دروازہ نہیں کھولا تھا اور نہ ان کی آوازیں آ رہی تھیں یہ لوگ متحیر تھے کہ آج کیا بات ہے؟ آخر جب زیادہ دیر لگ گئی تو ان لوگوں نے دیوار پر چڑھ کر دیکھا تو وہاں عجب منظر نظر آیا دیکھا کہ وہ تمام لوگ مع عورتوں بچوں کے بندر بن گئے ہیں ان کے گھر جو راتوں کو بند تھے اسی طرح بند ہیں اور اندر وہ کل انسان بندر کی صورتوں میں ہیں جن کی دمیں نکلی ہوئی ہیں بچے چھوٹے بندروں کی شکل میں مرد بڑے بندروں کی صورت میں عورتیں بندریاں بنی ہوئی ہیں اور ہر ایک پہچانا جاتا ہے کہ یہ فلاں مرد ہے یہ فلاں عورت ہے یہ فلاں بچہ ہے وغیرہ یہ بھی یاد رہے کہ جب عتاب آیا تو نہ صرف وہی ہلاک ہوئے جو شکار کھیلتے تھے بلکہ ان کے ساتھ وہ بھی ہلاک ہوئے جو انہیں منع نہ کرتے تھے اور خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور میل جول ترک نہ کیا تھا صرف وہی بچے جو انہیں منع کرتے رہے اور ان سے الگ تھلگ ہو گئے تھے یہ تمام اقوال اور قرآن کریم کی کئی ایک آیتیں وغیرہ شاہد ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ ان کی صورتیں بدل دی گئی تھیں سچ مچ کے بندر بنا دئے گئے نہ یہ کہ معنوی مسخ تھا یعنی ان کے دل بندروں جیسے ہو گئے تھے جیسے کہ مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں سور اور بندر بنا دیا تھا اور ظاہری صورتیں بھی ان بد جانوروں جیسی ہو گئیں۔ واللہ اعلم۔

﴿فَجَعَلْنَاهَا﴾ میں "ھا" کی ضمیر کا مرجع ﴿قِرَدَةً﴾ ہے یعنی ہم نے ان بندروں کو سبب عبرت بنایا اس کا مرجع ﴿حِيتَانَ﴾ ہے یعنی ان مچھلیوں کو یا اس کا مرجع ﴿عُقُوبَة﴾ ہے یعنی اس سزا کو اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا مرجع ﴿قَرْيَه﴾ ہے یعنی اس بستی کو ہم نے اگلے پچھلوں کے لئے عبرتناک امر واقعہ بنا دیا اور صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ قریہ مراد ہے اور قریہ سے مراد اہل قریہ ہیں۔

﴿نَكَالَ﴾ کہتے ہیں عذاب و سزا کو جیسے اور جگہ ہے: ﴿فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى﴾ (النزعات/ ۲۵) اس کو عبرت کا سبب بنایا آگے پیچھے والی بستیوں کے لئے۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى﴾ (الاحقاف/ ۲۷) الخ ہم نے تمہارے آس پاس کی بستیوں کو ہلاک کیا اور اپنی نشانیاں بیان فرمائیں تاکہ وہ لوگ لوٹ آئیں اور ارشاد ہے ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ﴾ (الرعد/ ۴۱) الخ اور یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ اس وقت کے موجود لوگوں کے لیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے یہ عبرتناک واقعہ دلیل راہ بن جائے گو بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگلوں بعد میں آنے والوں کے لیے یہ واقعہ گو کتنا ہی زبردست عبرتناک ہو دلیل نہیں بن سکتا اس لیے کہ وہ تو گذر چکے تو ٹھیک قول یہی ہے کہ یہاں مراد مکان اور جگہ ہے یعنی آس پاس کی بستیاں اور یہی تفسیر ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی۔ واللہ اعلم۔ اور یہ بھی معنی بیان کیے گئے ہیں کہ ان کے اگلے گناہ اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کے ایسے ہی گناہوں کے لیے ہم نے اس سزا کو عبرت کا سبب بنایا' لیکن صحیح قول وہی ہے جس کی صحت

ہم نے بیان کی یعنی آس پاس کی بستیاں، قرآن فرماتا ہے ﴿وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ﴾ [1] الخ اور فرمان ہے ﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (الرعد/ ۳۱) الخ اور فرمان ہے ﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ﴾ (الانبیاء/ ٤٤) الخ۔

امت محمدیہ کے لیے نصیحت: غرض یہ عذاب ان کے زمانے والوں کے لیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے ایک سبق ہے اور اسی لیے فرمایا ﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ یعنی یہ جو بعد میں آئیں گے ان پرہیزگاروں کے لیے موجب نصیحت ہے۔ یہاں تک کہ امت محمد ﷺ کے لیے بھی کہ یہ لوگ ڈرتے رہیں کہ جو عذاب وسزائیں ان پر ان کے حیلوں کی وجہ سے، ان کے مکر وفریب سے حرام کو حلال کر لینے کے باعث نازل ہوئیں ان کے بعد بھی جو ایسا کریں گے ایسا نہ ہو کہ وہی سزا اور وہی عذاب ان پر بھی آ جائیں۔ ایک صحیح حدیث امام ابوعبداللہ بن بطہ رحمہ اللہ نے وارد کی ہے کہ رسول اللہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَرْتَكِبُوْا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُوْدُ فَتَسْتَحِلُّوْا مَحَارِمَ اللّٰهِ بِاَدْنَى الْحِيَلِ﴾ یعنی تم وہ نہ کرو۔ جو یہودیوں نے کیا حیلے حوالوں سے اللہ کے حرام کو حلال نہ کر لیا کرو یعنی شرعی احکام میں حیلہ جوئی سے بچو۔ [2] یہ حدیث بالکل صحیح ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔ واللہ اعلم۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝

(حضرت) موسیٰ (علیہ السلام) نے جب اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے تو انہوں نے کہا آپ ہم سے مذاق کیوں کرتے ہیں؟ جواب دیا کہ میں ایسا جاہل ہونے سے اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں ○

گائے ذبح کرنے کا واقعہ: اس کا پورا واقعہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بہت مالدار اور تونگر تھا اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی صرف ایک لڑکی تھی اور ایک بھتیجا تھا بھتیجے نے جب دیکھا کہ بڈھا مرتا ہی نہیں تو ورثہ کے لالچ میں اسے خیال آیا کہ میں ہی اسے کیوں نہ مار ڈالوں؟ تاکہ اس کی لڑکی سے نکاح بھی کر لوں اور قتل کی تہمت دوسروں پر رکھ کر دیت بھی وصول کروں اور مقتول کے مال کا مالک بھی بن جاؤں، اس شیطانی خیال میں وہ پختہ ہو گیا اور ایک دن موقعہ پا کر اپنے چچا کو قتل کر ڈالا۔ بنی اسرائیل کے بھلے لوگ ان جھگڑوں بکھیڑوں سے تنگ آ کر یکسو ہو کر ان سے الگ ایک اور شہر میں رہتے تھے شام کو اپنے قلعہ کا پھاٹک بند کر دیا کرتے تھے اور صبح کھولتے تھے کسی مجرم کو اپنے ہاں گھسنے نہیں دیتے تھے، اس بھتیجے نے اپنے چچا کی لاش کو لے جا کر اس قلعہ کے پھاٹک کے سامنے ڈال دیا اور یہاں آ کر اپنے چچا کو ڈھونڈنے لگا پھر ہائے دہائی مچادی کہ میرے چچا کو کسی نے مار ڈالا آخر کار ان قلعہ والوں پر تہمت لگا کر ان سے دیت کا روپیہ طلب کرنے لگا انہوں نے اس قتل سے اور اس علم سے بالکل انکار کیا، لیکن یہ

[1] [سورۃ الاعراف: آیت ۲۷]

[2] [جید: امام ابن قیم رحمہ اللہ اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔ [تھذیب السنن (۵/ ۱۰۳) مجموع الفتاوی (۲۹/ ۲۹)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔ [السلسلة الضعیفة (۱/ ۶۰۸)]

اڑ گیا یہاں تک کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ان سے لڑائی کرنے پر تل گیا یہ لوگ عاجز آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے اور واقعہ عرض کیا کہ یارسول اللہ یہ شخص خواہ مخواہ ہم پر ایک قتل کی تہمت لگا رہا ہے حالانکہ ہم بری الذمہ ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی وہاں سے وحی نازل ہوئی کہ ان سے کہو کہ ایک گائے ذبح کریں انہوں نے کہا اے اللہ کے نبی کہاں قاتل کی تحقیق اور کہاں آپ کا گائے کے ذبح کا حکم دے رہے ہیں؟ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اعوذ باللہ (مسائل شرعیہ کے موقعہ پر) مذاق جاہلوں کا کام ہے اللہ عزوجل کا یہی حکم ہے اب اگر یہ لوگ گائے کو ذبح کر دیتے تو کافی تھا لیکن انہوں نے سوالات کا دروازہ کھولا اور کہا وہ گائے کیسی ہونی چاہیئے؟ اس پر حکم ہوا کہ وہ نہ بہت بڑھیا ہے نہ بچہ ہے جوان عمر کی ہے انہوں نے کہا حضرت ایسی گائیں تو بہت ہیں یہ بیان فرمایئے کہ اس کا رنگ کیا ہے؟ وحی اتری کہ اس کا رنگ بالکل صاف زردی مائل ہے ہر دیکھنے والے کی آنکھوں میں اترتی جاتی ہے پھر کہنے لگے حضرت ایسی گائیں بھی بہت سی ہیں کوئی اور ممتاز وصف بیان فرمایئے وحی نازل ہوئی کہ وہ کبھی ہل بھی نہیں جوتی گئی' کھیتوں کو پانی نہیں پلایا ہر عیب سے پاک ہے یک رنگی ہے کوئی داغ دھبہ نہیں جوں جوں وہ سوالات بڑھاتے گئے حکم میں سختی ہوتی گئی۔ اب ایسی گائے ڈھونڈنے نکلے تو وہ صرف ایک لڑکے کے پاس ملی۔ یہ بچہ اپنے ماں باپ کا نہایت فرمانبردار تھا ایک مرتبہ جبکہ اس کا باپ سویا ہوا تھا اور نقدی والی پیٹی کی کنجی اس کے سرہانے تھی ایک سوداگر ایک قیمتی ہیرا بیچتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ میں اسے بیچنا چاہتا ہوں لڑکے نے کہا میں خریدوں گا قیمت ستر ہزار طے ہوئی لڑکے نے کہا ذرا ٹھہرو جب میرے والد صاحب جاگیں گے تو میں ان سے کنجی لے کر آپ کو قیمت ادا کر دوں گا اس نے کہا ابھی دے دو تو دس ہزار کم کر دیتا ہوں اس نے کہا نہیں حضرت میں اپنے والد کو جگاؤں گا نہیں تم اگر ٹھہر جاؤ تو بجائے ستر ہزار کے اسی ہزار دوں گا یونہی ادھر کمی اور ادھر زیادتی ہونی شروع ہوتی ہے یہاں تک کہ تاجر تیس ہزار قیمت لگا دیتا ہے کہ اگر تم اب جگا کر مجھے روپیہ دے دو تو میں تیس ہزار میں دیتا ہوں لڑکا کہتا ہے اگر تم ٹھہر جاؤ یا ٹھہر کر آؤ میرے والد جاگ جائیں تو میں تمہیں ایک لاکھ دوں گا آخر وہ ناراض ہو کر اپنا ہیرا واپس لے کر چلا گیا باپ کی اس بزرگی کے احساس اور ان کے آرام پہنچانے کی کوشش کرنے اور ان کا ادب واحترام کرنے سے پروردگار اس لڑکے سے خوش ہو جاتا ہے اور اسے یہ گائے عطا فرماتا ہے جب بنی اسرائیل اس قسم کی گائے ڈھونڈنے نکلتے ہیں تو سوا اس لڑکے کے اور کسی کے پاس نہیں پاتے اس سے کہتے ہیں کہ اس ایک گائے کے بدلے دو گائیں لے لو یہ انکار کرتا ہے پھر کہتے ہیں تین لے لو چار لے لو لیکن یہ راضی نہیں ہوتا دس تک کہتے ہیں مگر پھر بھی نہیں مانتا یہ آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کرتے ہیں آپ فرماتے ہیں جو یہ چیز مانگے وہ دو اور اسے راضی کر کے گائے خریدو آخر گائے کے وزن کے برابر سونا دیا گیا تب اس نے اپنی گائے بیچی یہ برکت اللہ نے ماں باپ کی خدمت کی وجہ سے اسے عطا فرمائی جبکہ یہ بہت محتاج تھا اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی بیوہ ماں غربت اور تنگی کے دن بسر کر رہی تھی غرض اب یہ گائے خرید لی گئی اور اسے ذبح کیا گیا' اور اس کے جسم کا ایک ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم سے لگایا گیا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ مردہ جی اٹھا اس سے پوچھا گیا کہ تمہیں کس نے قتل کیا ہے اس نے کہا میرے بھتیجے نے اس لئے کہ وہ میرا مال اور میری لڑکی

سے نکاح کر لے بس اتنا کہہ کر وہ پھر مر گیا اور قاتل کا پتہ چل گیا اور بنی اسرائیل میں جو جنگ وجدال ہونے والی تھی وہ رک گئی اور یہ فتنہ دب گیا اس بھتیجے کو لوگوں نے پکڑ لیا اس کی عیاری اور مکاری کھل گئی اور اسے اس کے بدلے میں قتل کر ڈالا گیا یہ قصہ مختلف الفاظ سے مروی ہے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے ہاں کا واقعہ ہے جس کی تصدیق و تکذیب ہم نہیں کر سکتے ہاں روایت جائز ہے تو اس آیت میں یہی بیان ہو رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل میری نعمت کو بھی نہ بھولو کہ میں عادت کے خلاف بطور معجزے کے ایک گائے کے جسم کو لگانے سے ایک مردہ کو زندہ کر دیا اس مقتول نے اپنے قاتل کا پتہ بتا دیا اور ایک ابھرنے والا فتنہ دب گیا۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ ع

انہوں نے کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے اس کی ماہیت بیان کر دے آپ نے فرمایا سنو وہ گائے نہ تو بالکل بڑھیا ہے نہ بچہ بلکہ درمیانی عمر کی نوجوان ہے پس اب جو تمہیں حکم دیا جاتا ہے بجا لاؤ ○ پھر وہ کہنے لگے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ بیان کرے کہ اس کا رنگ کیا ہے فرمایا وہ کہتا ہے کہ وہ گائے زرد رنگ کی ہے چمکیلا اور دیکھنے والے کو بھلا لگنے والا اس کا رنگ ہے ○ وہ کہنے لگے کہ اپنے رب سے اور دعا کیجئے کہ ہمیں مزید اس کی ماہیت بتلائے اس قسم کی گائیں تو بہت ساری ہیں پتہ نہیں چلتا اگر اللہ نے چاہا تو ہم ہدایت والے ہو جائیں گے ○ آپ نے فرمایا اللہ کا فرمان ہے کہ وہ گائے کام کرنے والی زمین میں ہل جوتنے والی اور کھیتوں کو پانی پلانے والی نہیں وہ تندرست اور بے داغ ہے انہوں نے کہا اب آپ نے حق واضح کر دیا گو وہ حکم برداری کے قریب نہ تھے لیکن اسے مانا اور وہ گائے ذبح کر دی ○

گائے ذبح کرنے میں بنی اسرائیل کے بہانے: بنی اسرائیل کی سرکشی سرتابی اور حکم اللہ امر الٰہی وضاحت کے ساتھ یہاں بیان ہو رہا کہ حکم پاتے ہی اس پر عمل نہ کر ڈالا بلکہ شقیں نکالنے اور بار بار سوال کرنے لگے۔ ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حکم ملتے ہی وہ اگر کسی گائے کو بھی ذبح کر لیتے تو کافی تھا لیکن انہوں نے پے در پے سوالات شروع کئے اور کام میں سختی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آخر میں وہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی سختی نہ ٹلتی اور اظہار ان پر نہ ہوتا [1] پہلے سوال کے جواب میں کہا گیا کہ نہ تو بڑھیا ہے نہ بالکل کم عمر ہے۔ بلکہ درمیانی عمر کی ہے۔ پھر دوسرے سوال کے جواب میں اس کا رنگ بیان کیا گیا کہ وہ زرد اور چمکدار رنگ کی ہے جو

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۱۲۴٦)]

دیکھنے والوں کو بہت پسند آئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جو زرد جوتی پہنے وہ ہر قیمت خوش وخرم رہے گا اور اس جملہ سے استدلال کیا ہے ﴿تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ﴾ بعض نے کہا ہے کہ مراد سخت سیاہ رنگ ہے لیکن اول قول ہی صحیح ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ ہم یوں کہیں کہ اسی کی شوخی اور چمکیلے پن سے وہ مثل کالے رنگ کے لگتا تھا' وہب بن منبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں اس کا رنگ اس قدر شوخ اور گہرا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا گویا سورج کی شعائیں اس سے اٹھ رہی ہیں تورات میں اس کا رنگ سرخ بیان کیا گیا ہے لیکن شاید عربی کرنے والوں کی غلطی ہے واللہ اعلم۔ چونکہ اس رنگ اور اس عمر کی گائیں بھی انہیں بکثرت نظر آئیں تو انہوں نے پھر کہا اے اللہ کے نبی! کوئی اور نشان بھی پوچھئے تا کہ شبہ مٹ جائے انشاء اللہ اب ہمیں رستہ مل جائے گا اگر ان شاء اللہ نہ کہتے تو انہیں قیامت تک پتہ نہ چلتا اور اگر یہ سوالات ہی نہ کرتے تو اتنی سختی ان پر عائد نہ ہوتی بلکہ جس گائے کو ذبح کر دیتے کفایت ہو جاتی یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی ہے [1] لیکن اس کی سند غریب ہے صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اپنا کلام ہے واللہ اعلم۔ اب کی مرتبہ اس کے اوصاف بیان کئے گئے کہ وہ ہل میں جتی نہیں پانی نہیں سینچا' اس کے چمڑے پر کوئی داغ دھبہ نہیں' یک رنگی ہے' سارے بدن میں کہیں دوسرا رنگ نہیں' اس کے ہاتھ پاؤں اور کل اعضاء بالکل درست وتوانا ہیں بعض کہتے ہیں کہ وہ گائے کام کرنے والی نہیں ہاں کھیتی کا کام کرتی ہے لیکن پانی نہیں پلاتی مگر یہ قول غلط ہے اس لئے ﴿ذَلُوْلٌ﴾ کی تفسیر یہ ہے کہ وہ ہل نہیں جوتتی اور نہ پانی پلاتی ہے اس میں نہ کوئی داغ دھبہ ہے اب اتنی بڑی کدوکاوش کے بعد بادل ناخواستہ وہ اس کی قربانی کی طرف متوجہ ہوئے اسی لئے فرمایا کہ یہ ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے اور ذبح نہ کرنے کے بہانے تلاش کرتے تھے کسی نے کہا کہ انہیں اپنی رسوائی کا خیال تھا کہ نہ جانیں کون قاتل ہو بعض کہتے ہیں اس کی قیمت سن کر گھبرا گئے تھے لیکن بعض روایتوں میں آیا ہے کہ کل تین دینار اس کی قیمت لگی تھی لیکن یہ تین دینار والی گائے کے وزن کے برابر سونے والی دونوں روایتیں بنی اسرائیل روایتیں ہیں ٹھیک بات یہ ہے کہ ان کا ارادہ حکم کی بجا آوری کا تھا ہی نہیں لیکن اب اس کی وضاحت کے بعد اور قتل کا مقدمہ ہونے کی وجہ سے انہیں یہ حکم ماننا ہی پڑا۔ واللہ اعلم۔ اس آیت سے اس مسئلہ پر بھی استدلال ہو سکتا ہے کہ جانوروں کو دیکھے بغیر ادھار دینا جائز ہے اس لئے کہ صفات کا حصر کر دیا گیا اور اوصاف پورے بیان کر دئے گئے جیسے امام مالک' امام اوزاعی' امام لیث' امام شافعی' امام احمد' اور جمہور علماء رحمہم اللہ کا مذہب ہے اسلاف اور متاخرین کا بھی اور اس کی دلیل بخاری ومسلم کی یہ حدیث بھی ہے کہ کوئی عورت کسی اور عورت کے اوصاف اس طرح اپنے خاوند کے سامنے بیان نہ کرے گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے [2] ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کے اونٹوں کے

---

[1] [ضعیف: تفسیر ابن ابی حاتم (۷۲۷)، (۲۲۳/۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے کیونکہ اس میں عباد بن منصور راوی ضعیف ہے۔ [مزید دیکھئے: میزان الاعتدال (۳۷۶/۳)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب النکاح: باب لا تباشر المراۃ (۵۲۴۰) ترمذی: کتاب الادب: باب فی کراھیۃ مباشرۃ الرجال الرجال (۲۷۹۲) ابو داؤد: کتاب النکاح: باب فی ما یومر بہ من غض البصر (۲۱۵۰) مسند احمد (۴۴۰/۱)]

اوصاف بھی بیان فرمائے ہیں قتل خطا اور وہ قتل جو مشابہ ''عمد'' کے ہے [1] ہاں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور دوسرے کوفی اور امام ثوری رحمہم اللہ وغیرہ بیع مسلم کے قائل نہیں وہ کہتے ہیں کہ جانوروں کے اوصاف و احوال پوری طرح ضبط نہیں ہوسکتے اسی طرح کی حکایت ابن مسعود، حذیفہ بن یمان، اور عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہم وغیرہ سے بھی کی جاتی ہے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ؁ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ
بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ؁

جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا پھر اس میں اختلاف کرنے لگے اور تمہاری پوشیدگی کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا○ ہم نے کہا اس گائے کے جسم کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر لگاؤ (وہ جی اٹھے گا) اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کر کے تمہیں تمہاری عقلمندی کے لئے اپنی نشانیاں دکھاتا ہے○

صحیح بخاری میں ﴿ فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ﴾ کے معنی تم نے اختلاف کیا ہے کے ہیں۔ [2] حضرت مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ سے بھی یہی مروی ہے [3] مسیّب بن رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جو شخص سات گھروں میں چھپ کر بھی کوئی نیک عمل کرے گا اللہ اس کی نیکی کو ظاہر کر دے گا اسی طرح اگر کوئی سات گھروں میں گھس کر بھی کوئی برائی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے بھی ظاہر کر دے گا پھر یہ آیت تلاوت کی ﴿ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ یہاں وہی واقعہ چچا بھتیجے کا بیان ہو رہا ہے جس کے باعث انہیں ذبیحہ گاؤ کا حکم ہوا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی ٹکڑا لے کر مقتول کے جسم پر لگاؤ وہ ٹکڑا کونسا تھا؟ اس کا بیان تو قرآن میں نہیں ہے نہ کسی صحیح حدیث میں اور نہ ہمیں اس کے معلوم ہونے سے کوئی فائدہ ہے اور معلوم نہ ہونے سے کوئی نقصان ہے سلامت روی اسی میں ہے کہ جس چیز کا بیان نہیں ہم بھی اس کی تلاش و تفتیش میں نہ پڑیں بعض نے کہا ہے وہ غضروف کی ہڈی نرم تھی کوئی کہتا ہے ہڈی نہیں بلکہ ران کا گوشت تھا کوئی کہتا ہے دونوں شانوں کے درمیان کا گوشت تھا کوئی کہتا ہے زبان کا گوشت کوئی کہتا ہے دم کا گوشت وغیرہ لیکن ہماری بہتری اسی میں ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے ہم بھی مبہم ہی رکھیں۔ اس ٹکڑے کے لگتے ہی وہ مردہ جی اٹھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے جھگڑے کا فیصلہ بھی اسی سے کیا اور قیامت کے دن جی اٹھنے کی دلیل بھی اسی کو بنایا۔ اسی سورت میں پانچ جگہ مرنے کے بعد جینے کا بیان ہوا ہے ایک تو آیت ﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ (البقرہ / ۵٦) میں اور دوسرا اس قصے میں، تیسرے ان کے قصے میں جو ہزاروں تعداد میں نکلے تھے اور ایک اجاڑ بستی پر ان کا گذر ہوا تھا چوتھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں کے مار ڈالنے کے بعد

---

[1] [حسن : ابو داؤد : کتاب الدیات : باب دیة الخطا شبه العمد (٤٥٤٧) ابن ماجه : کتاب الدیات : باب دیة شبه العمد مغلظه (٢٦٢٧) نسائی : کتاب القسامة : باب ذکر الاختلاف علی خالد الحذاء (٤٧٩٧)] امام ابن قطان رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ [کما فی الدرایة (١٠٠٧)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحیح ابوداود (٤٥٨٨) صحیح ابن ماجه (٢٦٢٨)]

[2] [صحیح بخاری : کتاب احادیث الانبیاء : باب واذ قال موسیٰ لقومه]

[3] [تفسیر ابن ابی حاتم (٢٩/١)]

زندہ ہو جانے میں یا نچوں زمین کی مردنی کے بعد روئیدگی کو موت وزیست سے تشبیہ دینے میں ۔ ابوداؤد طیالسی کی ایک حدیث میں ہے ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ (ﷺ) مردوں کو اللہ تعالیٰ کس طرح جلائے گا فرمایا کبھی تم بنجر زمین پر گذرے ہو؟ کہا ہاں فرمایا پھر کبھی اس کو سرسبز وشاداب بھی دیکھا ہے؟ کہا ہاں فرمایا اسی طرح موت کے بعد زیست ہے [1] قرآن کریم میں اور جگہ ہے ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ﴾ (یٰسین / ۳۳) الخ یعنی ان منکرین کے لئے مردہ زمین میں ایک نشانی ہے جسے ہم زندہ کرتے ہیں اور اس میں سے دانے نکالتے ہیں جسے یہ کھاتے ہیں اور جس میں ہم کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کرتے ہیں اور چاروں طرف نہروں کی ریل پیل کر دیتے ہیں تا کہ وہ ان پھلوں کو مزے مزے سے کھائیں حالانکہ یہ ان کے ہاتھوں کا بنایا ہوا یا پیدا کیا ہوا نہیں کیا پھر بھی یہ شکر گذاری نہ کریں گے؟ کوئی زخمی شخص اگر کہے کہ فلاں شخص نے مجھے برانگیختگی کے باعث قتل کیا ہے تو اس کا یہ قول ثبوت سمجھا جائے گا۔ اس مسئلہ پر اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اور حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کو اس سے تقویت پہنچائی گئی ہے اس لئے کہ مقتول کے جی اٹھنے کے بعد اس نے دریافت کرنے پر جسے قاتل بتایا اسے قتل کیا گیا اور مقتول کا قول باور کیا گیا ظاہر ہے کہ دم آخر ایسی حالت میں انسان عموماً سچ ہی بولتا ہے اور اس وقت اس پر تہمت نہیں لگائی جاتی ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر پتھر سے کچل ڈالا اور اس کے کپڑے اتار کر لے گیا جب اس کا پتہ نبی ﷺ کو لگا تو آپ نے فرمایا اس لڑکی سے پوچھو کہ اسے کس نے مارا ہے ۔ لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا تجھے فلاں نے مارا فلاں نے مارا؟ وہ سر کے اشارے سے انکار کرتی جاتی تھی یہاں تک کہ جب اسی یہودی کا نام آیا تو اس نے سر کے اشارے سے کہا ہاں چنانچہ اس یہودی کو گرفتار کیا گیا اور باصرار پوچھنے پر اس نے اقرار کیا تو حضور ﷺ نے حکم دیا کہ اس کا سر اسی طرح دو پتھروں کے درمیان کچل دیا جائے [2] اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک جب یہ برانگیختگی کے باعث ہو تو مقتول کے وارثوں کو قسم کھلائی جائے گی بطور "قسامہ" کے لیکن جمہور اس کے مخالف اور مقتول کے قول کو اس بارے میں ثبوت نہیں جانتے ۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ
مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ
وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھر جیسے بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ۔ بعض پتھروں سے تو نہریں بہہ نکلتی ہیں اور بعض پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکل آتا ہے اور بعض اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اعمال سے غافل نہ جانو ○

پتھر دل لوگ: اس آیت میں بنی اسرائیل کو زجر و توبیخ کی گئی ہے کہ اس قدر زبردست معجزے اور قدرت کی نشانیاں

[1] [حسن : مسند طیالسی (۱۰۸۹)] حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے ۔]

[2] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الدیات : باب من اقاد بالحجر (۶۸۷۹) ، (۲۴۱۳) صحیح مسلم : کتاب القسامة : باب ثبوت القصاص فی القتل بالحجر (۱۶۷۲)]

دیکھ کر پھر بھی بہت جلد تمہارے دل سخت پتھر بن گئے۔ اسی لئے ایمان والوں کو اسی طرح کی سختی سے روکا گیا اور کہا گیا۔ ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ (الحدید/١٦) یعنی کیا اب تک وہ وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اللہ کے نازل کردہ حق سے کانپ اٹھیں؟ اور اگلے اہل کتاب کی طرح نہ ہو جائیں جن کے دل لمبا زمانہ گذرنے کے بعد سخت ہو گئے اور ان میں اکثر فاسق ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اس مقتول کے بھتیجے نے اپنے چچا کے دوبارہ زندہ ہونے اور بیان دینے کے بعد جب مر گیا۔ تو اس نے اس کی تکذیب کی اور کہا اس نے جھوٹ کہا [1] اور پھر کچھ وقت گذر جانے کے بعد بنی اسرائیل کے دل پھر پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کیونکہ پتھروں سے تو نہریں نکلتی اور بہنے لگتی ہیں بعض پتھر پھٹ جاتے ہیں ان سے چاہے وہ بہنے کے قائل نہ ہوں بعض پتھر خوف اللہ سے گر پڑتے ہیں لیکن ان کے دل کسی وعظ ونصیحت سے کسی پند وموعظت سے نرم ہی نہیں ہوتے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پتھروں میں ادراک اور سمجھ ہے اور جگہ ہے ﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا﴾ (الاسراء/٤٤) یعنی ساتوں آسمان اور زمینیں اور ان کی تمام مخلوق اور ہر ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔ اللہ تعالیٰ حلم وبردباری والا اور بخشش وعفو والا ہے۔ ابوعلی جبائی نے پتھر کے خوف سے گر پڑنے کی تاویل اولوں کے برسنے سے کی ہے لیکن یہ ٹھیک نہیں رازی رحمہ اللہ بھی غیر درست بتلاتے ہیں اور فی الواقع یہ تاویل صحیح نہیں کیونکہ اس میں لفظی معنی بے دلیل کو چھوڑنا لازم آتا ہے واللہ اعلم۔ نہریں بہہ نکلنا زیادہ رونا ہے۔ پھٹ جانا اور پانی کا نکلنا اس سے کم رونا ہے گر پڑنا دل سے ڈرنا ہے بعض کہتے ہیں یہ مجازاً کہا گیا جیسے اور جگہ ہے ﴿یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ﴾ [2] یعنی دیوار گر پڑنا چاہ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ مجاز ہے۔ حقیقتاً دیوار کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ رازی، قرطبی رحمہما اللہ وغیرہ کہتے ہیں ایسی تاویلوں کی کوئی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ جو صفت جس چیز میں چاہے پیدا کر سکتا ہے۔

دیکھئے اس کا فرمان ہے ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ﴾ (احزاب/٧٢) الخ یعنی ہم نے امانت کو آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں پر پیش کیا انہوں نے اس کے اٹھانے سے مجبوری ظاہر کی اور ڈر گئے اوپر آیت گذر چکی کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہیں اور جگہ ہے ﴿وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ﴾ (الرحمن/٦) یعنی اکاس بیل اور درخت اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں اور فرمایا: ﴿یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ﴾ (النحل/٤٨) الخ اور فرمایا ﴿قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ﴾ (فصلت/١١) زمین وآسمان نے کہا ہم خوشی خوشی حاضر ہیں اور جگہ ہے کہ پہاڑ بھی قرآن سے متاثر ہو کر ڈر کے مارے پھٹ پھٹ جاتے۔ [3] اور جگہ فرمان ہے ﴿وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ﴾

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (٢/٢٣٤)]
[2] [سورہ الکہف: آیت ٧٧]
[3] [سورۃ الحشر: آیت ٢١]

(فصلت/ ۲۱) یعنی گناہ گار لوگ اپنے جسموں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ جواب دیں گے کہ ہم سے اس اللہ نے بات کرائی جو ہر چیز کو بولنے کی طاقت عطا فرماتا ہے ایک صحیح حدیث ہے کہ احد پہاڑ کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ پہاڑ ہم سے بہت محبت رکھتا ہے اور ہم بھی اس سے محبت رکھتے ہیں۔ (۱) ایک اور حدیث میں ہے کہ جس کھجور کے تنے پر ٹیک لگا کر حضور ﷺ جمعہ کا خطبہ پڑھا کرتے تھے جب منبر بنا اور وہ تنا ہٹا دیا گیا تو وہ تنا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ (۲) صحیح مسلم شریف کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں میں مکہ کے اس پتھر کو پہچانتا ہوں جو میری نبوت سے پہلے مجھے سلام کیا کرتا تھا (۳) حجرا سود کے بارے میں ہے کہ جس نے اسے حق کے ساتھ بوسہ دیا ہوگا یہ اس کے ایمان کی گواہی قیامت والے دن دے گا (۴) اور اس طرح کی بہت سی آیات اور حدیثیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں میں ادراک وحس ہے اور یہ تمام باتیں حقیقت پر محمول ہیں نہ کہ مجاز پر۔ آیت میں لفظ ''او'' جو ہے اس کی بابت قرطبی اور رازی رحمہ اللہ تو کہتے ہیں کہ یہ تخییر کے لئے ہے یعنی ان کے دلوں کو خواہ جیسے پتھر جیسے سخت سمجھ لو یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ رازی رحمہ اللہ نے ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ یہ ابہام کے لئے ہے گویا مخاطب کے سامنے باوجود ایک بات کا پختہ علم ہونے کے دو چیزیں بطور ابہام پیش کی جارہی ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ مطلب یہ ہے کہ بعض دل پتھر جیسے اور بعض اس سے زیادہ سخت ہیں۔ واللہ علم۔ اس لفظ کے جو معنی یہاں پر ہیں وہ بھی سن لیجئے اس پر تو اجماع ہے کہ 'او' شک کے لئے نہیں یا تو یہ معنی میں واو کے ہے یعنی اُن کے دل پتھر جیسے اور اس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے جیسے ﴿لَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا﴾ (الدھر/ ۲۴) میں اور ﴿عُذْرًا اَوْ نُذْرًا﴾ (۵) میں شاعروں کے اشعار میں اَوْ واوَ کے معنی میں جمع کے لئے آیا ہے یا 'اَوْ' یہاں پر معنی میں بل یعنی بلکہ کے ہے جیسے ﴿كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً﴾ (النساء/ ۷۷) میں اور ﴿اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ﴾ (الصافات/ ۱۴۷) میں اور ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى﴾ (النجم/ ۹) میں بعض کا قول ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ پتھر جیسے ہیں یا سختی میں تمہارے نزدیک اس سے بھی زیادہ بعض کہتے ہیں صرف مخاطب پر ابہام ڈالا گیا ہے اور یہ شاعروں کے شعروں میں بھی پایا جاتا ہے کہ باوجود پختہ علم ویقین کے صرف مخاطب پر ابہام ڈالنے کے لئے ایسا کلام کرتے ہیں قرآن کریم میں اور جگہ ﴿وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ

---

(۱) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الجهاد: باب فضل الخدمة فی الغزو (۲۸۸۹) صحیح مسلم: کتاب الحج: باب فضل المدینة ودعاء النبی ﷺ فیها بالبرکة (۱۳۶۵)]

(۲) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الجمعة: باب الخطبة علی المنبر (۹۱۸)]

(۳) [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الفضائل: باب فضل نسب النبی ﷺ وتسلیم الحجر علیه قبل النبوة (۲۲۷۷) ترمذی: کتاب المناقب: باب فی آیات اثبات نبوة النبی (۳۶۲۴) مسند احمد (۸۹/۵)]

(۴) [صحیح: ترمذی: کتاب الحج: باب ما جآء فی الحجر الاسود (۹۶۱) ابن ماجه: کتاب المناسك: باب استلام الحجر (۲۹۴۴)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[صحیح الترغیب (۱۱۴۴)]

(۵) [سورة المرسلات: آیت ٦]

﴿مُّبِيۡنٍ﴾ (السبا/ ٢٤) یعنی ہم یا تم صاف ہدایت یا کھلی گمراہی پر ہیں ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا ہدایت پر ہونا اور کفار کا گمراہی پر ہونا یقینی چیز ہے لیکن مخاطب کے ابہام کے لئے اس کے سامنے کلام مبہم بولا گیا۔ یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ تمہارے دل ان دو سے خارج نہیں یا تو وہ پتھر جیسے ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت یعنی بعض ایسے اس قول کے مطابق یہ بھی ہے ﴿كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ [1] الخ پھر فرمایا ﴿اَوْ كَصَيِّبٍ﴾ [2] الخ اور فرمایا ہے ﴿كَسَرَابٍ﴾ الخ پھر فرمایا ﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ﴾ [3] الخ مطلب یہی ہے کہ بعض ایسے اور بعض ایسے۔ واللہ علم۔

تفسیر ابن مردویہ میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اللہ کے ذکر کے سوا زیادہ باتیں نہ کیا کرو کیونکہ کلام کی کثرت دل کو سخت کر دیتی ہے اور سخت دل والا اللہ سے بہت دور ہو جاتا ہے [4] امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو بیان فرمایا ہے اور اس کے ایک طریقہ کو غریب کہا ہے بزار میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ چار چیزیں بدبختی اور شقاوت کی ہیں خوف اللہ سے آنکھوں سے آنسو نہ بہنا۔ دل کا سخت ہو جانا۔ امیدوں کا بڑھ جانا۔ لالچی بن جانا۔ [5]

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ
يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿٧٥﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ
بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٦﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا
يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٧﴾

(مسلمانو!) کیا تمہاری خواہش ہے کہ یہ لوگ ایماندار بن جائیں حالانکہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو کلام اللہ کو سن کر عقل و علم ہوتے ہوئے پھر بھی بدل ڈالا کرتے تھے ○ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو اپنی ایمانداری ظاہر کرتے ہیں اور جب آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کیوں وہ باتیں پہنچاتے ہو جو اللہ نے تمہیں سکھائی ہیں کیا جانتے نہیں کہ یہ تو

---

[1] [سورۃ البقرہ : آیت ١٧] [2] [سورۃ البقرہ : آیت ١٩]

[3] [سورۃ النور : آیت ٣٩۔٤٠]

[4] [ضعیف : ترمذی : کتاب الزھد : (٢٤١١) موطا (٩٨٦/٢)] شیخ البانی ؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[السلسلة الضعیفه (٩٢٠)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ تاہم حافظ زبیر علی زئی نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔]

[5] [ضعیف : بزار فی کشف الاستار (٣٤٣) الکامل لابن عدی (٢٤٨/٣)] حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں موجود ہانی بن متوکل راوی ضعیف ہے۔ امام ہیثمیؒ نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔[مجمع الزوائد (٢٢٦/١٠)] امام ابن حبانؒ نے فرمایا ہے کہ یہ راوی قابل حجت نہیں۔ امام ابن جوزیؒ نے اس روایت کو موضوعات میں ذکر فرمایا ہے۔ [الموضوعات (١٢٥/٣)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[السلسلة الضعیفة (١٥٢٢)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ اس کی سند سخت ضعیف ہے۔]

عبادتیں اوران کے وقت حساب کتاب پر موقوف نہیں قرآن کریم نے اور جگہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا [1] امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس لفظ میں بے پڑھے آدمی کو ماں کی طرف منسوب کیا گیا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ یہاں پر "امی" نہیں کہا گیا ہے جنہوں نے نہ تو کسی رسول کی تصدیق کی تھی نہ کسی کتاب کو مانا تھا اور اپنی لکھی ہوئی کتابوں کو اوروں سے کتاب اللہ کی طرح منوانا چاہتے تھے لیکن اول تو یہ قول محاورات عرب کے خلاف ہے دوسرے اس قول کی سند ٹھیک نہیں۔ اَمَانِیَّ کے معنی باتیں اور اقوال ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے "کذب، آرزو، جھوٹ کے" معنی بھی کیے گئے ہیں [2] تلاوت اور ظاہری الفاظ کے معنی بھی مروی ہیں جیسے قرآن مجید میں اور جگہ ہے ﴿اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى﴾ [3] یہاں تلاوت کے معنی صاف ہیں شعراء کے شعروں میں بھی یہ لفظ تلاوت کے معنی میں ہے اور وہ صرف گمان پر ہی ہیں یعنی حقیقت کو نہیں جانتے اور اس پر ناحق کا گمان کرتے ہیں اور اوٹ پٹانگ باتیں بناتے ہیں۔ پھر یہودیوں کی ایک دوسری قسم کا بیان ہو رہا ہے جو پڑھے لکھے لوگ تھے اور گمراہی کی طرف دوسروں کو بلاتے تھے اور اللہ پر جھوٹ باندھتے تھے اور مریدوں کا مال ہڑپ کرتے تھے۔

﴿وَيْلٌ﴾ کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں اور جہنم کے گڑھے کا نام بھی ہے جس کی آگ اتنی تیز ہے کہ اگر اس میں پہاڑ ڈالے جائیں تو گھل جائیں۔ ابن ابی حاتم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جہنم کی ایک وادی کا نام "وَيْلٌ" ہے جس میں کافر ڈالے جائیں گے چالیس سال کے بعد تلے میں پہنچیں گے [4] اتنی گہرائی ہے لیکن سند کے اعتبار سے یہ حدیث غریب بھی ہے منکر بھی ہے اور ضعیف بھی۔ اور ایک غریب حدیث میں ہے کہ جہنم کے ایک پہاڑ کا نام "وَيْلٌ" ہے یہودیوں نے توراۃ کی تحریف کر دی اس میں کمی یا زیادتی کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نکال ڈالا اس لیے اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا اور بعض توراۃ اٹھا لی گئی اور اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ان کے ہاتھوں کے لکھے اور ان کی کمائی برباد اور ہلاک ہے۔ [5] "وَيْلٌ" کے معنی سخت عذاب برائی، ہلاکت، افسوس، درد، دکھ، رنج و ملال وغیرہ کے بھی آتے ہیں۔ "وَيْلُ، وَيْحُ، وَيْشُ، وَيْهُ، وَيْكَ، وَيْبُ" سب ایک ہی معنی میں ہیں گو بعض نے ان الفاظ کے جدا جدا معنی بھی کیے ہیں لفظ ویل نکرہ ہے اور نکرہ مبتدا نہیں بن سکتا لیکن چونکہ یہ معنی میں بدعا کے ہے اس لیے اسے مبتدا بنا دیا گیا ہے بعض لوگوں نے اسے نصب دینا بھی جائز سمجھا ہے لیکن ویلا کی قرات نہیں یہاں یہودیوں کے علماء کی مذمت ہو رہی ہے کہ وہ اپنی باتوں کو اللہ تعالیٰ کا کلام

---

[1] [سورة الجمعة : آیت ۲] [2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/۲٦۱)]

[3] [سوره الحج : آیت ۵۲]

[4] [ضعیف : سنن ترمذی : کتاب تفسیر القرآن : باب و من سورة الانبیاء علیهم السلام (۳۱٦٤) بغوی (٤٤۰۹) بیهقی فی البعث (٤٦٥ـ٤٨۷) ابن حبان (٦٤٦۷) مستدرك حاكم (۲/۵۰۷) مسند احمد (۳/۷۵) ابو یعلی (۱۳۸۳) الفردوس بماثور الخطاب (۷۱٦٤) عبد بن حمید فی المنتخب (۹۲٤) الدر المنثور للسیوطی (۱/۱۵۹)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف ترمذی (۷۱٦) ضعیف الترغیب (۲۱۳٦) ضعیف الجامع الصغیر (٦۱٤٨)] مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

[5] [ضعیف : تفسیر ابن جریر الطبری (۱۳۸۹، ۱۳۹۸)، (۲/۲٦٨)]

کہتے تھے اور اپنے والوں کو خوش کر کے دنیا کماتے تھے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تم اہل کتاب سے کچھ بھی کیوں پوچھو؟ اللہ تعالیٰ کی تازہ کتاب تمہارے ہاتھوں میں ہے اہل کتاب نے تو کتاب اللہ میں تحریف کی اپنی ہاتھ کی لکھی ہوئی باتوں کو اللہ عزوجل کی طرف منسوب کر دیا اس کی تشہیر کی پھر تمہیں اپنی محفوظ کتاب کو چھوڑ کر ان کی تبدیل کردہ کتاب کی کیا ضرورت؟ افسوس کہ وہ تم سے نہ پوچھیں اور تم ان سے دریافت کرتے پھرو۔ (۱) تھوڑے مول سے مراد بہ نسبت آخرت کے کمی ہے تو گویا ساری دنیا مل جائے لیکن جنت کے مقابلہ میں وہ بے حد حقیر چیز ہے۔ پھر فرمایا کہ ان کے اس فعل کی وجہ سے کہ وہ اپنی باتوں کو اللہ رب العزت کی باتوں کی طرح لوگوں سے منواتے ہیں اور اس پر دنیا کماتے ہیں ہلاکت اور بربادی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف چند روز آگ میں رہیں گے ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا کوئی پروانہ ہے؟ اگر ہے تو یقیناً اللہ اپنے وعدے کا خلاف نہیں کرے گا (ہرگز نہیں) بلکہ تم تو بے علمی سے اللہ تعالیٰ کے ذمہ باتیں گھڑ لیا کرتے ہو ○

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہودی لوگ کہا کرتے تھے کہ دنیا کی کل مدت سات ہزار سال ہے۔ ہر سال کے بدلے ایک دن ہمیں عذاب ہوگا تو صرف سات دن ہمیں جہنم میں رہنا پڑے گا اس قول کی تردید میں یہ آیتیں نازل ہوئیں، بعض کہتے ہیں کہ یہ لوگ چالیس دن تک آگ میں رہنا مانتے تھے (۲) کیونکہ ان کے بڑوں نے چالیس دن تک بچھڑے کی پوجا کی تھی بعض کا قول ہے کہ یہ دھوکہ انہیں اس سے لگا تھا کہ وہ کہتے تھے کہ توراۃ میں ہے کہ جہنم کے دونوں طرف زقوم کے درخت تک چالیس سال کا راستہ ہے تو وہ کہتے تھے کہ اس مدت کے بعد عذاب اٹھ جائیں گے ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ کر کہا کہ چالیس دن تک تو ہم جہنم میں رہیں گے پھر دوسرے لوگ ہماری جگہ آ جائیں گے یعنی آپ کی امت آپ نے ان کے سروں پر ہاتھ رکھ کر فرمایا نہیں بلکہ تم ہی ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں پڑے رہو گے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں فتح خیبر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور ہدیہ بکری کا پکا ہوا زہر آلود گوشت آیا آپ نے فرمایا۔ یہاں کے یہودیوں کو جمع کر لو پھر ان سے پوچھا تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے کہا فلاں آپ نے فرمایا جھوٹے ہو بلکہ تمہارا باپ فلاں ہے انہوں نے کہا بجا ارشاد ہوا وہی ہمارا باپ ہے۔ آپ نے فرمایا دیکھو اب میں کچھ اور پوچھتا ہوں سچ سچ بتانا انہوں نے کہا اے ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جھوٹ کہیں گے تو آپ کے سامنے نہ چل سکے گا ہم تو آزما چکے آپ نے فرمایا بتاؤ جہنمی کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا کچھ دن تو ہم

(۱) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الشھادات: باب لا یسال اھل الشرك عن الشھادۃ و غیرھا (۲۶۸۵)]

(۲) [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/۲۷۶)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو سخت ضعیف کہا ہے۔]

(۳) [ضعیف و مرسل: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۴۰۹، ۱۴۱۰) تفسیر عبد الرزاق (۱/۵۱)]

ہیں پھر آپ کی امت آپ نے فرمایا غلو ہرگز نہیں۔ پھر فرمایا اچھا بتلاؤ اس گوشت میں تم نے زہر ملایا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں حضور ﷺ اگر آپ سچے ہیں تو یہ زہر آپ کو ہرگز ضرر نہ دے گا اور اگر جھوٹے ہیں تو ہم آپ سے نجات حاصل کر لیں گے۔ (مسند احمد، بخاری، نسائی) [1]

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

یقیناً جو بھی برے کام کرے اور اس کی نافرمانیاں اسے گھیر لیں وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی ہے ○ اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک کام کریں وہ جنتی ہیں جو جنت میں ہمیشہ رہیں گے ○

جہنم میں جانے والے: مطلب یہ ہے کہ جس کے اعمال سراسر بد ہیں جو نیکیوں سے خالی ہاتھ ہے وہ جہنمی ہے اور جو شخص اللہ، رسول ﷺ پر ایمان لائے اور سنت کے مطابق عمل کرے وہ جنتی ہے۔ جیسے ایک جگہ فرمایا ﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ﴾ (النساء/۱۲۳) الخ یعنی نہ تو تمہارے منصوبے چل سکیں گے اور نہ اہل کتاب کے ہر برائی کرنے والا اپنی برائی کا بدلہ دیا جائے گا اور ہر بھلائی کرنے والا اپنی نیکوکاری کا اجر پائے گا مگر برے کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ کسی مرد کا، عورت کا، بھلے آدمی کا کوئی عمل برباد نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہاں برائی سے مطلب کفر ہے اور ایک روایت میں ہے کہ مراد شرک ہے۔ [2] ابو وائل، ابو العالیہ، مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ، ربیع بن انس رحمہم اللہ وغیرہ سے یہی مروی ہے۔ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں مراد کبیرہ گناہ ہیں جو تہ بہ تہ ہو کر دل کو گندہ کر دیں۔ [3] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہ فرماتے ہیں مراد شرک ہے جس کے دل پر بھی قابض ہو جائے ربیع بن خثیم رحمہ اللہ کا قول ہے جو گناہوں پر ہی مرے اور توبہ نصیب نہ ہو۔ مسند احمد میں حدیث ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں گناہوں کو حقیر نہ سمجھا کرو وہ جمع ہو کر انسان کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں دیکھتے نہیں ہو کہ اگر کوئی آدمی ایک ایک لکڑی لے کر آئیں تو انبار لگ جاتا ہے پھر اگر اس میں آگ لگائی جائے تو بڑی بڑی چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے [4] پھر

---

[1] [**صحیح:** صحیح بخاری: کتاب الجزیۃ: باب اذا غدر المشرکون بالمسلمین (۳۱۶۹) مسند احمد (۴۵۱/۲) نسائی فی السنن الکبریٰ (۱۱۳۵۵)]

[2] [**ضعیف:** تفسیر ابن ابی حاتم (۲۵۲/۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔]

[3] [تفسیر ابن ابی حاتم (۲۵۳/۱)]

[4] [**صحیح لغیرہ:** مسند احمد (۴۰۲/۱-۴۰۳) مجمع الزوائد (۱۸۹/۱۰) طبرانی فی الکبیر (۱۶۵/۶) وفی الصغیر (۳۲۷/۲) وفی الاوسط کما فی مجمع البحرین (۲۶۱/۸)] حافظ عراقی نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔[تخریج الاحیاء (۴۷۳/۹)] امام ہیثمی نے فرمایا ہے کہ اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں سوائے عمران بن داود کے اور اس کی بھی توثیق کی گئی ہے۔[مجمع الزوائد (۳۰۸/۱۰)] شیخ شعیب ارناؤط نے اس روایت کو حسن لغیرہ قرار دیا ہے۔[مسند احمد محقق (۳۸۱۸)] شیخ البانی نے اسے صحیح لغیرہ کہا ہے۔[صحیح الترغیب (۲۴۷۰) صحیح الجامع الصغیر (۲۶۸۷)] مولانا مبشر احمد ربانی نے اسے حسن کہا ہے۔]

ایمانداروں کا حال بیان فرمایا کہ جو تم جیسا عمل نہیں کرتے بلکہ تمہارے کفر کے مقابلہ میں ان کا ایمان پختہ ہے تمہاری بداعمالیوں کے مقابلہ میں ان کے پاکیزہ اعمال مستحکم ہیں انہیں ابدی راحتیں اور ہمیشہ کی مسکن جنتیں ملیں گی۔ اور اللہ کے عذاب وثواب دونوں لازوال ہیں۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ
ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ بھلا سلوک کرنا اسی طرح قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور لوگوں کو اچھی باتیں کہنا، نمازیں قائم رکھنا اور زکوٰتیں دیتے رہا کرنا۔ لیکن تھوڑے سے لوگوں کے علاوہ تم سب پھر گئے اور منہ موڑ لیا۔

باطل معبودوں سے بچنے کا حکم: بنی اسرائیل کو جو حکم احکام دیئے گئے اور ان سے جن چیزوں پر عہد لیا گیا ان کا ذکر ہو رہا ہے ان کی عہد شکنی کا ذکر ہو رہا ہے انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ توحید کو تسلیم کریں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کریں، یہ حکم نہ صرف بنو اسرائیل کو ہی دیا گیا بلکہ تمام مخلوق کو یہی حکم دیا گیا ہے فرمان ہے ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ (الانبیاء/ ۲۵) یعنی تمام رسولوں کو ہم نے یہی حکم دیا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ قابل عبادت میرے سوا اور کوئی نہیں سب لوگ میری ہی عبادت کریں اور فرمایا۔ ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ (النحل/ ۳۶) یعنی ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ اللہ ہی عبادت کرو اور اس کے سوا دوسرے معبودان باطل سے بچو۔ سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور اسکے تمام حقوق میں بڑا حق یہی ہے کہ اس عبادت کی جائے اور دوسرے کسی کی عبادت نہ کی جائے اب حقوق اللہ کے بعد حقوق العباد کا بیان ہو رہا ہے۔

بندوں کے حقوق میں ماں باپ کا حق چونکہ بہت بڑا ہے اسی لئے ان کا حق بیان کیا گیا ہے ارشاد ہے ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ﴾ (لقمان/ ۱۴) میرا شکر کرو اور اپنے ماں باپ کا بھی احسان مان اور جگہ فرمایا: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ ﴾ (الاسراء/ ۲۳) الخ تیرے رب کا فیصلہ ہے کہ اس کے سوا دوسرے کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان اور سلوک کرتے رہو۔ بخاری ومسلم میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ! کونسا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا نماز کو وقت پر ادا کرنا پوچھا اس کے بعد آپ نے فرمایا ماں باپ کے ساتھ سلوک واحسان کرنا پوچھا پھر کونسا؟ پھر اللہ کی راہ میں جہاد کرنا [1] ایک اور صحیح حدیث میں ہے

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب مواقیت الصلوۃ: باب فضل الصلوۃ لوقتها (۵۲۷) صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب کون الایمان باللہ تعالی افضل الاعمال (۸۵) ترمذی: کتاب الصلوۃ: باب ما جاء فی الوقت الاول من الفضل (۱۷۳) مسند احمد (۱/ ۴۵۱) نسائی (۶۱۱)]

کسی نے پوچھا حضور ﷺ میں کس کے ساتھ اچھا سلوک اور بھلائی کروں؟ آپ نے فرمایا اپنی ماں کے ساتھ' پوچھا پھر کس کے ساتھ؟ فرمایا اپنی ماں کے ساتھ' پھر پوچھا کس کے ساتھ؟ فرمایا: اپنے باپ کے ساتھ اور پھر قریب والے کے ساتھ اور پھر قریب والے کے ساتھ۔ (۱)

آیت میں ﴿لَا تَعْبُدُوْنَ﴾ فرمایا اس لیے کہ اس میں بہ نسبت ﴿لَا تَعْبُدُوْا﴾ کے مبالغہ زیادہ ہے "طلب" یہ خبر معنی میں ہے بعض لوگوں نے "اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا" بھی پڑھا ہے ابی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ وہ "لَا تَعْبُدُوْا" پڑھتے تھے یتیم ان چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں جن کا سرپرست باپ نہ ہو۔ مسکین ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش اور دیگر ضروریات پوری طرح مہیا نہ کر سکتے ہوں اس کی مزید تشریح ان شاء اللہ العظیم سورہ نساء کی اس معنی کی آیات میں آئے گی پھر فرمایا لوگوں کو اچھی باتیں کہا کرو۔ یعنی ان کے ساتھ نرم کلامی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ پیش آیا کرو بھلی باتوں کا حکم اور برائی سے روکا کرو۔ حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں بھلائی کا حکم دو۔ برائی سے روکو۔ بردباری' درگذر اور خطاؤں کی معافی کو اپنا شعار بنا لو یہی اچھا خلق ہے جسے اختیار کرنا چاہیے (۲) رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں اچھی چیز کو حقیر نہ سمجھو اگر اور کچھ نہ ہو سکے تو اپنے بھائیوں سے ہنستے ہوئے چہرے سے ملاقات تو کر لیا کرو۔ (مسند احمد) (۳)

پس قرآن کریم نے پہلے اپنی عبادت کا حکم دیا پھر لوگوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا۔ پھر اچھی باتیں کہنے کا۔ پھر بعض اہم چیزوں کا ذکر بھی کر دیا نماز پڑھو زکوٰۃ دو۔ پھر خبر دی کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کی اور عموماً نافرمان بن گئے مگر تھوڑے سے پابند عہد رہے۔ اس امت کو بھی یہی حکم دیا گیا فرمایا ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (النسآء/٣٦) اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ ماں باپ کے ساتھ رشتہ داروں کیساتھ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ' قرابت دار پڑوسیوں کے ساتھ' اجنبی پڑوسیوں کے ساتھ' ہم مشرب مسلک کے ساتھ' مسافروں کے ساتھ' لونڈی غلاموں کے ساتھ' سلوک احسان اور بھلائی کیا کرو' یاد رکھو تکبر اور فخر کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ الحمد للہ کہ یہ امت بہ نسبت اور امتوں کے ان فرمانوں کے ماننے میں اور ان پر عمل پیرا ہونے میں زیادہ مضبوط ثابت ہوئی۔ اسد بن وداعہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ یہودیوں اور نصرانیوں کو سلام کیا کرتے تھے اور یہ دلیل دیتے تھے کہ فرمان باری ہے ﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ (البقرہ/٨٣) لیکن یہ اثر غریب ہے۔ اور حدیث کے خلاف ہے حدیث میں صاف موجود ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ابتداً سلام علیک نہ کیا کرو۔ (۴) واللہ اعلم۔

---

(۱) [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الادب : باب البر والصلة (٥٩٧١) صحیح مسلم : کتاب البر الصلة : باب برالولدين (٢٥٤٨)]

(۲) [تفسير ابن ابی حاتم (١/٢٥٨)]

(۳) [صحیح : صحیح مسلم : كتاب البر و الصلة : باب استحباب طلاقة الوجه عند اللقاء (٢٦٢٦) ترمذی (١٨٣٣) مسند احمد (٥/١٧٣)]

(۴) [صحیح : صحیح مسلم : كتاب السلام : باب النهي عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام (٢١٦٧)]

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ
وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ
دِيَارِهِمْ تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ۚ أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا
جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ
يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٨٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ
يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾ ع

اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا کہ آپس میں قتل نہ کرنا اور آپس والوں کو جلاوطن نہ کرنا تم نے اس کا اقرار کیا اور تم اس کے شاہد بنے ○ لیکن پھر بھی تم نے آپس میں قتل کیا اور آپس کے ایک فرقے کو جلاوطن بھی کیا اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ان کے خلاف دوسروں کی طرفداری کی ہاں قیدی بن کر تمہارے پاس آئے تو تم نے ان کے فدیے دئے لیکن ان کا نکالنا جو تم پر حرام تھا (اس کا کچھ خیال نہ کیا) کیا بعض احکام پر ایمان رکھتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ تم میں سے جو بھی ایسا کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو کہ دنیا میں رسوائی اور قیامت کے دن سخت عذابوں کی مار اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ○ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلے مول لیا ہے ان سے نہ تو عذاب ہلکے ہوں گے اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ○

اوس وخزرج اور دیگر قبائل کو دعوتِ اتحاد: اوس اور خزرج انصار مدینہ کے دو قبیلے تھے اسلام سے پہلے ان دونوں قبیلوں کی آپس میں کبھی بنتی نہ تھی ہمیشہ آپس میں جنگ وجدال رہتا تھا۔ مدینے کے یہودیوں کے بھی تین قبیلے تھے بنوقینقاع، بنونضیر اور بنوقریظہ۔ بنوقینقاع اور بنی نضیر تو خزرج کے طرف دار اور ان کے بھائی بند بنے ہوئے تھے، اور بنی قریظہ کا بھائی چارہ اوس کے ساتھ تھا۔ جب اوس وخزرج میں جنگ ٹھن جاتی تو یہودیوں کے یہ تینوں گروہ بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ان سے مل کر ان کے دشمن سے لڑتے، دونوں طرف کے یہودی یہودیوں کے ہاتھ مارے بھی جاتے اور موقعہ پا کر ایک دوسرے کے گھروں کو بھی اجاڑ دیتے، دیس نکالا بھی دے دیا کرتے تھے اور مال ودولت پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔ جب لڑائی موقوف ہوتی تو مغلوب فریق کے قیدیوں کا فدیہ دے کر چھڑا لیتے اور کہتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ہم میں سے جب کوئی قید ہو جائے تو ہم فدیہ دے کر چھڑا لیں اس پر جناب باری تعالیٰ انہیں فرماتا ہے کہ اس کی کیا وجہ کہ میرے اس ایک حکم کو تو تم نے مان لیا لیکن میں نے کہا تھا کہ آپس میں کسی کو قتل بھی نہ کرو گھروں سے نہ نکلواسے کیوں نہیں مانتے؟ کسی حکم پر ایمان لانا اور کسی کے ساتھ کفر کرنا یہ کہاں کی ایمانداری ہے؟ آیت میں فرمایا کہ اپنے خون نہ بہاؤ اور اپنے آپ کو اپنے گھروں سے نہ نکالو یہ اس لیے

کہ ہم مذہب سارے کے سارے ایک جان کے مانند ہیں۔

حدیث میں بھی ہے کہ تمام ایماندار دوستی، صلہ رحمی اور رحم وکرم میں ایک جسم کے مثل ہیں کسی ایک عضو کے درد سے تمام جسم بیتاب ہو جاتا ہے بخار چڑھ جاتا ہے راتوں کی نیند اچاٹ ہو جاتی ہے [1] اسی طرح ایک ادنیٰ مسلمان کے لیے سارے جہان کے مسلمانوں کو تڑپ اٹھنا چاہیے۔

عبد خیر رحمہ اللہ کہتے ہیں ہم سلمان بن ربیعہ رحمہ اللہ کی ماتحتی میں "بلنجر" میں جہاد کر رہے تھے محاصرہ کے بعد ہم نے اس شہر کو فتح کیا جس میں بہت سے قیدی بھی ملے۔ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک یہودیہ لونڈی کو سات سو میں خریدا۔ راس الجالوت کے پاس جب ہم پہنچے تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور فرمایا یہ لونڈی تیری ہم مذہب ہے میں نے اسے سات سو میں خریدا ہے اب تم اسے مجھ سے خرید لو اور آزاد کر دو اس نے کہا بہت اچھا میں چودہ سو دیتا ہوں آپ نے فرمایا میں تو چار ہزار سے کم نہیں بیچوں گا اس نے کہا پھر میں نہیں خریدتا آپ نے کہا سن یا تو تو اسے خرید ورنہ تیرا دین جاتا رہے گا توراۃ میں لکھا ہوا ہے کہ بنو اسرائیل کا کوئی بھی شخص گرفتار ہو جائے تو اسے خرید کر آزاد کیا کرو۔ اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو فدیہ دے کر چھڑا لیا کرو اور انہیں ان کے گھر سے بے گھر بھی نہ کیا کرو اب یا تو توراۃ کو مان کر اسے خرید یا توراۃ کا منکر ہونے کا اقرار کر۔ وہ سمجھ گیا اور کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم شاید عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہو آپ نے فرمایا ہاں چنانچہ وہ چار ہزار لے آیا آپ نے دو ہزار لے لیے اور دو ہزار لوٹا دیئے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ راس الجالوت کوفہ میں تھا یہ ان لونڈیوں کا فدیہ نہیں دیتا تھا جو عرب سے نہ بچی ہوں اس پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اسے توراۃ کی یہ آیت سنائی غرض آیت میں یہودیوں کی مذمت ہے کہ وہ احکام الٰہیہ کو جانتے ہوئے پھر بھی پس پشت ڈال دیا کرتے تھے امانت داری اور ایمانداری ان سے اٹھ چکی تھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتیں آپ کی نشانیاں آپ کی نبوت کی تصدیق آپ کی جائے پیدائش جائے ہجرت وغیرہ وغیرہ سب چیزیں ان کی کتاب میں موجود تھیں لیکن یہ ان سب کو چھپائے ہوئے تھے اور اتنا ہی نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے تھے اسی باعث ان پر دنیوی رسوائی آئی اور کم نہ ہونے والے اور دائمی آخرت کے عذاب بھی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ
مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى
اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝

ہم نے (حضرت) موسیٰ کو کتاب دی اور ان کے پیچھے اور رسول بھی بھیجے اور ہم نے (حضرت) عیسیٰ بن مریم کو روشن دلیلیں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کرائی لیکن جب کبھی تمہارے پاس رسول وہ چیز لائے جو تمہاری طبیعتوں کے خلاف تھی تو تم نے جھٹ سے تکبر کیا۔ بعض کو تو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل بھی کر ڈالا ○

---

[1] [صحیح: صحيح بخاري: كتاب الادب: باب رحمة الناس و البهائم (٦٠١١) صحيح مسلم: كتاب البر والصلة: باب تراحم المومنين (٢٥٨٦)]

خواہش پرست اسرائیلی: بنی اسرائیل کے عناد وتکبر اوران کی خواہش پرستی کا بیان ہو رہا ہے کہ توراۃ کی تحریف وتبدل کی حضرت موسیٰ کے بعد انہی کی شریعت پر آنے والے انبیاء علیہم السلام کی بھی مخالفت کی چنانچہ فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ﴾ (المائدہ/ ٤٤) الخ یعنی ہم نے توراۃ نازل فرمائی جس میں ہدایت اور نور تھا جس پر انبیاء علیہم السلام خود بھی عمل کرتے اور یہودیوں کو بھی ان کے علماء اور درویش ان پر عمل کرنے کا حکم کرتے تھے۔ غرض پے در پے یکے بعد دیگرے انبیاء کرام علیہم السلام بنی اسرائیل میں آتے رہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہوا انہیں انجیل ملی جس میں بعض احکام توراۃ کے خلاف بھی تھے اسی لیے انہیں نئے نئے معجزات بھی ملے مردوں کو بحکم رب العزت زندہ کر دینا، مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک مار کر بحکم رب العزت اڑا دینا، بیماروں کو اپنے دم جھاڑے سے رب العزت کے حکم سے اچھا کر دینا، بعض بعض غیب کی خبریں رب العزت کے معلوم کرانے سے دینا وغیرہ [1] آپ کی تائید پر روح القدس یعنی حضرت جبرئیل کو لگا دیا۔

لیکن بنی اسرائیل اپنے کفر اور تکبر میں اور بڑھ گئے اور زیادہ حسد کرنے لگے اور ان تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ برے سلوک سے پیش آئے۔ کہیں جھٹلاتے اور کہیں مار ڈالتے تھے محض اس بنا پر کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ان کی طبیعتوں کے خلاف ہوا کرتی تھی ان کی رائے اور ان کے قیاسات اور ان کے بنائے ہوئے اصول واحکام ان کی قبولیت سے ٹکراتے تھے اس لیے دشمنی پر تل جاتے تھے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم محمد بن کعب، اسماعیل بن خالد سدی، ربیع بن انس، عطیہ عوفی اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ کا قول یہی ہے کہ روح القدس سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں [2] جیسے قرآن شریف میں اور جگہ ہے ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ﴾ (الشعراء/ ١٩٣) یعنی اسے لے کر روح امین اترے ہیں۔

صحیح بخاری میں تعلیقاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان رضی اللہ عنہ شاعر کے لیے مسجد میں منبر رکھوایا وہ مشرکین کی ہجو کا جواب دیتے تھے اور آپ ان کے لیے دعا کرتے تھے کہ اے اللہ عزوجل حسان کی مدد روح القدس سے فرما جیسے کہ یہ تیرے نبی کی طرف سے جواب دیتے ہیں۔ [3] بخاری ومسلم کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت حسان رضی اللہ عنہ خلافت فاروقی کے زمانے میں ایک مرتبہ مسجد نبوی میں کچھ اشعار پڑھ رہے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف تیز نگاہیں اٹھائیں تو آپ نے فرمایا میں تو اس وقت بھی ان شعروں کو یہاں پڑھتا تھا جب یہاں تم سے

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (١/ ٢٦٨)]

[2] [تفسیر ابن ابی حاتم (١/ ٢٧٠)]

[3] [صحیح: ابو داؤد: کتاب الادب: باب ما جاء فی الشعر (٥٠١٥) ترمذی: کتاب الادب: باب ما جاء فی انشاد الشعر (٢٨٤٦) مسند احمد (٦/ ٧٢) مستدرك حاکم (٣/ ٤٨٧) طبرانی (٤/ ٣٧)] امام ترمذیؒ نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ امام حاکمؒ نے اسے صحیح الاسناد کہا ہے۔ شیخ شعیب ارناؤط نے اس روایت کو صحیح لغیرہ کہا ہے۔ [مسند احمد محقق (٢٤٤٣٧)] شیخ البانیؒ اسے صحیح کہتے ہیں۔ [السلسلة الصحيحة (١٦٥٧) صحيح الجامع الصغير (١٨٦٥) مختصر الشمائل للألباني (٢١٣)]

بہتر شخص موجود تھے پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تمہیں اللہ کی قسم کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے نہیں سنا؟ کہ اے حسان تو مشرکوں کے اشعار کا جواب دے اے اللہ تعالیٰ تو حسان رضی اللہ عنہ کی تائید روح القدس سے کر۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں اللہ کی قسم میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے۔ (1)

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حسان تم ان مشرکین کی ہجو کرو جبرئیل علیہ السلام بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ (2)

حضرت حسان رضی اللہ عنہ کے شعر میں بھی جبرئیل کو روح القدس کہا گیا ہے ایک اور حدیث میں ہے کہ جب یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کی بابت پوچھا تو آپ نے فرمایا تمہیں اللہ کی قسم اللہ کی نعمتوں کو یاد کر کے کہو کیا خود تمہیں معلوم نہیں کہ وہ جبرئیل علیہ السلام ہیں اور وہی میرے پاس بھی وحی لاتے ہیں ان سب نے کہا بے شک (3) (ابن اسحاق) ابن حبان میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں کہا کہ کوئی شخص اپنی روزی اور زندگی پوری کیے بغیر نہیں مرتا۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور دنیا کمانے میں دین کا خیال رکھو (4) بعض نے روح القدس سے مراد اسم اعظم لیا ہے بعض نے کہا ہے فرشتوں کا ایک سردار فرشتہ ہے۔

بعض کہتے ہیں قدس سے مراد اللہ تعالیٰ اور روح سے مراد جبرئیل ہے کسی نے کہا ہے قدس یعنی برکت، کسی نے کہا ہے پاک، کسی نے کہا ہے روح سے مراد انجیل ہے جیسا فرمایا ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ (الشوری/٥٢) یعنی اسی طرح ہم نے تیری طرف روح کی وحی اپنے حکم سے کی۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا فیصلہ یہی ہے کہ یہاں مراد روح القدس سے حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں جیسے اور جگہ ہے ﴿اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (المائدہ/١١٠) الخ اس آیت میں روح القدس کی تائید کے ذکر کے ساتھ کتاب و حکمت تورات وانجیل کے سکھانے کا بیان ہے معلوم ہوا کہ یہ اور چیز ہے اور وہ اور چیز علاوہ ازیں روانی عبارت بھی اس کی تائید کرتی ہے قدس سے مراد مقدس ہے جیسے "حَاتِمُ جُوْدٌ" اور "رَجُلُ صِدْقٌ" میں روح القدس کہنے میں۔ اور "رُوْحٌ مِّنْهُ" (5) کہنے میں قربت اور بزرگی کی ایک خصوصیت پائی جاتی ہے یہ اس لیے بھی کہا گیا ہے کہ یہ روح مردوں کی پیٹھوں اور حیض والے رحموں سے بے تعلق رہی ہے۔

---

(1) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب بدء الخلق: باب ذکر الملائکۃ صلوات اللہ علیھم (٣٢١٢)، (٦١٥٢) صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابۃ: باب فضائل حسان بن ثابت (٢٤٨٥) ابن حبان (١٦٥٣) بیھقی (١٠/٢٣٧) مسند حمیدی (١١٠٥) مسند احمد (٥/٢٢٢)]

(2) [صحیح: صحیح بخاری (٣٢١٣) مسلم (٢٤٨٥)]

(3) [مرسل وضعیف: تفسیر ابن جریر الطبری (١٤٩٢)]

(4) [صحیح بالشواھد: بغوی فی شرح السنۃ (٤١١١) مسند شھاب (١١٥١) مستدرك حاکم (٢/٤) بزار (١٢٥٣) طبرانی (٧٦٩٤) ابو نعیم (١٠/٢٦) شیخ البانی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ [صحیح الترغیب (١٧٠٢) السلسلۃ الصحیحۃ (٢٨٦٦)]

(5) [سورۃ النسآء: آیت ١٧١]

بعض مفسرین نے اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پاکیزہ روح لی ہے پھر فرمایا کہ ایک فرقے کو تم نے جھٹلایا اور ایک فرقے کو تم قتل کرتے ہو جھٹلانے میں ماضی کا صیغہ لائے لیکن قتل میں مستقبل کا اس لیے کہ ان کا حال آیت کے نزول کے وقت بھی یہی رہا چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے مرض الموت میں فرمایا کہ اس زہر آلود لقمہ کا اثر برابر مجھ پر رہا جو میں نے خیبر میں کھایا تھا اس وقت تو اس نے رگ جان کاٹ دی۔ (1)

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلاف والے ہیں' نہیں نہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں اللہ نے ملعون کر دیا ہے ان کا ایمان بہت ہی تھوڑا ہے ○

غلف کا مفہوم: یہودیوں کا ایک قول یہ بھی تھا کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہیں یعنی یہ علم سے بھرپور ہیں اب ہمیں نئے علم کی کوئی ضرورت نہیں (2) اس لیے جواب ملا کہ یوں نہیں بلکہ لعنت الٰہیہ کی مہر لگ گئی ہے ایمان نصیب ہی نہیں ہوتا ﴿غُلْفٌ﴾ کو "غُلُفٌ" بھی پڑھا گیا ہے یعنی یہ علم کے برتن ہیں اور جگہ قرآن کریم میں ہے ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ﴾ (فصلت/5) الخ یعنی جس چیز کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو اس چیز سے ہمارے دل پردے اور آڑ میں ہیں ان پر مہر لگی ہوئی ہے وہ اسے نہیں سمجھتے اسی بنا پر وہ نہ اس کی طرف مائل ہوتے ہیں نہ اسے یاد رکھتے ہیں ایک حدیث میں بھی ہے کہ بعض دل غلاف والے ہوتے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوتا ہے یہ کفار کے دل ہوتے ہیں (3) سورہ نساء میں بھی ایک آیت اسی معنی کی ہے ﴿وَقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ﴾ (4) الخ تھوڑا ایمان لانے کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ ان میں سے بہت کم لوگ ایماندار ہیں اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ ان کا ایمان بہت کم ہے یعنی قیامت' ثواب' عذاب وغیرہ کے قائل۔ حضرت موسیٰ پر ایمان رکھنے والے توراۃ کو اللہ تعالیٰ کی کتاب مانتے ہیں مگر اس پیغمبر آخر الزمان ﷺ کو مان کر اپنا ایمان پورا نہیں کرتے بلکہ آپ کے ساتھ کفر کر کے اس تھوڑے ایمان کو بھی غارت اور برباد کر دیتے ہیں تیسرے معنی یہ ہیں کہ یہ سرے سے بے ایمان ہیں کیونکہ عربی زبان میں ایسے موقعہ پر بالکل نہ ہونے کی صورت میں بھی ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں مثلاً میں نے اس جیسا بہت ہی کم دیکھا مطلب یہ ہے کہ دیکھا ہی نہیں۔ واللہ اعلم۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝

---

(1) [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب المغازی: باب مرض النبی ﷺ ووفاته (٤٤٢٨) بیهقی (١١/١٠) فیض القدیر (٤٤٨/٥) الکامل لابن عدی (٤٠٣/٣)]

(2) [تفسیر قرطبی (٢٥/٢)]

(3) [**ضعیف**: مسند احمد (١٧/٣-١٨) اس میں لیث بن ابی سلیم راوی ضعیف ہے۔]

(4) [سورۃ النساء: آیت ١٥٥]

ان کے پاس جب اللہ کی کتاب ان کی کتاب کو سچا کرنے والی آئی جس سے پہلے یہ خود اس کے ساتھ کافروں پر فتح چاہتے تھے تو باوجود آ جانے اور باوجود پہچان لینے کے پھر کفر کرنے لگے۔ اللہ کی لعنت ہو ان کافروں پر ○

انکار کا سبب: جب کبھی یہودیوں اور عرب کے مشرکین کے درمیان لڑائی ہوتی تو یہود کہا کرتے تھے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب لے کر اللہ عزوجل کے ایک عظیم الشان پیغمبر ﷺ تشریف لانے والے ہیں ہم ان کے ساتھ مل کر تمہیں ایسا قتل وغارت کریں گے کہ تمہارا نام ونشان مٹ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اے اللہ تو اس نبی ﷺ کو جلد بھیج جس کی صفتیں ہم توراۃ میں پڑھتے ہیں تا کہ ہم ان پر ایمان لا کر ان کے ساتھ مل کر اپنا بازو مضبوط کر کے تیرے دشمنوں سے انتقام لیں۔ مشرکوں سے کہا کرتے تھے کہ اس نبی کا زمانہ اب بالکل قریب آ گیا ہے لیکن جس وقت حضور ﷺ مبعوث ہوئے تمام نشانیاں آپ میں دیکھ لیں۔ پہچان بھی لیا۔ دل سے قائل بھی ہوگئے۔ مگر چونکہ آپ عرب میں سے تھے حسد کیا اور آپ کی نبوت سے انکار کر دیا اور اللہ تعالیٰ کے لعنت یافتہ ہوگئے بلکہ وہ مشرکین مدینہ جو ان سے نبی ﷺ کی آمد کے بارے میں سنتے چلے آتے تھے انہیں تو ایمان نصیب ہوا اور بالآخر حضور ﷺ کے ساتھ مل کر وہ یہود پر غالب آ گئے۔

ایک مرتبہ حضرت معاذ بن جبل، حضرت بشر بن براء، حضرت داود بن سلمہ رضی اللہ عنہم نے ان یہود مدینہ سے کہا بھی کہ تم تو ہمارے شرک کی حالت میں ہم سے حضور ﷺ کی نبوت کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ ہمیں ڈرایا کرتے تھے اور اب جب کہ وہ عام اوصاف جو تم حضرت کے بیان کرتے تھے وہ تمام اوصاف آپ میں ہیں۔ پھر تم خود ایمان کیوں نہیں لاتے؟ آپ کا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ تو سلام بن مشکم نے جواب دیا کہ ہم ان کے بارہ میں نہیں کہتے تھے۔ [1] اسی کا ذکر اس آیت میں ہے کہ پہلے سے مانتے تھے منتظر بھی تھے لیکن آپ ﷺ کے آنے کے بعد حسد اور تکبر سے اپنی ریاست کے کھوئے جانے کے ڈر سے صاف انکار کر بیٹھے۔ [2]

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○

بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا وہ ان کا کفر کرنا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ چیز کے ساتھ محض اس بات سے جل کر کہ اللہ نے اپنا فضل اپنے جس بندہ پر چاہا نازل فرمایا اس باعث یہ لوگ غضب پر غضب کے مستحق ہوگئے اور ان کافروں کے لیے رسوا کرنے والے عذاب ہیں ○

حسد کی قباحت: مطلب یہ ہے کہ ان یہودیوں نے حضور ﷺ کی تصدیق کے بدلے تکذیب کی اور آپ پر ایمان لانے کے بدلے کفر کیا۔ آپ کی نصرت وامداد کے بدلے مخالفت اور دشمنی کی اور اس وجہ سے اپنے آپ کو

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۳۳۳/۲)]
[2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۲۷۶/۱)]

جس غضب الٰہی کا سزاوار بنایا وہ بدترین چیز ہے جو بہترین چیز کے بدلے انہوں نے لی اور اس کی وجہ سوائے حسد وبغض تکبر وعناد کے اور کچھ نہیں چونکہ حضور ﷺ ان کے قبیلہ میں سے نہ تھے بلکہ آپ عرب میں سے تھے اس لیے یہ منہ موڑ کر بیٹھ گئے حالانکہ اللہ پر کوئی حاکم نہیں وہ رسالت کے حق دار کو خوب جانتا ہے وہ اپنا فضل وکرم اپنے جس بندے کو چاہے عطا فرماتا ہے پس ایک تو توراۃ کے احکام کی پابندی نہ کرنے کی وجہ سے ان پر غضب نازل ہوا اب دوسرا حضور ﷺ کے ساتھ کفر کرنے کے سبب نازل ہوا۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ پہلا غضب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر نہ ماننے کی وجہ سے اور دوسرا غضب حضرت محمد ﷺ کو پیغمبر تسلیم نہ کرنے کے سبب۔ [1] سدی کا خیال ہے کہ پہلا غضب بچھڑے کے پوجنے کے سبب تھا دوسرا غضب حضور ﷺ کی مخالفت کی بنا پر۔

چونکہ یہ حسد وبغض کی وجہ سے حضور ﷺ کی نبوت سے منکر ہوئے تھے اور اس حسد بغض کا اصلی باعث ان کا تکبر تھا اس لیے انہیں ذلیل عذابوں میں مبتلا کر دیا گیا تاکہ گناہ کا بدلہ پورا ہو جائے جیسے فرمان ہے ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ﴾ (المومن / ٦٠) میری عبادت سے جو بھی تکبر کریں گے وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں متکبر لوگوں کا حشر قیامت کے دن انسانی صورت میں چیونٹیوں کی طرح ہوگا جنہیں تمام چیزیں روندتی ہوئی چلیں گی اور جہنم کے ''بولس'' نامی قید خانے میں ڈال دیئے جائیں گے جہاں کی آگ دوسری تمام آگوں سے تیز ہوگی اور جہنمیوں کا لہو پیپ وغیرہ انہیں پلایا جائے گا۔ [2]

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا
وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ
قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ
بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٩٢﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لاؤ تو کہہ دیتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی اس پر ہمارا ایمان ہے حالانکہ اس کے بعد والی کے ساتھ جو ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے کفر کرتے ہیں اچھا ان سے یہ تو دریافت کرو کہ اگر تمہارا ایمان پہلی کتابوں پر ہے تو پھر تم نے اگلے انبیاء کو کیوں قتل کیا ○ تمہارے پاس تو موسیٰ یہی دلیلیں لے کر آئے لیکن تم نے پھر بھی بچھڑا پوجا تم ہو ہی ظالم ○

خود پسند یہودی مورد عتاب: یعنی جب ان سے قرآن پر اور نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے کو کہا جاتا ہے تو

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۲۷۸)]

[2] [حسن : ترمذی : کتاب الزھد : باب ما جآء فی شدۃ الوعیہ للمتکبرین (۲۴۹۲) بخاری فی الأدب المفرد (۵۵۷) مسند حمیدی (۵۹۸) ابن ابی الدنیا فی التواضع والخمول (۲۲۳)] شیخ البانی نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحیح الجامع (۸۰۴۰) صحیح الأدب المفرد (۵۵۷) صحیح الترغیب (۲۹۱۱)]

کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں توراۃ انجیل پر ایمان رکھنا کافی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس میں بھی جھوٹے ہیں قرآن تو ان کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور خود ان کی کتابوں میں بھی حضور ﷺ کی تصدیق موجود ہے، جیسے فرمایا ﴿الَّذِيْنَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ﴾ (البقرہ/۱۴۶) یعنی اہل کتاب آپ کو اس طرح جانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں پس آپ سے انکار کا مطلب توراۃ انجیل سے بھی انکار کے مترادف ہے۔ اس حجت کو قائم کر کے اب دوسری طرح حجت قائم کی جاتی ہے کہ اچھا توراۃ اور انجیل پر تو تمہارا ایمان ہے پھر اگلے انبیاء علیہم السلام جو انہی کی تصدیق اور تابعداری کرتے ہوئے بغیر کسی نئی شریعت اور نئی کتاب کے آئے تو تم نے انہیں قتل کیوں کیا؟ معلوم ہوا کہ تمہارا ایمان نہ تو اس کتاب پر ہے نہ اس کتاب پر۔ تم محض خواہش کے بندے نفس کے غلام اپنی رائے قیاس کے ماتحت ہو۔ پھر فرمایا کہ اچھا موسیٰ علیہ السلام سے تو تم نے بڑے بڑے معجزے دیکھے طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک، خون وغیرہ ان کی بددعا سے بطور معجزے ظاہر ہوئے لکڑی کا سانپ بن جانا، ہاتھ کا روشن چاند بن جایا کرنا، دریا کو چیر دینا، بادلوں کا سایہ کرنا، من وسلویٰ کا اتارنا، پتھر سے نہریں جاری کرنا وغیرہ وغیرہ تمام بڑے بڑے معجزات جو ان کی نبوت کی اور اللہ کی توحید کی روشن دلیلیں تھیں سب اپنی آنکھوں سے دیکھیں لیکن ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پہاڑ پر گئے ادھر تم نے بچھڑے کو اللہ بنالیا اب بتاؤ کہ خود توراۃ پر اور خود حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی تمہارا ایمان کہاں رہا؟ کیا یہ بدکاریاں تمہیں ظالم کہلوانے والی نہیں؟ "مِنْ بَعْدِهٖ" سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ہے دوسری جگہ ارشاد ہے: ﴿وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى﴾ (الاعراف/۱۴۸) الخ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد آپ کی قوم نے بچھڑے کو معبود بنالیا اور اپنی جانوں پر اس گوسالہ پرستی سے واضح ظلم کیا جس کا احساس بعد میں خود انہیں بھی ہوا جیسے فرمایا ﴿وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ﴾ (الاعراف/۱۴۹) الخ یعنی جب انہیں ہوش آیا نادم ہوئے اور اپنی گمراہی کو محسوس کرنے لگے اس وقت کہا کہ اے اللہ! اگر تو ہم پر رحم نہ کرے گا اور ہماری خطا نہ بخشے گا تو ہم زیاں کار ہو جائیں گے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۤ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۭ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ؀

جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور تم پر طور کو کھڑا کر دیا (اور کہہ دیا کہ) ہماری دی ہوئی چیز کو مضبوط تھامو اور سنو تو انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور ان کے دلوں میں ان کے کفر کی وجہ سے بچھڑے کی محبت (گویا) پلا دی گئی۔ ان سے کہہ دو کہ تمہارا ایمان تمہیں برا حکم دے رہا ہے اگر تم ایماندار ہو۔

صدائے بازگشت: اللہ تبارک وتعالیٰ بنی اسرائیل کی خطائیں، مخالفتیں، سرکشی اور حق سے روگردانی بیان فرما رہا ہے کہ طور پہاڑ جب سروں پر دیکھا تو اقرار کر لیا جب وہ ہٹ گیا تو پھر منکر ہو گئے۔ اس کی تفسیر پہلے بیان ہو چکی ہے

بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں رچ گئی۔ جیسے کہ حدیث میں ہے کہ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا بہرا بنا دیتی ہے [1] حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلا کر اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا کر دریا میں ڈال دیا تھا جس پانی کو بنی اسرائیل نے پی لیا اور اس کا اثر ان پر ظاہر ہوا گو بچھڑا نیست و نابود کر دیا گیا لیکن ان کے دلوں کا تعلق اب بھی اس معبود باطل سے لگا رہا دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم ایمان کا دعویٰ کس طرح کرتے ہو؟ اپنے ایمان پر نظر نہیں ڈالتے ؟ بار بار کی عہد شکنیاں کئی بار کے کفر بھول گئے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے تم نے کفر کیا ان کے بعد کے پیغمبروں کے ساتھ تم نے سرکشی کی یہاں تک کہ افضل الانبیاء ختم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو بھی نہ مانا جو سب سے بڑا کفر ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ ۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

کہہ دو کہ اگر آخرت کا گھر صرف تمہارے ہی لیے ہے اور کسی کے لیے نہیں تو آؤ اپنی سچائی کے ثبوت میں موت طلب کرو ○ لیکن اپنے کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے کبھی بھی موت نہیں مانگیں گے اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے ○ بلکہ سب سے زیادہ دنیا کی زندگی کا حریص اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تو انہی کو پائے گا یہ حرص زندگی میں مشرکوں سے زیادہ ہیں ان میں سے تو ہر شخص ایک ایک ہزار سال کی عمر چاہتا ہے گو یہ عمر دیا جانا بھی انہیں عذابوں سے نہیں چھڑا سکتا' اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کو بخوبی دیکھ رہا ہے ○

دعوتِ مباہلہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان یہودیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی پیغام دیا گیا کہ اگر تم سچے ہو تو مقابلہ میں آؤ ہم تم مل کر اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو ہم میں سے جھوٹا ہے اسے ہلاک کر دے۔ لیکن ساتھ ہی پیشین گوئی بھی کر دی کہ یہ لوگ ہرگز اس پر آمادہ نہیں ہوں گے چنانچہ یہی ہوا کہ یہ لوگ مقابلہ پر نہ آئے اس لیے کہ وہ دل سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آسمانی کتاب قرآن کریم کو سچا جانتے تھے اگر یہ لوگ اس اعلان کے ماتحت

[1] [ضعیف: ابو داؤد: كتاب الادب باب في الهوى (٥١٣٠) مسند احمد (١٩٤/٥)، (٤٥٠/٦) مسند شهاب قضاعی (٢١٩) مسند شاميين (١٤٥٤) عبد بن حميد (٢٠٥)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[السلسلة الضعيفة (١٨٦٨) ضعيف الجامع الصغير (٢٦٨٨)] ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اسے موضوعات کبیر میں ذکر کیا ہے۔[الاسرار المرفوعة (ص: ١٧٧)] امام سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ روایت ثابت نہیں۔[الدرر المنتثرة (ص: ٩)] حافظ عراقی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔[المغني عن حمل الاسفار (٧٢/٢٠)] ابن طاہر مقدسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں ابوبکر بن ابی مریم راوی ضعیف ہے۔[ذخيرة الحفاظ (٢٦٥٣)] شیخ شعیب ارناؤط نے فرمایا ہے کہ یہ روایت موقوفاً صحیح ہے اور اس مرفوع روایت کی سند ابوبکر بن ابی مریم راوی کے ضعف کی وجہ سے ضعیف ہے۔[مسند احمد محقق (٢١٦٩٤)]

مقابلہ میں نکلتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔ روئے زمین پر ایک یہودی بھی باقی نہ رہتا۔ ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے کہ اگر یہودی مقابلہ پر آتے اور جھوٹے کے لیے موت طلب کرتے تو سب کے سب مر جاتے اور اپنی جگہ جہنم میں دیکھ لیتے اسی طرح جو نصرانی آپ کے پاس آئے تھے وہ بھی اگر مباہلہ کے لیے تیار ہوتے تو وہ لوٹ کر اپنے اہل وعیال اور مال ودولت کا نام ونشان بھی نہ پاتے۔ [1] (مسند احمد)

سورہ جمعہ میں بھی اسی طرح کی دعوت انہیں دی گئی ہے آیت ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا﴾ (الجمعة/٦) آخر تک پڑھیے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ﴿نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ﴾ [2] ہم تو اللہ کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں یہ کہا کرتے تھے ﴿لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى﴾ (البقرة/١١١) جنت میں صرف یہودی اور نصاریٰ ہی جائیں گے اس لیے انہیں کہا گیا کہ آؤ اس کا فیصلہ اس طرح کر لیں کہ دونوں فریق میدان میں نکل کر اللہ سے دعا کریں کہ ہم سے جھوٹے کو ہلاک کر ڈالے لیکن چونکہ اس جماعت کو اپنے جھوٹ کا علم تھا اس لیے تیار نہ ہوئی اور ان کا کذب سب پر کھل گیا اسی طرح جب نجران کے نصرانی حضور ﷺ کے پاس آئے بحث ومباحثہ ہو چکا تو ان سے بھی یہی کہا گیا کہ ﴿تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ﴾ (ال عمران/٦١) الخ آؤ ہم تم دونوں اپنی اپنی اولادوں بیویوں کو لے کر نکلیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ جھوٹوں پر اپنی لعنت نازل فرمائے لیکن وہ آپس میں کہنے لگے ہرگز اس نبی ﷺ سے مباہلہ نہ کرو فوراً برباد ہو جاؤ گے چنانچہ مباہلہ سے انکار کر دیا اور جھک کر صلح کر لی اور دب کر جزیہ دینا منظور کر لیا آپ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ امین بنا کر بھیج دیا۔

اسی طرح مشرکین عرب سے بھی کہا گیا ﴿قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا﴾ (مریم/٧٥) یعنی ہم میں سے جو گمراہ ہو اللہ تعالیٰ اس کی گمراہی بڑھا دے اس کی پوری تفسیر اس آیت کے ساتھ بیان ہو گی ان شاء اللہ تعالیٰ مندرجہ بالا آیت کی تفسیر میں ایک مرجوح قول یہ بھی ہے کہ تم خود اپنی جانوں کے لیے موت طلب کرو کیونکہ بقول تمہارے آخرت کی بھلائیاں صرف تمہارے لیے ہی ہیں انہوں نے اس کا انکار کیا لیکن یہ قول کچھ دل کو نہیں لگتا۔ اس لیے کہ بہت سے اچھے اور نیک آدمی بھی زندگی چاہتے ہیں بلکہ حدیث میں ہے کہ تم میں بہتر وہ ہے جس کی لمبی عمر ہوئی ہو اور اعمال اچھے ہوں [3] علاوہ ازیں یہی قول یہودی بھی کہہ سکتے

---

[1] [صحیح: مسند احمد (١/٢٤٨) مسند بزار (٣/٤١) نسائی فی السنن الکبری (١١٠٦١)، (٦/٣٠٨)] امام ہیثمیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔ شیخ علوی بن عبد القادر سقاف نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ [تخریج أحادیث وآثار کتاب فی ظلال القرآن (ص: ٢٩٨)] شیخ البانیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی سند شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔ [السلسلة الصحیحة (تحت الحدیث / ٣٢٩٦)]

[2] [سورة المائده: آیت ١٨]

[3] [صحیح: ترمذی: کتاب الزهد: باب ما جاء فی طول العمر للمؤمن (٢٣٣٠) مستدرك حاکم (١/٣٣٩) مسند احمد (٥/٤٦) عبد بن حمید (١٠٨٦)] امام ترمذیؒ نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [کما فی السلسلة الضعیفة (تحت الحدیث / ٦٨٩٢)]

تھے تو بات فیصلہ کن نہ ہوتی ٹھیک تفسیر وہی ہے جو پہلے بیان ہوئی کہ دونوں فریق مل کر جھوٹے کی ہلاکت اور اس کی موت کی دعا کریں اور اس اعلان کے سنتے ہی یہود تو ٹھنڈے پڑ گئے اور تمام لوگوں پر ان کا جھوٹ کھل گیا اور وہ پیشین گوئی بھی سچی ثابت ہوئی کہ یہ لوگ ہرگز موت طلب نہیں کریں گے۔

اس مباہلہ کا نام اصطلاح میں "تمنی" رکھا گیا کیونکہ ہر فریق باطل پرست کی موت کی آرزو کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ تو مشرکین سے بھی زیادہ طویل عمر کے خواہاں ہیں کیونکہ کفار کے لیے دنیا جنت ہے اور ان کی تمنا اور کوشش ہے کہ یہاں زیادہ رہیں خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں منافق کو حیات دنیوی کی حرص کافر سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ یہودی تو ایک ایک ہزار سال کی عمریں چاہتے ہیں حالانکہ اتنی لمبی عمر بھی انہیں ان عذابوں سے نجات نہیں دے سکتی چونکہ کفار کو تو آخرت پر یقین ہی نہیں ہوتا مگر انہیں یقین تو تھا لیکن انکی اپنی سیاہ کاریاں بھی ان کے سامنے تھیں۔ اس لیے موت سے بہت زیادہ ڈرتے تھے لیکن ابلیس کے برابر بھی عمر پالیں تو کیا ہوا عذاب سے تو نہیں بچ سکتے [1] اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے بے خبر نہیں تمام بندوں کے تمام بھلے برے اعمال کو وہ بخوبی جانتا ہے اور ویسا ہی بدلہ دے گا۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ
وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) تم کہہ دو کہ جو جبرئیل کا دشمن ہو جس نے تیرے دل میں پیغام باری اتارا ہے جو پیغام ان کے پاس کی کتاب کو سچا بتانے والا اور ایمان والوں کو ہدایت وخوشخبری دینے والا ہے ○ جو شخص اللہ کا اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہو ایسے کافروں کا دشمن خود اللہ ہے ○

جبرئیل علیہ السلام کے دشمن کفر میں مبتلا: امام جعفر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اپنا دشمن اور حضرت میکائیل علیہ السلام کو اپنا دوست بتایا تھا اس وقت ان کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی [2] لیکن بعض کہتے ہیں کہ امر نبوت کے بارے میں جو گفتگو ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تھی اس میں انہوں نے یہ کہا تھا۔ بعض کہتے ہیں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ان کا جو مناظرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں ہوا تھا اس میں انہوں نے یہ کہا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہودیوں کی ایک جماعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ ہم آپ سے چند سوال کرتے ہیں جن کے صحیح جواب نبی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا اگر آپ سچے نبی ہیں تو ان کے جوابات دیجیے آپ نے فرمایا بہتر ہے جو چاہو پوچھو مگر عہد کرو کہ اگر میں ٹھیک ٹھیک جواب دوں گا تو تم میری نبوت کا اقرار کر لو گے اور میری فرمانبرداری کے پابند ہو جاؤ گے انہوں نے آپ سے وعدہ کیا اور عہد دیا۔ اس کے بعد آپ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح اللہ جل شانہ کی شہادت کے ساتھ ان سے پختہ وعدہ لے کر انہیں سوال

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/۳۷٦)] [2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/۳۷۷)]

کرنے کی اجازت دی' انہوں نے کہا پہلے تو یہ بتایئے کہ توراۃ نازل ہونے سے پہلے حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اپنے نفس پر کس چیز کو حرام کیا تھا؟ آپ نے فرمایا جب حضرت یعقوب علیہ السلام عرق النساء کی بیماری میں سخت بیمار ہوئے تو نذر مانی کہ اگر اللہ مجھے اس مرض سے شفا دے گا تو میں اپنے کھانے کی سب سے زیادہ مرغوب چیز اور سب سے زیادہ محبوب چیز پینے کی چھوڑ دوں گا جب تندرست ہو گئے تو اونٹ کا گوشت کھانا اور اونٹنی کا دودھ پینا جو آپ کے پسند خاطر تھا چھوڑ دیا' تمہیں اللہ کی قسم جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توراۃ اتاری بتاؤ یہ سچ ہے؟ ان سب نے قسم کھا کر کہا کہ ہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سچ ہے بجا ارشاد ہوا۔

اچھا اب ہم پوچھتے ہیں کہ عورت مرد کے پانی کی کیا کیفیت ہے؟ اور کیوں کبھی لڑکا پیدا ہوتا ہے اور کبھی لڑکی؟ آپ نے فرمایا سنو مرد کا پانی گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا پانی پتلا اور زردی مائل ہوتا ہے جو بھی غالب آ جائے اسی کے مطابق پیدائش ہوتی ہے اور شبیہ بھی۔ جب مرد کا پانی عورت کے پانی پر غالب آ جائے تو حکم الٰہی سے اولاد نرینہ ہوتی ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی پر غالب آ جائے تو حکم الٰہی سے اولاد لڑکی ہوتی ہے تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں سچ بتاؤ میرا جواب صحیح ہے؟ سب نے قسم کھا کر کہا بیشک آپ نے بجا ارشاد فرمایا آپ نے ان دو باتوں پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنایا۔

انہوں نے کہا اچھا یہ فرمایئے کہ توراۃ میں جس نبی امی کی خبر ہے اس کی خاص نشانی کیا ہے؟ اور اس کے پاس کون سا فرشتہ وحی لے کر آتا ہے؟ آپ نے فرمایا اس کی خاص نشانی یہ ہے کہ اس کی آنکھیں جب سوئی ہوئی ہوں اس وقت میں اس کا دل جاگتا رہتا ہے تمہیں اس رب کی قسم جس نے حضرت موسیٰ کو توراۃ دی بتاؤ تو میں نے ٹھیک جواب دیا؟ سب نے قسم کھا کر کہا آپ نے بالکل صحیح جواب دیا۔ اب ہمارے اس سوال کی دوسری شق کا جواب بھی عنایت فرما دیجیے اسی پر بحث کا خاتمہ ہے۔ آپ نے فرمایا میرا ولی جبرئیل ہے وہی میرے پاس وحی لاتا ہے اور وہی تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے پاس پیغام باری تعالیٰ لاتا رہا۔ سچ کہو اور قسم کھا کر کہو کہ میرا یہ جواب بھی درست ہے؟ انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ جواب تو درست ہے لیکن چونکہ جبرئیل ہمارا دشمن ہے وہ سختی اور خون ریزی وغیرہ لے کر آتا رہتا ہے اس لیے ہم اس کی نہیں مانیں گے نہ آپ کی مانیں گے ہاں اگر آپ کے پاس حضرت میکائیل وحی لے کر آتے جو رحمت' بارش' پیداوار وغیرہ لے کر آتے ہیں اور ہمارے دوست ہیں تو ہم آپ کی تابعداری اور تصدیق کرتے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (1)

بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے یہ بھی سوال کیا تھا کہ رعد کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا وہ ایک فرشتہ ہے جو بادلوں پر مقرر ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق انہیں ادھر ادھر لے جاتا ہے۔ انہوں نے کہا یہ گرج کی آواز کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ اسی فرشتے کی آواز ہے۔ ملاحظہ ہو مسند احمد وغیرہ۔ (2)

---

(1) [حسن: طیالسی (۲۷۳۱) مسند احمد (۱/ ۲۷۳۔ ۲۷۸)] شیخ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ [السلسلة الصحيحة (۱۵۱۶/۷)]

(2) [حسن: مسند احمد (۱/ ۲۷٤) ترمذی: کتاب تفسير القرآن: باب ومن سورة الرعد (۳۱۱۷)] شیخ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ [السلسلة الصحيحه (۱۸۷۲)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے حسن کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے حسن کہتے ہیں۔]

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ جب حضور علیہ السلام مدینہ میں تشریف لائے اس وقت حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں تھے اور یہودیت پر قائم تھے۔ انہوں نے جب آپ کی آمد کی خبر سنی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین باتیں پوچھتا ہوں جن کا جواب نبیوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں یہ فرمایئے کہ قیامت کی پہلی شرط کیا ہے؟ اور جنتیوں کا پہلا کھانا کیا ہے؟ اور کون سی چیز بچہ کو کبھی ماں کی طرف کھینچتی ہے اور کبھی باپ کی طرف‘ آپ نے فرمایا: ان تینوں سوالوں کے جواب ابھی ابھی جبرئیل علیہ السلام نے مجھے بتلائے ہیں سنو‘ حضرت عبداللہ بن سلام نے کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی پھر فرمایا پہلی نشانی قیامت کی ایک آگ ہے جو لوگوں کے پیچھے لگے گی اور انہیں مشرق سے مغرب کی طرف اکٹھا کر دے گی۔ جنتیوں کی پہلی خوراک مچھلی کی کلیجی بطور ضیافت ہوگی۔ مرد کا پانی عورت کے پانی پر سبقت کر جاتا ہے تو لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جب عورت کا پانی مرد کے پانی سے سبقت لے جاتا ہے تو لڑکی ہوتی ہے یہ جواب سنتے ہی حضرت عبداللہ مسلمان ہو گئے اور پکار اٹھے ”اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ“ پھر کہنے لگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہودی بڑے بے وقوف لوگ ہیں۔ اگر انہیں میرا اسلام لانا پہلے معلوم ہو جائے گا تو مجھے برا کہنے لگیں گے آپ پہلے انہیں ذرا قائل معقول تو کیجیے۔

اس کے بعد آپ کے پاس جب یہودی آئے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ عبداللہ بن سلام تم میں کیسے شخص ہیں؟ انہوں نے کہا بڑے بزرگ اور دانشور آدمی ہیں بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں وہ تو ہمارے سردار ہیں‘ اور سرداروں کی اولاد میں سے ہیں آپ نے فرمایا اچھا اگر وہ مسلمان ہو جائیں پھر تو تمہیں اسلام قبول کرنے میں کوئی تامل تو نہیں ہوگا؟ کہنے لگے أَعَاذَهُ اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ اللہ تعالیٰ اسے اس سے بچائے وہ مسلمان ہی کیوں ہونے لگے؟ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جو اب تک چھپے ہوئے تھے باہر آ گئے اور زور سے کلمہ پڑھنے لگے۔ تو تمام کے تمام شور مچانے لگے کہ یہ خود بھی برا ہے اور اس کے باپ دادا بھی برے تھے یہ بڑا نیچے درجہ کا آدمی ہے خاندانی کمینہ ہے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسی چیز کا مجھے ڈر تھا۔ (۱)

صحیح بخاری میں ہے حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ”جِبْرُ‘ مِيْكُ‘ اِسْرَافُ“ کے معنی عَبْدٌ یعنی بندے کے ہیں (۲) اور ایل کے معنی اللہ کے ہیں تو جبرئیل وغیرہ کے معنی عبداللہ ہوئے بعض لوگوں نے اس کے معنی الٹ بھی کیے ہیں وہ کہتے ہیں ایل کے معنی عبد کے ہیں اور ان سے پہلے کے الفاظ اللہ کے نام ہیں‘ جیسے عربی میں عبداللہ‘ عبدالرحمٰن‘ عبدالملک‘ عبدالقدوس‘ عبدالسلام‘ عبدالکافی‘ عبدالجلیل وغیرہ لفظ عبد ہر جگہ باقی رہا اور اللہ کے نام بدلتے رہے اسی طرح ایل ہر جگہ باقی ہے اور اللہ کے اسماء حسنہ بدلتے رہتے ہیں۔ غیر عربی زبان میں مضاف الیہ پہلے آتا ہے اور مضاف بعد میں۔ اسی قاعدے کے مطابق ان ناموں میں بھی ہے جیسے جبرئیل‘ میکائیل‘ اسرافیل‘ عزرائیل وغیرہ۔

اب مفسرین کی دوسری جماعت کی دلیل سنیے جو لکھتے ہیں کہ یہ گفتگو جناب عمر رضی اللہ عنہ سے ہوئی تھی شعبی رحمہ اللہ کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ روحاء میں آئے۔ دیکھا کہ لوگ دوڑ بھاگ کر ایک پتھروں کے تودے کے پاس جا کر نماز

---

(۱) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء: باب خلق آدم وذریته (۳۳۲۹)]

(۲) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب التفسیر سورة البقرة: باب من كان عدوا لجبريل (۴۴۸۰)]

ادا کر رہے ہیں پوچھا کہ یہ کیا بات ہے جواب ملا کہ اس جگہ رسول اللہ ﷺ نے نماز ادا کی ہے' آپ بہت ناراض ہوئے کہ حضور ﷺ کو جہاں کہیں نماز کا وقت آ تا تھا پڑھ لیا کرتے تھے پہلے چلے جایا کرتے تھے اب ان مقامات کو متبرک سمجھ کر خواہ مخواہ وہیں جا کر نماز ادا کرنا کس نے بتایا؟ پھر آپ اور باتوں میں لگ گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں یہودیوں کے مجمع میں کبھی کبھی چلا جایا کرتا تھا اور یہ دیکھتا رہتا تھا کہ کس طرح قرآن توراۃ اور توراۃ قرآن کی سچائی کی تصدیق کرتا ہے یہودی بھی مجھ سے محبت ظاہر کرنے لگے اور اکثر بات چیت ہوا کرتی تھی۔ ایک دن میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا تو راستے سے حضور ﷺ نکلے انہوں نے مجھ سے کہا تمہارے نبی ﷺ وہ جا رہے ہیں۔ میں نے کہا میں ان کے پاس جاتا ہوں لیکن تم یہ تو بتاؤ تمہیں اللہ وحدہ کی قسم اللہ جل شانہ برحق کو مدنظر رکھو اس کی نعمتوں کا خیال کرو۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب تم میں موجود ہے رب کی قسم کھا کر بتاؤ کیا تم حضور ﷺ کو رسول نہیں مانتے؟ اب سب خاموش ہو گئے ان کے بڑے عالم نے جو ان سب میں علم میں بھی کامل تھا اور سب کا سردار بھی تھا اس نے کہا اس شخص نے اتنی سخت قسم دی ہے تم صاف اور سچا جواب کیوں نہیں دیتے؟ انہوں نے کہا حضرت آپ ہی ہمارے بڑے ہیں ذرا آپ ہی جواب دیجیے۔ اس بڑے پادری نے کہا سنیے جناب! آپ نے زبردست قسم دی ہے لہٰذا سچ تو یہی ہے کہ ہم دل سے جانتے ہیں کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔

میں نے کہا افسوس جب یہ جانتے ہو تو پھر مانتے کیوں نہیں کہا صرف اس وجہ سے کہ ان کے پاس آسمانی وحی لے کر آنے والے جبرئیل علیہ السلام ہیں جو نہایت سختی، تنگی، شدت، عذاب اور تکلیف کے فرشتے ہیں ہم ان کے اور وہ ہمارے دشمن ہیں اگر وحی لے کر حضرت میکائیل علیہ السلام آتے جو رحمت و رافت تخفیف و راحت والے فرشتے ہیں تو ہمیں ماننے میں تامل نہ ہوتا۔ میں نے کہا اچھا بتاؤ تو ان دونوں کی اللہ کے نزدیک کیا قدر و منزل ہے؟ انہوں نے کہا ایک تو جناب باری کے داہنے بازو کی طرف ہے اور دوسرا دوسری طرف میں نے کہا اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں جو ان میں سے کسی کا دشمن ہو۔ اس کا اللہ بھی دشمن ہے اور دوسرا فرشتہ بھی کیونکہ جبرئیل کے دشمن سے میکائیل دوستی نہیں رکھ سکتے اور میکائیل کا دشمن جبرئیل کا دوست نہیں ہو سکتا۔ نہ ان میں سے کسی ایک کا دشمن اللہ تبارک و تعالیٰ کا دوست ہو سکتا ہے نہ ان دونوں میں سے کوئی ایک باری تعالیٰ کی اجازت کے بغیر زمین پر آ سکتا ہے نہ کوئی کام کر سکتا ہے۔ واللہ مجھے نہ تم سے لالچ ہے نہ خوف ہے۔ سنو جو شخص اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو اس کے فرشتوں اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہو تو اس کا فر کا اللہ وحدہ لاشریک بھی دشمن ہے اتنا کہہ کر میں چلا آیا۔

حضور ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا اے ابن خطاب مجھ پر تازہ وحی نازل ہوئی ہے میں نے کہا حضور سنائیے۔ آپ نے یہی آیت پڑھ کر سنائی۔ میں نے کہا حضور ﷺ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں یہی باتیں ابھی ابھی یہودیوں سے میری ہو رہی تھیں۔ میں تو چاہتا ہی تھا بلکہ اسی لیے حاضر خدمت ہوا تھا کہ آپ کو اطلاع کروں مگر میرے آنے سے پہلے لطیف و خبیر سننے دیکھنے والے اللہ نے آپ کو خبر پہنچا دی ملاحظہ ہو ابن ابی حاتم وغیرہ مگر یہ روایت منقطع ہے سند متصل نہیں شعبی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ [1]

---

[1] [مرسل: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۶۱۱)، (۳/۳۹۰)]

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام اللہ کے امین فرشتے ہیں اللہ کے حکم سے آپ کے دل میں اللہ کی وحی پہنچانے پر مقرر رہیں۔ وہ فرشتوں میں سے اللہ کے رسول ہیں کسی ایک رسول سے عداوت رکھنے والا سب رسولوں سے عداوت رکھنے والا ہوتا ہے جیسے ایک رسول پر ایمان سب رسولوں پر ایمان لانے کا نام ہے۔ اور ایک رسول کے ساتھ کفر تمام نبیوں کے ساتھ کفر کرنے کے برابر ہے خود اللہ تعالیٰ نے بعض رسولوں کے نہ ماننے والوں کو کافر فرمایا ہے۔ فرماتا ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیُرِیْدُوْنَ﴾ (النساء/ ۱۵۰) الخ یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے دوسری آیت کے آخر تک۔ پس ان آیتوں میں صراحتاً ان لوگوں کو کافر کہا جو کسی ایک رسول کو بھی نہ مانیں۔ اسی طرح جبرئیل علیہ السلام کا دشمن اللہ کا دشمن ہے کیونکہ وہ اپنی مرضی سے نہیں آتے۔ قرآن فرماتا ہے ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ﴾ (مریم/ ٦٤) فرماتا ہے ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِیْلُ﴾ (الشعراء/ ١٩٢۔١٩٤) الخ یعنی ہم اللہ کے حکم کے سوا نہیں اترتے یہ نازل کیا ہوا رب العالمین کا ہے جسے لے کر روح الامین آتے ہیں اور تیرے دل میں ڈالتے ہیں تاکہ تو لوگوں کو ہوشیار کردے۔

صحیح بخاری کی حدیث قدسی میں ہے میرے دوستوں سے دشمنی کرنے والا مجھ سے لڑائی کا اعلان کرنے والا ہے [1] قرآن کریم کی یہ بھی ایک صفت ہے کہ وہ اپنے سے پہلے کے تمام ربانی کلام کی تصدیق کرتا ہے اور ایمانداروں کے دلوں کی ہدایت اور ان کے لیے جنت کی خوشخبری دیتا ہے جیسے فرمایا ﴿هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ﴾ (فصلت/ ٤٤) فرمایا ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الاسراء/ ٨٢) یعنی یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت و شفا ہے رسولوں میں انسانی رسول اور ملکی رسول سب شامل ہیں جیسے فرمایا ﴿اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ (الحج/ ٧٥) اللہ تعالیٰ فرشتوں میں سے اور انسانوں میں سے اپنے رسول چھانٹ لیتا ہے جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام بھی فرشتوں میں سے ہیں لیکن ان کا خصوصاً نام لیا تاکہ مسئلہ بالکل صاف ہو جائے اور یہودی جان لیں کہ ان میں سے ایک کا دشمن دوسرے کا دشمن ہے بلکہ اللہ بھی اس کا دشمن ہے۔

حضرت میکائیل بھی کبھی کبھی انبیاء علیہم السلام کے پاس آتے رہے ہیں جیسے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شروع شروع میں تھے لیکن اس کام پر مقرر حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں جیسے حضرت میکائیل علیہ السلام روئیدگی اور بارش وغیرہ پر اور جیسے اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے پر۔ ایک صحیح حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو جب تہجد کی نماز کے لیے کھڑے ہوتے تب یہ دعا پڑھتے۔ ﴿اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِیْلَ وَمِیْكَآئِیْلَ وَاِسْرَافِیْلَ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَیْنَ عِبَادِكَ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ۔ اِهْدِنِیْ لِمَا اخْتُلِفَ فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ اے اللہ! اے

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الرقاق: باب التواضع (٦٥٠٢) الایمان لابن تیمیة (ص: ١٥٩) صحیح الجامع الصغیر (١٧٨٢) السلسلة الصحیحة (١٦٤٠) مشكاة المصابیح (٢٢٦٦)]

جبرائیل میکائیل اسرافیل علیہم السلام کے رب! اے زمین وآسمان کے پیدا کرنے والے اے ظاہر و باطن کو جاننے والے! اپنے بندوں کے اختلاف کا فیصلہ تو ہی کرتا ہے اے اللہ اختلافی امور میں اپنے حکم سے حق کی طرف میری رہبری کر تو جسے چاہے سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ [1] لفظ جبرئیل وغیرہ کی تحقیق اور اس کے معانی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

حضرت عبدالعزیز بن عمیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں فرشتوں میں حضرت جبرئیل کا نام خادم اللہ ہے۔ ابوسلیمانی دارانی یہ سن کر بہت ہی خوش ہوئے اور فرمانے لگے یہ ایک روایت میری روایتوں کے ایک دفتر سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ جبرئیل اور میکائیل کے لفظ میں بہت سارے لغت ہیں اور مختلف قرات ہیں جن کے بیان کی مناسب جگہ کتب لغت ہیں ہم ان کو بیان کر کے کتاب کے حجم کو بڑھانا نہیں چاہتے کیونکہ کسی معنی کی سمجھ یا کسی حکم کا مفاد ان پر موقوف نہیں۔ اللہ ہماری مدد کرے۔ ہمارا بھروسہ اور توکل اسی کی پاک ذات پر ہے۔

آیت کے خاتمہ میں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ بھی ان لوگوں کا دشمن ہے بلکہ فرمایا اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ اس میں ایسے لوگوں کا حکم بھی معلوم ہو گیا اسے عربی میں مضمر کی جگہ مظہر کہتے ہیں اور کلام عرب میں اکثر اس کی مثالیں شعروں میں بھی پائی جاتی ہیں گویا یوں کہا جاتا ہے کہ جس نے اللہ کے دوست سے دشمنی کی اس نے اللہ سے دشمنی کی اور جو اللہ کا دشمن اللہ بھی اس کا دشمن اور جس کا دشمن خود اللہ قادر مطلق ہو جائے اس کے کفر و بربادی میں کیا شبہ رہ گیا؟ صحیح بخاری کی حدیث پہلے گذر چکی کہ اللہ فرماتا ہے میرے دوستوں سے دشمنی رکھنے والے کو میں اعلان جنگ دیتا ہوں [2] میں اپنے دوستوں کا بدلہ لے لیا کرتا ہوں اور حدیث میں ہے جس کا دشمن میں ہو جاؤں وہ برباد ہو کر ہی رہتا ہے۔ [3]

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى

---

[1] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب صلوۃ المسافرین: باب الدعاء فی صلوۃ اللیل وقیامہ (٧٧٠) ابو داؤد: کتاب الصلوۃ: باب ما یستفتح بہ الصلوۃ من الدعاء (٧٦٧) ترمذی: کتاب الدعوات: باب ما جآء فی الدعاء عند افتتاح الصلوۃ باللیل (٣٤٢٠) ابن ماجہ: کتاب اقامۃ الصلوۃ: باب ما جآء فی الدعاء اذا قام الرجل من اللیل (١٣٥٧) نسائی: کتاب قیام اللیل: باب بای شیئی یستفتح صلاۃ اللیل (١٦٢٦)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الرقاق: باب التواضع (٦٥٠٢)]

[3] [ضعیف: ابن ماجہ: کتاب الرھون: باب اجر الاجراء (٢٤٤٢)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف الجامع الصغیر (٢٥٧٦)]

يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ
وَزَوْجِهِ ۚ وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ
وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ
مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ
مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾ ع

یقیناً ہم نے تیری طرف روشن دلیلیں بھیجی ہیں جن کا انکار سوائے بدکاروں کے کوئی نہیں کرتا ○ یہ لوگ جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کی ایک نہ ایک جماعت اسے توڑ دیتی ہے بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے خالی ہیں ○ جب کبھی ان کے پاس اللہ کا کوئی رسول ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا آیا ان اہل کتاب کے ایک فرقہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے ڈال دیا گویا جانتے ہی نہ تھے ○ اور اس چیز کے پیچھے لگ گئے جسے شیاطین حضرت سلیمان کی حکومت میں پڑھتے تھے۔ سلیمان نے تو یہ کفر نہ کیا تھا بلکہ یہ کفر شیطانوں کا تھا وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں پر جو اتارا گیا تھا۔ وہ دونوں بھی کسی شخص کو اس وقت تک نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیں کہ ہم تو ایک آزمائش ہیں تو کفر نہ کر، پھر لوگ ان سے وہ سیکھتے جس سے مرد و عورت میں جدائی ڈال دیں اور دراصل وہ بغیر اللہ تعالیٰ کی مرضی کے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ یہ لوگ وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان پہنچائے اور نفع نہ پہنچا سکے اور وہ بالیقین جانتے ہیں کہ اس کے لینے والے کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور وہ بدترین چیز ہے جس کے بدلے وہ اپنے آپ کو فروخت کر رہے ہیں کاش کہ یہ جانتے ہوتے ○ اگر یہ لوگ ایمان دار متقی بن جاتے تو اللہ کی طرف سے بہترین ثواب انہیں ملتا اگر یہ جانتے ہوتے۔

سلیمان علیہ السلام اور جادو: یعنی اے محمد ﷺ ہم نے ایسی نشانیاں جو آپ کی نبوت کی صریح دلیل بن سکیں نازل فرما دی ہیں یہودیوں کی مخصوص معلومات کا ذخیرہ ان کی کتاب کی پوشیدہ باتیں' ان کی تحریف و تبدیل احکام وغیرہ سب ہم نے اپنی معجزنما کتاب قرآن کریم میں بیان فرما دیئے ہیں جنہیں سن کر ہر زندہ ضمیر آپ کی نبوت کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ہاں یہ اور بات ہے کہ یہودیوں کو ان کا حسد و بغض روک دے ورنہ ہر شخص جان سکتا ہے کہ ایک امی شخص سے ایسا پاکیزہ خوبیوں والا حکمتوں والا کلام کہا نہیں جا سکتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابن صوریا قطوینی نے حضور ﷺ سے کہا تھا کہ آپ بطور نبوت کوئی ایسی چیز نہیں لائے جس سے ہم پہچان لیں نہ آپ کے پاس کوئی ایسی خاص روشن دلیلیں ہیں اس پر یہ آیت پاک نازل ہوئی چونکہ یہودیوں نے اس بات سے انکار کر دیا تھا کہ ہم سے پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی بابت کوئی عہد لیا گیا ہے اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ تو ان کی عادت ہی ہے کہ عہد کیا اور توڑا بلکہ ان کی اکثریت تو ایمان سے بالکل خالی ہے نبذ کا معنی پھینک دینا ہے چونکہ ان لوگوں نے کتاب اللہ کو اور عہد باری تعالیٰ کو اس طرح چھوڑ رکھا تھا گویا پھینک دیا تھا اس لیے ان کی مذمت میں یہی لفظ لایا گیا۔

دوسری جگہ صاف بیان ہے کہ ان کی کتابوں میں حضور ﷺ کا ذکر موجود تھا فرمایا ﴿يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِندَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ﴾ (اعراف / ١٥٧) یعنی یہ لوگ توراۃ و انجیل میں حضور ﷺ کا ذکر موجود

پاتے ہیں یہاں بھی فرمایا ہے کہ جب ان کی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہمارا پیغمبر ﷺ ان کے پاس آیا تو ان کے ایک فریق نے اللہ رب العزت کی کتاب سے بے پرواہی برت کر اس طرح اسے چھوڑ دیا جیسے کوئی علم ہی نہیں۔ بلکہ جادو کے پیچھے پڑ گئے اور خود حضور ﷺ پر جادو کیا جس کی اطلاع آپ کو جناب باری تعالیٰ نے دی اور اس کا اثر زائل ہوا اور آپ کو شفا ملی۔ تو راۃ سے تو حضور ﷺ کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ وہ تو اس کی تصدیق والی تھی تو اسے چھوڑ کر دوسری کتابوں کی پیروی کرنے لگے اور اللہ کی کتاب کو اس طرح چھوڑ دیا کہ گویا کبھی جانتے ہی نہ تھے نفسانی خواہشیں سامنے رکھ لیں اور کتاب اللہ کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا یہ بھی کہا گیا ہے کہ راگ باجے کھیل تماشے اور اللہ کے ذکر سے روکنے والی ہر چیز ﴿مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ﴾ میں داخل ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ایک انگوٹھی تھی جب آپ بیت الخلاء جاتے تو اپنی بیوی حضرت جرادہ کو دے جاتے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا وقت آیا اس وقت ایک شیطان جن آپ کی صورت میں آپ کی بیوی صاحبہ کے پاس آیا اور انگوٹھی طلب کی جو دے دی گئی اس نے پہن لی اور تخت سلیمانی پر بیٹھ گیا تمام جنات وغیرہ حاضر خدمت ہو گئے حکومت کرنے لگا ادھر جب حضرت سلیمان علیہ السلام واپس آئے اور انگوٹھی طلب کی تو جواب ملا تو جھوٹا ہے انگوٹھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام لے گئے آپ نے سمجھ لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے ان دنوں میں شیاطین نے جادو، نجوم، کہانت، شعر و اشعار اور غیب کی جھوٹی سچی خبروں کی کتابیں لکھ لکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی کرسی تلے دفن کرنی شروع کر دیں آپ کی آزمائش کا یہ زمانہ ختم ہو گیا آپ پھر تخت و تاج کے مالک ہوئے عمر طبعی کو پہنچ کر جب رحلت فرمائی تو شیاطین نے انسانوں سے کہنا شروع کیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا خزانہ اور وہ کتابیں جن کے ذریعہ سے وہ ہواؤں اور جنات پر حکمرانی کرتے تھے ان کی کرسی تلے دفن ہیں چونکہ جنات اس کرسی کے پاس نہیں جا سکتے تھے اس لیے انسانوں نے اسے کھودا تو وہ کتابیں برآمد ہوئیں بس ان کا چرچا ہو گیا اور ہر شخص کی زبان پر چڑھ گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا راز یہی تھا بلکہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت سے منکر ہو گئے اور آپ کو جادوگر کہنے لگے۔ آنحضرت ﷺ نے اس بات کی عقدہ کشائی کی اور فرمان باری تعالیٰ نازل ہوا کہ جادوگری کا یہ کفر تو شیاطین کا پھیلایا ہوا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام اس سے بری الذمہ ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ایک شخص آیا آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا عراق سے فرمایا عراق کے کس شہر سے؟ اس نے کہا کوفہ سے پوچھا وہاں کی کیا خبریں ہیں؟ اس نے کہا وہاں باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ انتقال نہیں کر گئے بلکہ زندہ روپوش ہیں اور عنقریب آئیں گے آپ کانپ اٹھے اور فرمانے لگے اگر ایسا ہوتا تو ہم ان کی میراث تقسیم نہ کرتے اور نہ ان کی عورتیں اپنا دوسرا نکاح کرتیں سنو! شیاطین آسمانی باتیں چرا لایا کرتے تھے اور ان میں اپنی باتیں ملا کر لوگوں میں پھیلایا کرتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ تمام کتابیں جمع کر کے اپنی کرسی تلے دفن کر دیں۔ آپ کے انتقال کے بعد جنات نے وہ پھر نکال لیں وہی کتابیں عراقیوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور ان ہی کتابوں کی باتیں وہ بیان کرتے اور پھیلاتے رہتے ہیں اسی کا ذکر اس آیت ﴿وَاتَّبَعُوْا﴾ الخ میں ہے۔

اس زمانہ میں یہ بھی مشہور ہو گیا تھا کہ شیاطین علم غیب جانتے ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کتابوں کو صندوق میں بھر کر دفن کر دینے کے بعد یہ حکم جاری کر دیا کہ جو یہ کہے گا اس کی گردن ماری جائے گی بعض روایتوں میں ہے کہ جنات نے ان کتابوں کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے انتقال کے بعد آپ کی کرسی تلے دفن کیا تھا اور ان کے شروع صفحہ پر لکھ دیا تھا کہ یہ علمی خزانہ آصف بن برخیا کا جمع کیا ہوا ہے جو حضرت سلیمان بن داود علیہ السلام کے وزیر اعظم مشیر خاص اور دلی دوست تھے یہود یوں میں مشہور تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نبی نہ تھے بلکہ جادوگر تھے اس بنا پر یہ آیتیں نازل ہوئیں اور اللہ کے سچے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سچے نبی کی برات کی اور یہودیوں کے اس عقیدے کا ابطال کیا وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام نبیوں کے زمرے میں سن کر بہت بدکتے تھے اس لیے تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کر دیا۔ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے تمام موذی جانوروں سے عہد لیا تھا جب انہیں وہ عہد یاد کرایا جاتا تھا تو وہ ستاتے نہ تھے پھر لوگوں نے اپنی طرف سے عبارتیں بنا کر جادو کی قسم کے منتر تنتر بنا کر ان سب کو آپ کی طرف منسوب کر دیا جس کا بطلان ان آیات کریمہ میں ہے یہ یاد رہے کہ "عَلٰی" یہاں پر "فِیْ" کے معنی میں ہے یا "تَتْلُوْا" متضمن ہے "تکذب" کا، یہی اولیٰ اور احسن ہے واللہ اعلم۔

خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جادو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے پہلے بھی تھا اور یہ بالکل سچ ہے حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگروں کا ہونا قرآن سے ثابت ہے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہونا بھی قرآن سے ظاہر ہے۔ داود علیہ السلام اور جالوت کے قصے میں ہے ﴿مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی﴾ [1] بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بھی پہلے حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی قوم نے کہا تھا ﴿اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ﴾ [2] یعنی تو جادو کیے گئے لوگوں میں سے ہے۔ پھر فرماتا ہے ﴿وَمَآ اُنْزِلَ﴾ الخ بعض تو کہتے ہیں یہاں پر "ما نافیہ" ہے یعنی انکار کے معنی میں ہے اور اس کا عطف ﴿مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ﴾ پر ہے یہودیوں کے اس دوسرے اعتقاد کی کہ جادو فرشتوں پر نازل ہوا ہے اس آیت میں تردید ہے، ہاروت ماروت لفظ شیاطین کا بدل ہے تثنیہ پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے جیسے ﴿اِنْ کَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ﴾ میں [3] یا اس لیے جمع کیا گیا کہ ان کے ماننے والوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اور ان کا نام ان کی زیادہ سرکشی کی وجہ سے سرفہرست دیا گیا ہے۔ قرطبی رحمہ اللہ تو کہتے ہیں کہ اس آیت کا یہی ٹھیک مطلب ہے اس کے سوا کسی اور معنی کی طرف التفات بھی نہ کرنا چاہیے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جادو اللہ عزوجل کا نازل کیا ہوا نہیں۔ [4] ربیع بن انس رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان پر کوئی جادو نہیں اترا۔ [5] اس بناء پر آیت کا ترجمہ اس طرح پر ہوگا کہ ان یہودیوں نے اس چیز کی تابعداری کی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں شیطان پڑھا کرتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا نہ اللہ تعالیٰ نے جادو کو ان دو فرشتوں پر اتارا ہے (جیسے اے یہودیو! تمہارا خیال جبرئیل و میکائیل علیہما السلام

---

[1] [سورہ البقرہ : آیت ۲۴۶]
[2] [سورۃ الشعرآء : آیت ۱۵۳]
[3] [تفسیر قرطبی (۲/۵۰)]
[4] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/۴۱۹)]
[5] [ایضا]

کی طرف ہے) بلکہ یہ کفر شیطانوں کا ہے جو بابل میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور ان کے سردار دو آدمی تھے جن کا نام ہاروت و ماروت تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابزی رحمہ اللہ اسے اس طرح پڑھتے تھے ﴿وَمَا أُنزِلَ عَلَى الْمَلِكَيْنِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ﴾ یعنی داود وسلیمان علیہما السلام دونوں بادشاہوں پر بھی جادو نہیں اتارا گیا یا یہ کہ وہ اس سے روکتے تھے کیونکہ یہ کفر ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کا زبردست رد کیا ہے وہ فرماتے ہیں "مَا" معنی میں "اَلَّذِیْ" کے ہے اور ہاروت ماروت دو فرشتے ہیں جنہیں اللہ نے زمین کی طرف اتارا ہے اور اپنے بندوں کی آزمائش اور امتحان کے لیے انہیں جادو کی تعلیم دی ہے لہٰذا ہاروت ماروت اس فرمان باری تعالیٰ کو بجالا رہے ہیں۔

ایک غریب قول یہ بھی ہے کہ یہ جنوں کے دو قبیلے ہیں "مَلِكَيْنِ" یعنی دو بادشاہوں کی قرات پر "اِنْزَالُ خُلْقُ" کے معنی میں ہوگا جیسے فرمایا: ﴿وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ﴾ (الزمر/٦) اور فرمایا: ﴿وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ﴾ (الحدید/٢٥) اور کہا ﴿وَيُنَزِّلُ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ رِزْقًا﴾ (غافر/١٣) یعنی ہم نے تمہارے لیے آٹھ قسم کے چوپائے پیدا کیے لوہا بنایا آسمان سے روزیاں اتاریں۔ حدیث میں ہے ﴿مَا أَنزَلَ اللَّهُ دَاءً﴾ الخ یعنی اللہ تعالیٰ نے جتنی بیماریاں پیدا کی ہیں ان سب کے علاج بھی پیدا کیے ہیں[1] مثل مشہور ہے کہ بھلائی برائی کا نازل کرنے والا اللہ ہے یہاں سب جگہ "انـزال خـلـق" یعنی پیدائش کے معنی میں ہے ایجاد یعنی لانے اور اتارنے کے معنی میں نہیں اسی طرح اس آیت میں بھی۔ اکثر سلف کا مذہب یہ ہے کہ یہ دونوں فرشتے تھے ایک مرفوع حدیث میں بھی یہ مضمون بسط وطول کے ساتھ ہے جو ابھی بیان ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ فرشتے تو معصوم ہیں وہ گناہ کرتے ہی نہیں چہ جائیکہ لوگوں کو جادو سکھائیں جو کفر ہے اس لیے کہ یہ دونوں بھی عام فرشتوں میں سے خاص ہو جائیں گے۔ جیسے کہ ابلیس کی بابت آپ ﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ﴾ (البقرہ/٣٤) الخ کی تفسیر میں پڑھ چکے ہیں حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، کعب احبار رضی اللہ عنہم حضرت سدی، حضرت کلبی رحمہم اللہ یہی فرماتے ہیں اب اس حدیث کو سنیے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اتارا اور ان کی اولاد پھیلی اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونے لگی تو فرشتوں نے کہا کہ دیکھو یہ کس قدر برے لوگ ہیں کیسے نافرمان اور سرکش ہیں ہم اگر ان کی جگہ ہوتے تو ہرگز ہرگز اللہ کی نافرمانی نہ کرتے اللہ تعالیٰ نے فرمایا اچھا تم اپنے میں سے دو فرشتوں کو پسند کر لو میں ان میں انسانی خواہشات پیدا کرتا ہوں اور انہیں انسانوں میں بھیجتا ہوں پھر دیکھتا ہوں کہ وہ کیا کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے ہاروت و ماروت کو پیش کیا اللہ تعالیٰ نے ان میں انسانی طبیعت پیدا کی اور ان سے کہہ دیا کہ دیکھو بنی آدم کو تو میں نبیوں کے ذریعہ اپنے حکم احکام پہنچاتا ہوں لیکن تم سے بلا واسطہ خود کہہ رہا ہوں کہ

---

[1] [صحیح: ابن ماجه: کتاب الطب: باب ما انزل الله داء الا انزل له شفاء (٣٤٣٨) مسند احمد (١/٣٧٧، ٤١٣)] حافظ بوصیریؒ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔[مصباح الزجاجة (٤/٥٠)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[غاية المرام (٢٩٢) صحیح ابن ماجه (٢٧٧٣) السلسلة الصحيحة (٤٥١) صحيح الجامع الصغير (٥٥٥٨)] شیخ شعیب ارناؤوط نے اسے صحیح لغیرہ کہا ہے۔[مسند احمد محقق (٣٥٧٨)]

میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا' زنا نہ کرنا' شراب نہ پینا اب یہ دونوں زمین پر اترے اور زہرہ کو ان کی آزمائش کے لیے حسین وشکیل عورت کی صورت میں ان کے پاس بھیجا جسے دیکھ کر یہ مفتون ہو گئے اور اس سے زنا کرنا چاہا اس نے کہا اگر تم شرک کرو تو میں منظور کرتی ہوں انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو ہم سے نہ ہو سکے گا وہ چلی گئی پھر آئی اور کہنے لگی اچھا اس بچے کو قتل کر ڈالو تو مجھے تمہاری خواہش پوری کرنی منظور ہے انہوں نے اسے بھی نہ مانا وہ پھر آئی اور کہا کہ اچھا یہ شراب پی لو انہوں نے اسے ہلکا گناہ سمجھ کر اسے منظور کر لیا۔ اب نشہ میں مست ہو کر زنا کاری بھی کی اور اس بچے کو بھی قتل کر ڈالا جب ہوش وحواس درست ہوئے تو اس عورت نے کہا جن جن کاموں کا تم پہلے انکار کرتے تھے سب تم نے کر ڈالے۔ یہ نادم ہوئے انہیں اختیار دیا گیا کہ یا تو عذاب دنیا کو اختیار کرو یا عذاب اخروی کو۔ انہوں نے دنیا کے عذاب پسند کیے صحیح ابن حبان' مسند احمد' ابن مردویہ' ابن جریر' عبدالرزاق میں یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ (1) مسند احمد کی یہ روایت غریب ہے اس میں ایک راوی موسیٰ بن جبیر انصاری سلمی کو ابن ابی حاتم نے مستور الحال لکھا ہے۔

ابن مردویہ کی روایت میں یہی ہے کہ ایک رات کو اثناء سفر میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے حضرت نافع رحمہ اللہ سے پوچھا کہ کیا زہرہ تارا نکلا ؟ اس نے کہا نہیں دو تین مرتبہ سوال کے بعد کہا اب زہرہ طلوع ہوا تو فرمانے لگے اسے نہ خوشی ہو نہ بھلائی ملے۔ حضرت نافع رحمہ اللہ نے کہا حضرت ایک ستارہ جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے طلوع وغروب ہوتا ہے آپ اسے برا کہتے ہیں؟ فرمایا میں وہی کہتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے پھر اس کے بعد مندرجہ بالا حدیث باختلاف الفاظ سنائی (2) لیکن یہ بھی غریب ہے حضرت کعب رضی اللہ عنہ والی روایت مرفوع سے زیادہ صحیح موقوف ہے اور ممکن ہے کہ وہ بنی اسرائیلی روایت ہو واللہ اعلم۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے بھی اس قسم کی روایتیں بہت کچھ منقول ہیں بعض میں ہے کہ زہرہ ایک عورت تھی اس نے ان فرشتوں سے یہ شرط کی تھی کہ تم مجھے وہ دعا سکھا دو جسے پڑھ کر تم آسمان پر چڑھ جاتے ہو انہوں نے سکھا دی یہ پڑھ کر چڑھ گئی اور وہاں تارے کی شکل میں بنا دی گئی (3) بعض مرفوع روایتوں میں بھی یہ ہے لیکن وہ منکر اور غیر صحیح ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس واقعہ سے پہلے تو فرشتے صرف ایمان والوں کی بخشش کی دعا مانگتے تھے لیکن اس کے بعد تمام اہل زمین کے لیے دعا شروع کر دی بعض روایتوں میں ہے کہ جب ان دونوں فرشتوں سے یہ نافرمانیاں سرزد ہوئیں تب اور فرشتوں نے اقرار کر لیا کہ بنی آدم جو اللہ تعالیٰ سے دور ہیں اور بن دیکھے ایمان لاتے ہیں جن سے خطاؤں کا سرزد ہو جانا کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں ان دونوں فرشتوں سے کہا گیا کہ اب یا تو دنیا کا عذاب پسند کر لو یا آخرت کے عذابوں کے لیے تیار ہو جاؤ۔ دونوں نے آپس میں مشورہ کر کے دنیا کے عذاب کو اختیار کیا کیونکہ یہ فنا ہو جانے والا ہے

---

(1) [باطل : مسند احمد (۱۳٤/۲) بزار (۲۹۳۸) ابن حبان (٦١٨٦) بیهقی (۱۰/٤-٥)] امام ابن حزمؒ نے فرمایا ہے کہ ہاروت اور ماروت کا قصہ' جس میں ان کے شراب پینے اور زنا کرنے کا ذکر ہے' باطل ومردود ہے۔ [الفصل (۳۰۳/۳-۳۰۸)] مولانا مبشر احمد ربانی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

(2) [باطل : الموضوعات لابن الجوزی (۱۸۷/۱)]

(3) [مستدرك حاكم (۲٦٥/۲-۲٦٦)]

اور آخرت کے عذاب دائمی ہیں چنانچہ انہیں بابل میں عذاب ہو رہا ہے ایک روایت میں ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے تھے ان میں قتل سے اور مال حرام سے ممانعت بھی تھی اور یہ حکم بھی تھا کہ حکم عدل کے ساتھ کریں۔

یہ بھی وارد ہوا ہے کہ یہ تین فرشتے تھے لیکن ایک نے آزمائش سے انکار کر دیا اور واپس چلا گیا پھر دو کی آزمائش ہوئی ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں یہ واقعہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کا ہے۔ یہاں بابل سے مراد بابل دیناوند ہے اس عورت کا نام عربی میں زہرہ تھا اور نبطی زبان میں اس کا نام بیدخت تھا اور فارسی میں ناہید تھا۔ یہ عورت اپنے خاوند کے خلاف ایک مقدمہ لائی تھی جب انہوں نے اس سے برائی کا ارادہ کیا تو اس نے کہا پہلے مجھے میرے خاوند کے خلاف حکم دو تو مجھے منظور ہے انہوں نے ایسا ہی کیا پھر اس نے کہا مجھے یہ بھی بتا دو کہ تم کیا پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہو اور کیا پڑھ کر اترتے ہو؟ انہوں نے یہ بھی بتا دیا چنانچہ وہ اسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی اترنے کا وظیفہ بھول گئی اور وہیں ستارے کی صورت میں مسخ کر دی گئی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب کبھی زہرہ ستارے کو دیکھتے تو لعنت بھیجا کرتے تھے اب ان فرشتوں نے جب چڑھنا چاہا تو نہ چڑھ سکے سمجھ گئے کہ اب ہم ہلاک ہوئے۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں پہلے پہل چند دنوں تک تو فرشتے ثابت قدم رہے صبح سے شام تک فیصلہ عدل کے ساتھ کرتے رہتے شام کو آسمان پر چڑھ جاتے پھر زہرہ کو دیکھ کر اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکے زہرہ ستارے کو ایک خوبصورت عورت کی شکل میں بھیجا گیا تھا۔ الغرض ہاروت وماروت کا یہ قصہ تابعین میں سے بھی اکثر لوگوں نے بیان کیا ہے جیسے مجاہد، سدی، حسن بصری، قتادہ، ابوالعالیہ، زہری، ربیع بن انس، مقاتل بن حیان رحمہم اللہ وغیرہ وغیرہ اور متقدمین اور متاخرین مفسرین نے بھی اپنی اپنی تفسیروں میں اسے نقل کیا ہے لیکن اس کا زیادہ تر دارومدار بنی اسرائیل کی کتابوں پر ہے کوئی صحیح مرفوع متصل حدیث اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں اور نہ قرآن کریم میں اس قدر ربط وتفصیل ہے پس ہمارا ایمان ہے کہ جس قدر قرآن میں ہے صحیح اور درست ہے اور حقیقت حال کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے (قرآن کریم کے ظاہری الفاظ مسند احمد ابن حبان بیہقی وغیرہ کی مرفوع حدیث حضرت علی، حضرت ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ کی موقوف روایات تابعین وغیرہ کی تفاسیر وغیرہ مل ملا کر اس واقعہ کی بہت کچھ تقویت ہو جاتی ہے نہ اس میں کوئی محال عقلی ہے نہ اس میں کسی اصول اسلامی کا خلاف ہے پھر ظاہر سے ہٹا کر بے جا تکلفات اٹھانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی واللہ اعلم) (فتح البیان)

ابن جریر میں ایک غریب اثر اور ایک عجیب واقعہ ہے اسے بھی سنیئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دومۃ الجندل کی ایک عورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد آپ کی تلاش میں آئی اور آپ کے انتقال کی خبر پا کر بے چین ہو کر رونے پیٹنے لگی میں نے اس سے پوچھا کہ آخر کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھ میں اور میرے شوہر میں ہمیشہ ناچاقی رہا کرتی تھی ایک مرتبہ وہ مجھے چھوڑ کر لاپتہ کہیں چلا گیا، ایک بڑھیا سے میں نے یہ سب ذکر کیا اس نے کہا جو میں کہوں وہ کرو وہ خود بخود تیرے پاس آ جائے گا میں تیار ہو گئی وہ رات کے وقت دو کتے لے کر میرے پاس آئی ایک پر وہ خود سوار ہوئی اور دوسرے پر میں بیٹھ گئی۔ تھوڑے ہی دیر میں ہم دونوں بابل پہنچ گئیں میں نے دیکھا کہ دو شخص ادھر لٹکے ہوئے ہیں اور لوہے میں جکڑے ہوئے ہیں اس عورت نے مجھ سے کہا

ان کے پاس جا اور ان سے کہہ کہ میں جادو سیکھنے آئی ہوں میں نے ان سے کہا انہوں نے کہا سن ہم تو آزمائش میں ہیں تو جادو نہ سیکھ اس کا سیکھنا کفر ہے۔ میں نے کہا میں تو سیکھوں گی انہوں نے کہا اچھا پھر جا اور اس تنور میں پیشاب کر کے چلی آ میں گئی ارادہ کیا لیکن کچھ دہشت سی طاری ہوئی میں واپس آ گئی اور کہا میں فارغ ہو آئی ہوں انہوں نے پوچھا کیا دیکھا؟ میں نے کہا کچھ نہیں انہوں نے کہا تو غلط کہتی ہے ابھی تو کچھ نہیں بگڑا تیرا ایمان ثابت ہے اب بھی لوٹ جا اور کفر نہ کر میں نے کہا مجھے تو جادو سیکھنا ہے انہوں نے پھر کہا جا اور اس تنور میں پیشاب کر آ میں پھر گئی لیکن اب کی مرتبہ بھی دل نہ مانا واپس آئی پھر اسی طرح سوال جواب ہوئے میں تیسری مرتبہ پھر تنور کے پاس گئی اور دل کڑا کر کے پیشاب کرنے کو بیٹھ گئی میں نے دیکھا کہ ایک گھڑ سوار منہ پر نقاب ڈالے نکلا اور آسمان پر چڑھ گیا ہے۔ واپس چلی آئی ان سے ذکر کیا انہوں نے کہا ہاں اب کی مرتبہ تو سچ کہتی ہے وہ تیرا ایمان تھا جو تجھ میں سے نکل گیا اب جا چلی جا میں آئی اور اس بڑھیا سے کہا انہوں نے مجھے کچھ بھی نہیں سکھایا اس نے کہا بس تجھے کچھ آ گیا اب تو جو کہے گی ہو جائے گا میں نے آزمائش کے لیے ایک دانہ گیہوں کا لیا اسے زمین پر ڈال کر کہا اگ جا وہ فوراً اگ آیا میں نے کہا تجھ میں بال پیدا ہو جائے چنانچہ ہو گئے میں نے کہا سوکھ جا وہ بال سوکھ گئے میں نے کہا الگ الگ دانہ ہو جا وہ بھی ہو گیا پھر میں نے کہا سوکھ جا تو سوکھ گیا پھر میں نے کہا آٹا بن جا تو آٹا بن گیا میں نے کہا روٹی پک جا تو روٹی پک گئی یہ دیکھتے ہی میرا دل نادم ہونے لگا اور مجھے اپنے بے ایمان ہو جانے کا صدمہ ہونے لگا اے ام المومنین رضی اللہ عنہا قسم اللہ کی نہ میں نے اس جادو سے کوئی کام لیا نہ کسی پر کیا میں یونہی روتی پیٹتی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئی کہ حضور ﷺ سے کہوں لیکن افسوس بدقسمتی سے آپ ﷺ کو بھی میں نے نہ پایا اب میں کیا کروں؟ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی سب کو اس پر ترس آنے لگا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی متحیر تھے کہ اسے کیا فتویٰ دیں؟ آخر بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا اب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ تم اس فعل کو نہ کرو توبہ استغفار کرو اور اپنے ماں باپ کی خدمت گزاری کرتی رہو۔

یہاں یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فتویٰ دینے میں بہت احتیاط کرتے تھے کہ چھوٹی سی بات بتانے میں تامل ہوتا تھا آج ہم بڑی سے بڑی بات بھی اٹکل اور رائے قیاس سے گھڑ گھڑا کر بتانے میں بالکل نہیں رکتے اس کی اسناد بالکل صحیح ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ "عین" چیز جادو کے زور سے پلٹ جاتی ہے اور بعض کہتے ہیں نہیں صرف دیکھنے والے کو ایسا خیال پڑتا ہے اصل چیز جیسی ہوتی ہے ویسی ہی رہتی ہے جیسے قرآن میں ہے ﴿سَحَرُوٓا اَعۡیُنَ النَّاسِ﴾ (اعراف/١١٦) الخ یعنی انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور فرمایا ﴿یُخَیَّلُ اِلَیۡہِ مِنۡ سِحۡرِہِمۡ اَنَّہَا تَسۡعٰی﴾ (طہ/٦٦) حضرت موسیٰ کی طرف خیال ڈالا جاتا تھا کہ گویا وہ سانپ وغیرہ ان کے جادو کے زور سے چل پھر رہے ہیں اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں لفظ بابل سے مراد بابل عراق ہے بابل دیناوند نہیں۔ ابن ابی حاتم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بابل کی زمین میں جا رہے تھے عصر کی نماز کا وقت آ گیا لیکن آپ نے وہاں نماز ادا نہ کی بلکہ اس زمین کی سرحد سے نکل جانے کے بعد نماز پڑھی اور فرمایا میرے حبیب ﷺ نے مجھے قبرستان میں نماز پڑھنے سے روک دیا ہے

اور بابل کی زمین میں نماز پڑھنے سے بھی ممانعت فرمائی ہے یہ زمین ملعون ہے۔ ابوداود میں بھی یہ حدیث مروی ہے۔ (1) اور امام صاحب نے اس پر کوئی کلام نہیں کیا اور جس حدیث کو حضرت امام ابوداود رحمہ اللہ اپنی کتاب میں لائیں اور اس کی سند پر خاموشی کریں تو وہ حدیث امام صاحب کے نزدیک حسن ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ بابل کی سرزمین میں نماز مکروہ ہے جیسے کہ ثمودیوں کی سرزمین کی بابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان لوگوں کی منزلوں میں نہ جاؤ اگر اتفاقاً جانا پڑے تو خوف الٰہ سے روتے ہوئے جاؤ۔ (2) ہیئت دانوں کا قول ہے کہ بابل کی دوری بحر غربی اوقیانوس سے ستر درجہ لمبی اور وسط زمین سے جنوب کی جانب بخط استوا سے تیس درجہ ہے واللہ اعلم۔ چونکہ ہاروت وماروت کو اللہ تعالیٰ نے خیر وشر کفر وایمان کا علم دے رکھا ہے اس لیے ہر ایک کفر کی طرف جھکنے والے کو نصیحت کرتے ہیں۔ اور ہر طرح روکتے ہیں جب نہیں مانتا تو وہ اسے کہہ دیتے ہیں اس کا نور ایمان جاتا رہتا ہے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور جادو آ جاتا ہے شیطان اس کا رفیق کار بن جاتا ہے ایمان کے نکل جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا غضب اس کے رونگٹے رونگٹے میں گھس جاتا ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں سوائے کافر کے اور کوئی جادو سیکھنے کی جرات نہیں کرتا فتنہ کے معنی یہاں پر بلا آزمائش اور امتحان کے ہیں (3) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول قرآن پاک میں مذکور ہے ﴿اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ﴾ (اعراف / ۱۵۵) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جادو سیکھنا کفر ہے حدیث میں بھی ہے جو شخص کسی کاہن یا جادوگر کے پاس جائے اور اس کی بات کو سچ سمجھے اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی وحی کے ساتھ کفر کیا (بزار) (4) یہ حدیث صحیح ہے اور اس کی تائید میں اور حدیثیں بھی آئی ہیں۔

پھر فرمایا کہ لوگ ہاروت وماروت سے جادو سیکھتے ہیں جس کے ذریعے برے کام کرتے ہیں عورت مرد کی محبت اور موافقت کو بغض اور مخالفت سے بدل دیتے ہیں صحیح مسلم میں حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں شیطان اپنا عرش پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکروں کو بہکانے کے واسطے بھیجتا ہے سب سے زیادہ مرتبہ والا اس کے نزدیک وہ ہے جو فتنے میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ یہ جب واپس آتے ہیں تو اپنے بدترین کاموں کا ذکر کرتے ہیں کوئی کہتا ہے میں نے فلاں کو اس طرح گمراہ کر دیا۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شخص سے یہ گناہ کرایا۔ شیطان ان سے کہتا ہے کچھ نہیں یہ تو معمولی کام ہے یہاں تک کہ ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کے اور اس کی بیوی

---

(1) [ضعیف : سنن ابو داؤد : کتاب الصلوة : باب فی المواضع التی لا تجوز فیها الصلوة (۴۹۰)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف ابوداود (۹۳) الثمر المستطاب (۱/ ۴۰۰)] شیخ عبدالرزاق مہدی، شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ مولانا مبشر احمد ربانی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔]

(2) [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الصلوة : باب الصلوة فی مواضع الخسف والعذاب (۴۳۳) صحیح مسلم : کتاب الزهد : باب لا تدخلوا مساکن الذین ظلموا (۲۹۸۰)]

(3) [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/ ۴۴۳)]

(4) [مجمع الزوائد (۵/ ۱۱۷)]

کے درمیان جھگڑا ڈال دیا یہاں تک کہ جدائی ہوگئی شیطان اسے گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے ہاں تو نے بڑا کام کیا اسے اپنے پاس بٹھا لیتا ہے اور اس کا مرتبہ بڑھا دیتا ہے (۱) پس جادوگر بھی اپنے جادو سے وہ کام کرتا ہے جس سے میاں بیوی میں جدائی ہو جائے مثلاً اس کی شکل وصورت اسے بری معلوم ہونے لگے یا اس کے عادات واطوار سے جو غیر شرعی نہ ہوں یہ نفرت کرنے لگے یا دل میں عداوت آ جائے وغیرہ وغیرہ رفتہ رفتہ یہ باتیں بڑھتی جائیں اور آپس میں چھوٹ چھٹاؤ ہو جائے "مرء" کہتے ہیں آدمی کو اس کا مذکر مونث اور تثنیہ تو ہے جمع نہیں بنتا پھر فرمایا یہ کسی کو بھی بغیر اللہ کی مرضی کے ایذا نہیں پہنچا سکتے یعنی اس کے اپنے بس کی بات نہیں اللہ تعالیٰ کی قضا وقدر اور اس کے ارادے کے ماتحت یہ نقصان بھی پہنچتا ہے (۲) اگر اللہ نہ چاہے تو اس کا جادو محض بے اثر اور بے فائدہ ہو جاتا ہے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ یہ جادو اسی شخص کو نقصان دیتا ہے جو اسے حاصل کرے اور اس میں داخل ہو پھر ارشاد ہوتا ہے وہ ایسا علم سیکھتے ہیں جو ان کے لیے سراسر نقصان دہ ہے جس میں کوئی نفع نہیں اور یہ یہودی جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تابعداری چھوڑ کر جادو کے پیچھے لگنے والوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں (۳) نہ ان کی قدر و وقعت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے نہ وہ دیندار سمجھے جاتے ہیں پھر فرمایا اگر یہ اس کام کی برائی کو محسوس کرتے اور ایمان وتقویٰ برتتے تو یقیناً ان کے لیے بہت ہی بہتر تھا مگر یہ بے علم لوگ ہیں۔ اور فرمایا کہ اہل علم نے کہا تم پر افسوس ہے اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ثواب ایمانداروں اور نیک اعمال والوں کے لیے بہت ہی بہتر ہے لیکن اسے صبر کرنے والے ہی پا سکتے ہیں۔

اس آیت سے یہ بھی استدلال بزرگان دین نے کیا ہے کہ جادوگر کافر ہے کیونکہ آیت میں ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا﴾ فرمایا ہے حضرت امام احمد رحمہ اللہ اور سلف کی ایک جماعت بھی جادو سیکھنے والے کو کافر کہتی ہے بعض کافر تو نہیں کہتے لیکن فرماتے ہیں کہ جادوگر کی حد یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

بجالہ بن عبدہ رحمہ اللہ کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک فرمان میں لکھا تھا کہ ہر ایک جادوگر مرد عورت کو قتل کر دو چنانچہ ہم نے تین جادوگروں کی گردن ماری (۴) صحیح بخاری شریف میں ہے کہ ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر ان کی ایک لونڈی نے جادو کیا جس پر اسے قتل کیا گیا۔ (۵) حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں تین صحابیوں سے جادوگر کے قتل کا فتویٰ ثابت ہے (۶) ترمذی میں ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جادوگر کی حد تلوار

---

(۱) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب صفات المنافقین : باب تحریش الشیطان (۲۸۱۳) مسند احمد (۳۱٤/۳ ـ ۳۳۲) مسند ابو یعلی (۱۹۰۹)]

(۲) [تفسیر ابن ابی حاتم (۳۱۱/۱)]

(۳) [تفسیر ابن ابی حاتم (۳۱٤/۱)]

(۴) [صحیح : مسند احمد (۱۹۰/۱ـ۱۹۱) صحیح بخاری : کتاب الجزیة : باب الجزیة الموادعة مع اهل الذمة والحرب (۳۱۵٦) بیهقی فی السنن الکبری (۲٤۷/۸)]

(۵) [عبد الله بن احمد فی مسائل ابیه (۱۰٤۳) مؤطا (۸۷۱/۲) کتاب العقول : باب ما جاء فی الغیلة والسحر (۱٤)]

(۶) [تفسیر قرطبی (٤۸/۲)]

سے قتل کر دینا ہے [1] اس حدیث کے ایک راوی اسماعیل بن مسلم ضعیف ہیں صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ غالباً یہ حدیث موقوف ہے لیکن طبرانی میں ایک دوسری سند سے بھی یہ حدیث مرفوع مروی ہے [2] واللہ اعلم۔

ولید بن عقبہ کے پاس ایک جادوگر تھا جو اپنے کرتب بادشاہ کو دکھایا کرتا تھا بظاہر ایک شخص کا سر کاٹ لیتا پھر آواز دیتا سر جڑ جاتا اور وہ موجود ہو جاتا مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ایک بزرگ صحابی نے یہ دیکھا اور دوسرے دن تلوار باندھے ہوئے آئے جب ساحر نے اپنا کھیل شروع کیا آپ نے اپنی تلوار سے خود اس کی گردن اڑا دی اور فرمایا لے اب اگر سچا ہے تو خود جی اٹھ پھر قرآن پاک کی یہ آیت پڑھ کر لوگوں کو سنائی ﴿أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ﴾ (الانبیاء/ ۳) کیا تم دیکھتے بھالتے جادو کے پاس جاتے ہو؟ چونکہ اس بزرگ صحابی رضی اللہ عنہ نے ولید کی اجازت اس کے قتل میں نہیں لی تھی اس لیے بادشاہ نے ناراض ہو کر انہیں قید کر دیا لیکن پھر چھوڑ دیا امام شافعی رحمہ اللہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جب جادو شرکیہ الفاظ سے ہو۔

معتزلہ جادو کے وجود کے منکرین ہیں وہ کہتے ہیں جادو کوئی چیز نہیں بلکہ بعض لوگ تو بعض دفعہ اتنا بڑھ جاتے ہیں کہ کہتے ہیں جو جادو کا وجود مانتا ہو وہ کافر ہے لیکن اہل سنت جادو کے وجود کے قائل ہیں یہ مانتے ہیں کہ جادوگر اپنے جادو کے زور سے ہوا پر اڑ سکتے ہیں اور انسان بظاہر گدھا اور گدھے کو بظاہر انسان بنا ڈالتے ہیں مگر کلمات اور منتر جنتر کے وقت ان چیزوں کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے آسمان کو اور تاروں کو تاثیر پیدا کرنے والا اہل سنت نہیں مانتے، فلسفے اور نجوم والے اور بے دین لوگ تو ناموں کو اور آسمان کو ہی اثر پیدا کرنے والا جانتے ہیں اہل سنت کی ایک دلیل تو آیت ﴿وَمَا هُم بِضَارِّينَ﴾ الخ ہے اور دوسری دلیل خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا جانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا اثر ہونا ہے تیسرے اس عورت کا واقعہ جسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا ہے جو اوپر ابھی ابھی گذرا ہے اور بھی بیسیوں ایسے ہی واقعات وغیرہ ہیں۔

رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جادو کا حاصل کرنا برا نہیں محققین کا یہی قول ہے اس لیے کہ وہ بھی ایک علم ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الزمر/ ۹) یعنی علم والے اور بے علم برابر نہیں ہوتے اور اس لیے بھی کہ یہ علم ہوگا تو اس سے معجزے اور جادو میں فرق پوری طرح واضح ہو جائے گا اور معجزے کا علم واجب ہے اور وہ موقوف ہے جادو کے سیکھنے پر جس سے فرق معلوم ہو پس جادو کا سیکھنا بھی واجب ہوا رازی رحمہ اللہ کا یہ قول سرتاپا غلط ہے اگر عقلاً وہ اسے برا نہ بتائیں تو معتزلہ موجود ہیں جو عقلاً بھی اس کی برائی کے قائل ہیں اور اگر شرعاً برا نہ بتاتے ہوں تو قرآن کی یہ آیت شرعی برائی بتانے

---

[1] [ضعیف: ترمذی: کتاب الحدود: باب ما جاء فی حد الساحر (۱۴۶۰) بیهقی (۸/ ۱۳۶) ابن عدی (۱/ ۲۸۵) دارقطنی (۳/ ۱۱۴) حاکم (۴/ ۳۶۰)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[السلسلة الضعيفة (۱۴۴۶) ضعيف الجامع الصغير (۲۶۹۹) ضعيف ترمذی (۲۲۴)] ابن طاہر مقدسیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اسماعیل بن مسلم راوی متروک الحدیث ہے۔[ذخیرة الحفاظ (۲۶۶۶)]

[2] [الطبرانی فی الکبیر (۱۶۶۶)، (۲/ ۱۶۱)]

کے لیے کافی ہے صحیح حدیث میں ہے جو کوئی شخص کسی جادوگر یا کاہن کے پاس جائے وہ کافر ہو جائے گا۔ [1]

سنن میں حدیث ہے کہ جس نے گرہ لگائی اور اس میں پھونکا' اس نے جادو کیا [2] لہٰذا رازی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ محققین کا قول یہی ہے یہ بھی ٹھیک نہیں آخر ان محققین کے ایسے اقوال کہاں ہیں؟ ائمہ اسلام میں سے کس نے ایسا کہا ہے؟ پھر ﴿هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ﴾ الخ کی آیت کو پیش کرنا بھی نری جرأت ہے کیونکہ آیت میں علم سے مراد دینی علم ہے اسی آیت میں شرعی علم والے علماء کی فضیلت بیان ہوئی ہے' پھر ان کا یہ کہنا کہ اسی علم سے کہ اسی سے معجزے کا علم تقابلی حاصل ہوتا ہے یہ تو بالکل واہی محض غلط اور فاسد ہے اس لیے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن پاک ہے جو باطل سے سراسر محفوظ ہے لیکن اس کا معجزہ ماننا جادو کے جاننے پر موقوف نہیں وہ لوگ جنہیں جادو سے دور کا بھی تعلق نہیں وہ بھی اسے معجزہ مان گئے صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین ائمہ مسلمین بلکہ عام مسلمان بھی اسے معجزہ مانتے ہیں حالانکہ ان تمام میں سے کوئی ایک بھی جادو جانتا تو کیا جادو کے پاس تک نہیں پھٹکا جادو سیکھا نہ سکھایا۔ نہ کیا نہ کرایا۔ بلکہ ان سب کاموں کو کفر کہتے رہے پھر یہ دعویٰ کرنا کہ جادو کا جاننا واجب ہے اس لیے کہ جادو کے علم سے معجزہ کا فرق معلوم ہو سکتا ہے اس لیے اس کا سیکھنا واجب۔ کس قدر مہمل دعویٰ ہے۔

جادو کی قسمیں: اب جادو کی قسمیں سنیے جنہیں ابو عبداللہ رازی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

① ایک جادو تو ستارہ پرست فرقہ کا ہے وہ سات ستاروں کی نسبت عقیدہ رکھتے ہیں کہ بھلائی برائی انہی کے باعث ہوتی ہے اس لیے ان کی طرف خطاب کر کے مقرر الفاظ پڑھا کرتے ہیں اور انہیں کی پرستش کرتے ہیں اسی قوم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے اور انہیں ہدایت کی۔ رازی رحمہ اللہ نے اس فن میں ایک خاص کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام "اَلسِّرُّ الْمَكْتُوْمُ فِيْ مُخَاطَبَةِ الشَّمْسِ وَالنُّجُوْمِ" رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو ابن خلکان وغیرہ۔ بعض تو کہتے ہیں کہ انہوں نے بعد میں اس سے توبہ کر لی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ صرف لوگوں کو اس علم سے آشنا کرنے اور خود کو اس کا عالم ثابت کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی تھی نہ کہ ان کا اعتقاد بھی یہی ہو جو سراسر کفر ہے اس کتاب میں ان لوگوں کے طور طریقے لکھے ہیں۔

② دوسرا جادو قوی نفس اور قوت واہمہ کے طاقتور لوگوں کا فن ہے وہم اور خیال کا زندگی میں بڑا اثر ہوتا ہے

---

[1] [**صحیح:** صحیح مسلم : کتاب السلام : باب تحریم الکھانۃ واتیان الکھان (۲۲۳۰) مسند احمد (۴۲۹/۲) ابو یعلی موصلی (۵۴۰۸/۹) البزار (۲۰۶۷) بیھقی فی الکبری (۱۳۵/۱)]

[2] [**ضعیف:** نسائی : کتاب المحاربۃ : باب الحکم فی السحرۃ (۴۰۸۴)] اس میں ایک تو عباد بن میسرہ راوی ضعیف ہے اور دوسرے جمہور کے مطابق حسن کا ابو ہریرہؓ سے سماع ثابت نہیں۔ اسی لیے امام ذہبیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث ایک ضعیف راوی اور انقطاع کی وجہ سے ضعیف ہے۔ [میزان (۳۷۸/۲)] حافظ ابن حجرؒ نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ [تلخیص الحبیر (۴۱/۴)] امام ابن عدیؒ نے اس روایت کو الکامل میں ذکر کیا ہے۔ [(۱۶۴۸/۴)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ [ضعیف الجامع الصغیر (۵۷۰۲)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے اور یہ منقطع ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

دیکھئے اگر ایک تنگ پل زمین پر رکھ دیا جائے تو اس پر سے انسان بہ آسانی گزر جائے گا لیکن یہی تنگ پل اگر کسی دریا پر ہو تو نہیں گذر سکے گا اس لیے کہ اس وقت خیال ہوگا کہ اب گرا اب گرا تو واہمہ کی کمزوری کے باعث جتنی جگہ پر زمین میں چل پھر سکتا تھا اتنی جگہ پر ایسے ڈر کے وقت نہیں چل سکتا حکیموں اور طبیبوں نے بھی مرعوف (جس کو نکسیر بہنے کی بیماری ہو) شخص کو سرخ چیزوں کو دیکھنے سے روک دیا ہے اور مرگی والوں کو زیادہ روشنی والی اور تیز حرکت کرنے والی چیزوں کو دیکھنے سے منع کیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ قوت واہمہ کا ایک خاص اثر طبیعت پر پڑتا ہے عقلمند لوگوں کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ نظر لگتی ہے صحیح حدیث میں بھی آیا ہے کہ نظر کا لگنا حق ہے اگر کوئی چیز تقدیر سے سبقت کرنے والی ہوتی تو نظر ہوتی [1] اب اگر نفس قوی ہے تو ظاہری سہاروں اور ظاہری کاموں کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر اتنا قوی نہیں تو پھر اسے آلات کی بھی ضرورت پڑتی ہے جس قدر نفس کی قوت بڑھتی جائے گی وہ روحانیات میں ترقی کرتا جائے گا اور تاثیر میں بڑھتا جائے گا اور جس قدر یہ قوت کم ہوتی جائے گی اسی قدر گھٹتا جائے گا یہ کیفیت کبھی غذا کی کمی سے اور لوگوں کے میل جول کے ترک کرنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے کبھی تو قوت کو حاصل کر کے انسان نیکی کے کام یعنی شریعت کے مطابق اس سے کام لیتا ہے اس حال کو شریعت کی اصطلاح میں کرامت کہتے ہیں جادو نہیں کہتے اور کبھی اس حال سے باطل میں اور خلاف شرع کاموں میں مدد لیتا ہے اور دین سے دور پڑ جاتا ہے ایسے لوگوں کے ایسے قابل حیرت کاموں سے کسی کو دھوکا کھا کر انہیں ولی نہ سمجھ لینا چاہیے کیونکہ شریعت کے خلاف چلنے والا ولی اللہ نہیں ہوسکتا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ صحیح احادیث میں دجال کی بابت کیا کچھ آیا ہے؟ وہ کیسے کیسے خلاف عادت کام کر کے دکھائے گا لیکن ان کی وجہ سے وہ اللہ کا ولی نہیں بلکہ ملعون و مردود ہے۔

(۳) تیسری قسم کا جادو جنات کے ذریعہ زمین والوں کی روحوں سے امداد و اعانت طلب کرنے کا ہے معتزلہ اور فلاسفہ اس کے قائل نہیں ان روحوں سے بعض مخصوص الفاظ اور اعمال سے تعلق پیدا کرتے ہیں اسے سحر بالعزائم اور عمل تسخیر بھی کہتے ہیں۔

(۴) چوتھی قسم خیالات کا بدل دینا آنکھوں پر اندھیرا ڈال دینا اور شعبدہ بازی کرنا ہے جس سے حقیقت کے خلاف اور کا اور دکھائی دینے لگتا ہے تم نے دیکھا ہوگا کہ شعبدہ باز پہلے ایک کام شروع کرتا ہے جب لوگ دلچسپی کے ساتھ اس طرف نظریں جما دیتے ہیں اور ان کی باتوں کی طرف متوجہ ہو کر ہمہ تن اس میں مصروف ہو جاتے ہیں وہ پھرتی سے ایک دوسرا کام کر ڈالتا ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے اور اسے دیکھ کر وہ حیران رہ جاتے ہیں، بعض مفسرین کا قول ہے کہ فرعون کے جادوگروں کا جادو بھی اسی قسم کا تھا اسی لیے قرآن میں ہے ﴿سَحَرُوٓا اَعۡيُنَ النَّاسِ وَاسۡتَرۡهَبُوۡهُمۡ﴾ (اعراف ۱۱۶) الخ لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کے دلوں میں ڈر بٹھا دیا اور جگہ ہے ﴿يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ﴾

---

[1] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب السلام: باب الطب والمرض والرقی (۲۱۸۸) ترمذی: کتاب الطب: باب ما جاء ان العین حق والغسل لها (۲۰۶۲)]

(طه/٦٦) الخ موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں وہ سب لکڑیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑتی ہوئی نظر آنے لگیں حالانکہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

⑤ پانچویں قسم بعض چیزوں کو ترکیب دے کر کوئی عجیب کام اس سے لینا مثلاً گھوڑے کی شکل بنا دی اس پر ایک سوار بنا کر بٹھا دیا اس کے ہاتھ میں ناقوس ہے جہاں ایک ساعت گذری اور اس ناقوس میں سے آواز نکلی حالانکہ کوئی اسے نہیں چھیڑتا' اسی طرح انسانی صورت اس کاریگری سے بنائی کہ گویا اصلی انسان ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے' فرعون کے جادوگروں کا جادو بھی اسی قسم میں سے تھا کہ وہ بنائے ہوئے سانپ وغیرہ زئبق کے باعث زندہ حرکت کرنے والے دکھائی دیتے تھے گھڑی اور گھنٹے اور چھوٹی چھوٹی چیزیں جن سے بڑی بڑی چیزیں کھچ آتی ہیں سب اسی قسم میں داخل ہیں حقیقت میں اسے جادو ہی نہ کہنا چاہیے کیونکہ یہ تو ایک ترکیب اور کاریگری ہے جس کے اسباب بالکل ظاہر ہیں جو انہیں جانتا ہو وہ ان اسباب وفنون سے یہ کام لے سکتا ہے اسی طرح کا وہ حیلہ بھی ہے کہ جو بیت المقدس کے نصرانی کرتے تھے کہ پراسرار طریقہ سے گرجے کی قندیلیں جلا دیں اور اسے گرجے کی کرامت مشہور کر دی یا اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف جھکا لیا بعض کرامیہ صوفیوں کا بھی خیال ہے کہ اگر ترغیب وترہیب کی حدیثیں گھڑ لی جائیں اور لوگوں کو عبادت کی طرف مائل کیا جائے تو کوئی حرج نہیں' لیکن یہ بڑی غلطی ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جو شخص مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولے وہ اپنی جگہ جہنم میں مقرر کر لے [1] اور فرمایا میری حدیثیں بیان کرتے رہو لیکن مجھ پر جھوٹ نہ باندھو مجھ پر جھوٹ بولنے والا قطعاً جہنمی ہے۔ [2]

ایک نصرانی پادری نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک پرندے کا چھوٹا سا بچہ جسے اڑنے اور چلنے پھرنے کی طاقت نہیں ایک گھونسلے میں بیٹھا ہے جب وہ اپنی ضعیف اور پست آواز نکالتا ہے تو اور پرندے اسے سن کر رحم کھا کر زیتون کا پھل اس گھونسلے میں لا کر رکھ جاتے ہیں اس نے اسی صورت کا ایک پرندہ کسی چیز کا بنایا اور نیچے سے اسے کھوکھلا رکھا اور ایک سوراخ اس کی چونچ کی طرف رکھا جس سے ہوا اس کے اندر گھستی تھی پھر جب نکلتی تھی تو اسی طرح کی آواز اس سے پیدا ہوتی تھی اسے لا کر اپنے گرجے میں ہوا کے رخ رکھ دیا چھت میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر دیا تا کہ ہوا اس سے جائے اب جب ہوا چلتی اور اس کی آواز نکلتی تو اس قسم کے پرندے جمع ہو جاتے اور زیتون کے پھل لا کر رکھ جاتے اس نے لوگوں میں شہرت دینی شروع کی کہ اس گرجے میں یہ کرامت ہے یہاں ایک بزرگ کا مزار ہے اور یہ کرامت انہی کی ہے لوگوں نے جب اپنی آنکھوں یہ انہونی عجیب دیکھی تو معتقد ہو گئے اور اس قبر پر

---

[1] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب العلم : باب اثم من کذب علی النبی (۱۱۰) صحیح مسلم : مقدمہ : باب تغلیظ الکذب علی رسول اللہ (۲) مسند احمد (۹۸/۳)]

[2] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب العلم : باب اثم من کذب علی النبی (۱۰٦) صحیح مسلم : کتاب السنۃ : (۲) ابن ماجہ : کتاب السنۃ : باب التغلیظ فی تعمد علی رسول اللہ (۳۱) ترمذی : کتاب العلم : باب ما جاء فی تعظیم الکذب علی رسول اللہ (۲٦٦۰)]

نذر نیاز چڑھانے لگے اب کرامت دور دور تک مشہور ہو گئی حالانکہ کوئی کرامت نہ تھی نہ معجزہ تھا صرف ایک پوشیدہ فن تھا جسے اس ملعون شخص نے پیٹ بھرنے کے لیے پوشیدہ طور پر رکھا تھا اور ایک لعنتی فرقہ اس پر ریجھا ہوا تھا۔

⑥ چھٹی قسم جادو کی بعض دواؤں کے مخفی خواص معلوم کر کے انہیں کام میں لانا اور یہ ظاہر ہے کہ دواؤں میں عجیب عجیب خاصیتیں ہیں مقناطیس ہی کو دیکھو کہ لوہا کس طرح اس کی طرف کھچ جاتا ہے اکثر صوفی اور فقیر اور درویش انہی حیلہ سازیوں کو کرامت کر کے لوگوں کو دکھاتے ہیں اور انہیں مرید بناتے پھرتے ہیں۔

⑦ ساتویں قسم دل پر ایک خاص قسم کا اثر ڈال کر اس سے جو چاہنا منوا لینا ہے مثلاً اس سے کہہ دیا کہ مجھے اسم اعظم یاد ہے یا جنات میرے قبضہ میں ہیں اب اگر سامنے والا کمزور دل کچے کانوں اور بودے عقیدے والا ہے تو وہ اسے سچ سمجھ لے گا اور اس کی طرف سے ایک قسم کا خوف ڈر ہیبت اور رعب اس کے دل پر بیٹھ جائے گا جو اس کو ضعیف بنا دے گا اب اس وقت جو چاہے کرے گا اور اس کا کمزور دل اسے عجیب عجیب باتیں دکھاتا جائے اسی کو متبلہ (عام زبان میں اسے معمول) کہتے ہیں اور یہ اکثر کم عقل لوگوں پر ہو جایا کرتا ہے اور علم فراست سے کامل عقل والا اور کم عقل والا انسان معلوم ہو سکتا ہے اور اس حرکت کا کرنے والا اپنا یہ فعل اپنی قوت قیافہ کے ذریعہ سے کم عقل شخص کو پہچان کر کے ہی کرتا ہے۔

⑧ آٹھویں قسم چغلی کرنا جھوٹ سچ ملا کر کسی کے دل میں اپنا گھر کر لینا اور خفیہ چالوں سے اسے اپنا گرویدہ کر لینا یہ چغل خوری اگر لوگوں کو بھڑکانے اور بدکانے اور ان کے درمیان عداوت و دشمنی ڈالنے کے لیے ہو تو شرعاً حرام ہے جب اصلاح کے طور پر اور آپس میں ایک دوسرے مسلمان کو ملانے کے لیے کوئی ایسی بات ظاہر کہہ دی جائے جس سے ایک فریق دوسرے فریق سے خوش ہو جائے یا کوئی آنے والی مصیبت مسلمانوں پر سے ٹل جائے یا کفار کی قوت زائل ہو جائے ان میں بددلی پھیل جائے اور مخالفت پھوٹ پڑے تو یہ جائز ہے جیسے حدیث میں ہے کہ وہ شخص جھوٹا نہیں جو بھلائی کے لیے ادھر کی ادھر لے جاتا ہے [1] اور جیسے حدیث میں ہے کہ لڑائی مکر کا نام ہے [2] اور جیسے حضرت نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جنگ احزاب کے موقعہ پر کفار عرب اور کفار یہود کے درمیان کچھ ادھر ادھر کی اوپری باتیں کہہ کر جدائی ڈلوا دی تھی اور انہیں مسلمانوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی یہ کام بڑے عالی دماغ زیرک اور معاملہ فہم شخص کا ہے۔

یہ یاد رہے کہ امام رازی رحمہ اللہ نے جادو کی جو یہ آٹھ قسمیں بیان کی ہیں یہ صرف باعتبار لفظ کے ہیں کیونکہ

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الصلح: باب لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس (۲۶۹۲) صحیح مسلم: کتاب البر والصلة: باب تحریم الکذب و بیان المباح منه (۲۶۰۵) ترمذی: کتاب البر و الصلة: باب ما جاء فی اصلاح ذات البین (۱۹۳۸) ابو داؤد: کتاب الادب: باب فی اصلاح ذات البین (۴۹۲۰ـ ۴۹۲۱) مسند احمد (۶/۴۰۳)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الجهاد والسیر: باب الحرب خدعة (۳۰۳۰) صحیح مسلم: کتاب الجهاد: باب جواز الخداع فی الحرب (۱۷۳۹) ترمذی: کتاب الجهاد: باب ما جاء فی الرخصته فی الکذب (۱۶۷۵) ابو داؤد: کتاب الجهاد: باب المکر فی الحرب (۲۶۳۶)]

عربی زبان میں سحر یعنی جادو ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو بہت لطیف اور باریک ہو اور ظاہر بین انسان کی نگاہوں سے اس کے اسباب پوشیدہ رہ جائیں اسی واسطے ایک حدیث میں ہے کہ بعض بیان بھی جادو ہوتا ہے [1] اور اسی لیے صبح کے اول وقت کو سحور کہتے ہیں کہ وہ مخفی ہوتا ہے اور اس رگ کو بھی سحر کہتے ہیں جو غذا کی جگہ ہے۔ ابوجہل نے بدر والے دن یہی کہا تھا کہ اس کی سحر یعنی رگ طعام مارے خوف کے پھول گئی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میرے سحر ونحر کے درمیان رسول اللہ ﷺ فوت ہوئے [2] تو نحر سے مراد سینہ اور سحر سے مراد رگ غذا۔ قرآن میں بھی ہے ﴿سَحَرُوٓا أَعۡيُنَ ٱلنَّاسِ﴾ (اعراف/۱۱۶) یعنی لوگوں کی نگاہوں سے اپنا کام مخفی کر کے انجام دیا۔

ابوعبداللہ قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں ہم کہتے ہیں کہ جادو ہے اور مانتے ہیں کہ جب اللہ کو منظور ہوتا ہے وہ جادو کے وقت جو چاہتا ہے کر دیتا ہے گو معتزلہ اور ابواسحاق اسفرائینی شافعی اس کے قائل نہیں اور جادو کبھی ہاتھ کی چالاکی سے بھی ہوتا ہے اور کبھی ڈوروں دھاگوں سے بھی کبھی اللہ کا نام پڑھ کر دم کرنے سے بھی اس میں ایک خاص اثر ہوتا ہے۔ کبھی شیاطین کا نام لے کر شیطانی کام سے بھی لوگ کرتے ہیں کبھی دواؤں وغیرہ کے ذریعہ سے بھی جادو کیا جاتا ہے حضور ﷺ کے اس فرمان کے مطابق کہ بعض بیان جادو ہیں دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ بطور تعریف کے آپ نے فرمایا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ بطور مذمت کے یہ ارشاد ہوا ہو کہ وہ اپنی غلط بات اس طرح بیان کرتا ہے کہ سچ معلوم ہوتی ہے جیسے ایک اور حدیث میں ہے کہ کبھی میرے پاس تم مقدمہ لے کر آتے ہو تو ایک اپنی چرب زبانی سے اپنے غلط دعویٰ کو صحیح ثابت کر دیتا ہے۔ [3] الوزیر ابوالمظفر یحیٰ بن محمد بن ابن ھبیرۃ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاشراف علی مذاہب الاشراف'' میں سحر کے باب میں کہا ہے کہ اجماع ہے کہ جادو کی حقیقت ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کے قائل نہیں جادو کے سیکھنے والے اور اسے استعمال میں لانے والے کو امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تو کافر بتاتے ہیں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بعض شاگردوں کا قول ہے کہ اگر جادو کے بچاؤ کے لیے سیکھے تو کافر نہیں ہوتا ہاں جو اس کا اعتقاد رکھے اور نفع دینے والا سمجھے۔ وہ کافر ہے۔ اور اسی طرح جو یہ خیال کرتا ہے کہ شیاطین یہ کام کرتے ہیں اور اتنی قدرت رکھتے ہیں وہ بھی کافر ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جادوگر سے

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب النکاح: باب الخطبة (۵۱۴۶) و کتاب الطب: باب ان من البیان سحرا (۵۷۶۷) ابو داؤد: کتاب الادب: باب ما جاء فی المتشدق فی الکلام (۵۰۰۷) ترمذی: کتاب البر والصلة: باب ما جاء فی ان من البیان سحرا (۲۰۲۸)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب فرض الخمس: باب ما جاء فی بیوت ازواج النبی (۳۱۰۰) صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة: باب من فضائل عائشة (۲۴۴۳)]

[3] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب المظالم: باب اثم من خاصم فی باطل (۲۴۵۸)، (۲۶۸۰)، (۷۱۶۹) صحیح مسلم: کتاب الاقضیة: باب الحکم بالظاهر (۱۷۱۳) ابوداؤد: کتاب الاقضیة: باب فی قضاء القاضی اذا اخطا (۳۵۸۳) ابن ماجه: کتاب الاحکام: باب قضیة الحاکم لا تحل حراما (۲۳۱۷) ترمذی: کتاب الاحکام: باب ما جاء فی الشدید علی من یقضی له (۱۳۳۹) نسائی: کتاب آداب القضاء: باب الحکم بالظاهر (۸۱۷۶)]

دریافت کیا جائے اگر وہ بابل والوں کا سا عقیدہ رکھتا ہو اور سات سیارہ ستاروں کو تاثیر پیدا کرنے والا جانتا ہو تو کافر ہے اگر یہ نہ ہو تو بھی اگر جادو کو جائز جانتا ہو تو بھی کافر ہے امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہما کا قول یہ بھی ہے کہ جادوگر نے جب جادو کیا اور جادو کو استعمال میں لایا وہیں اسے قتل کر دیا جائے امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں جب تک بار بار نہ کرے یا کسی شخص معین کے بارے میں خود اقرار نہ کرے تب تک قتل نہ کیا جائے تینوں امام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ اس کا قتل بوجہ حد کے ہے مگر امام شافعی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ بوجہ قصاص کے ہے امام مالک، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہما اور ایک مشہور قول میں امام احمد رحمہ اللہ کا فرمان ہے کہ جادوگر سے توبہ بھی نہ کرائی جائے اس کی توبہ سے اس پر سے حد نہیں ہٹے گی اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس کی توبہ مقبول ہوگی۔ امام احمد رحمہ اللہ کا ہی صحیح قول ہے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ اہل کتاب کا جادوگر بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قتل کر دیا جائے گا لیکن تینوں اور اماموں کا مذہب اس کے برخلاف ہے لبید بن اعصم یہودی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اور آپ نے اس کے قتل کرنے کو نہیں فرمایا [1] اگر کوئی مسلمان عورت جادوگرنی ہو تو اس کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ قید کر دی جائے اور تینوں کہتے ہیں اسے بھی مرد کی طرح قتل کر دیا جائے واللہ اعلم۔

حضرت زہری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مسلمان جادوگر قتل کر دیا جائے اور مشرک قتل نہ کیا جائے۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر ذمی کے جادو سے کوئی مر جائے تو ذمی کو بھی مار ڈالنا چاہیے یہ بھی آپ سے مروی ہے کہ پہلے تو اسے کہا جائے توبہ کر اگر وہ کر لے اور اسلام قبول کرے تو خیر ورنہ قتل کر دیا جائے اور یہ بھی آپ سے مروی ہے کہ اگرچہ اسلام قبول کر لے تاہم قتل کر دیا جائے اس جادوگر کو جس کے جادو میں شرکیہ الفاظ ہوں اسے چاروں امام کافر کہتے ہیں کیونکہ قرآن میں ہے ﴿فَلَا تَكْفُرْ﴾ [2] امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب اس پر غلبہ پا لیا جائے پھر وہ توبہ کر لے تو توبہ قبول نہیں ہوگی جس طرح زندیق کی توبہ قبول نہیں ہوگی ہاں اس سے پہلے اگر توبہ کر لے تو قبول ہوگی اگر اس کے جادو سے کوئی مر گیا تو بہرصورت مارا جائے گا امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر وہ کہے کہ میں نے اس پر جادو مار ڈالنے کے لئے نہیں کیا تو قتل کی خطا کی دیت (جرمانہ) لے لیا جائے۔

جادوگر سے اس کے جادو کو اتروانے کی حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ نے اجازت دی ہے جیسے صحیح بخاری شریف میں ہے [3] عامر شعبی رحمہ اللہ بھی اس میں کوئی حرج نہیں بتلاتے لیکن خواجہ حسن بصری رحمہ اللہ اسے مکروہ بتلاتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ کیوں جادو کو افشاء نہیں کرتے؟ تو آپ نے فرمایا مجھے تو اللہ تعالیٰ نے شفا دے دی اور لوگوں پر برائی افشاء کرنے سے ڈرتا ہوں۔ [4] حضرت

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الطب: باب السحر (۵۷۶۳) صحیح مسلم: کتاب السلام: باب السحر (۲۱۸۹) ابن ماجہ: کتاب اللباس: باب السحر (۳۵۴۵)]

[2] [سورۃ البقرہ: آیت ۱۰۲]

[3] [صحیح: صحیح بخاری (تعلیقا): کتاب الطب: باب هل یستخرج السحر]

[4] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الطب: باب السحر (۵۷۶۶ـ ۳۱۷۵) مسلم: کتاب السلام: باب السحر (۲۱۸۹) ابن ماجہ: کتاب اللباس: باب السحر (۳۵۴۵) مسند احمد (۶۳/۶)]

وہب رحمہ اللہ فرماتے ہیں بیری کے سات پتے لے کرسل بٹے پر کوٹ لئے جائیں اور پانی ملا لیا جائے پھر آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کر دیا جائے اور جس پر جادو کیا گیا ہے اسے تین گھونٹ پلا دیا جائے اور باقی پانی سے غسل کرا دیا جائے انشاء اللہ جادو کا اثر جاتا رہے گا یہ عمل خصوصیت سے اس شخص کے لئے بہت ہی اچھا ہے جو اپنی بیوی سے روک دیا گیا ہو جادو کو دور کرنے اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے سب سے اعلیٰ چیز ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ (الفلق / ۱) اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ (الناس / ۱) کی سورتیں ہیں حدیث میں ہے ان جیسا کوئی تعویذ نہیں [۱] اسی طرح آیت الکرسی بھی شیطان کو دفع کرنے میں اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ [۲]

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۝۱۰۴ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ
عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيْمِ ۝۱۰۵

اے ایمان والو! تم راعنا نہ کہا کرو بلکہ انظرنا کہو یعنی ہماری طرف دیکھئے اور سنتے رہا کرو۔ ان کافروں کے لئے دردناک عذاب ہیں ○ نہ تو اہل کتاب کے کافر چاہتے ہیں نہ مشرکین چاہتے ہیں کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو (ان کے حسد کا کیا ہوا) اللہ جسے چاہے اپنی رحمت خصوصیت سے عطا فرمائے اللہ بڑے فضل والا ہے ○

کفار کی مشابہت سے اجتناب: اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو کافروں کی بول چال اور ان کے کاموں کی مشابہت سے روک رہا ہے یہودی بعض الفاظ زبان دبا کر بولتے تھے اور مطلب برا لیتے تھے جب انہیں یہ کہنا ہوتا کہ ہماری سنئے تو کہتے تھے رَاعِنَا اور مراد اس سے رعونت اور سرکشی لیتے تھے جیسے اور جگہ بیان ہے ﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ (النساء / ۴٦) الخ یعنی یہودیوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو باتوں کو اصلیت سے ہٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم سنتے ہیں لیکن مانتے نہیں اپنی زبانوں کو موڑ توڑ کر اس دین میں طعنہ زنی کے لئے ﴿رَاعِنَا﴾ کہتے ہیں اگر یہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مانا ہماری بات سنئے اور ہماری طرف توجہ کیجئے تو یہ ان کے لئے بہتر اور مناسب ہوتا لیکن ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے انہیں اپنی رحمت سے دور پھینک دیا ہے ان میں ایمان بہت ہی کم ہے۔

احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جب یہ لوگ سلام کرتے ہیں تو "اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" کہتے ہیں اور "سَامٌ" کے معنی موت کے ہیں تو تم ان کے جواب میں ﴿وَعَلَيْكُمْ﴾ کہا کرو [۳] ہماری دعا ان کے حق میں قبول ہوگی اور

---

[۱] [حسن صحیح: نسائی: کتاب الاستعاذہ: باب ما جآء فی سورة المعوذتین (۵۴٤۴)] شیخ البانیؒ نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔[صحیح نسائی (۵۰۷٦)]

[۲] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن: باب فضل سورة البقرہ (۵۰۱۰)]

[۳] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الاستیذان: باب کیف الرد علی اهل الزمة بالسلام (٦۲۵۷) صحیح مسلم: کتاب السلام: باب النهی عن ابتداء اهل الکتاب بالسلام (۲۱٦٤)]

ان کی بددعا ہمارے حق میں مقبول نہیں ہوگی [1] الغرض قول و فعل میں ان سے مشابہت کرنا منع ہے مسند احمد کی حدیث میں ہے میں قیامت کے قریب تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہوں میری روزی حق تعالیٰ نے میرے نیزے تلے رکھی ہے۔ اس کے لئے ذلت اور پستی ہے جو میرے احکام کے خلاف چلے اور جو شخص کسی (غیر مسلم) قوم سے مشابہت کرے وہ انہی میں سے ہے۔ [2] ابوداؤد میں بھی یہ پچھلا حصہ مروی ہے [3]

اس آیت اور حدیث سے ثابت ہوا کہ کفار کے اقوال و افعال لباس عید اور عبادت میں ان کی مشابہت کرنا جو ہمارے لئے مشروع اور مقرر نہیں سخت منع ہے ایسا کرنے والوں کو شریعت میں عذاب کی دھمکی سخت ڈراوا اور حرمت کی اطلاع دی گئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم قرآن کریم میں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ سنو تو کان لگادو اور دل سے متوجہ ہو جایا کرو کیونکہ یا تو کسی بھلائی کا حکم ہوگا یا کسی برائی سے ممانعت ہوگی حضرت خیثمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں تورات میں بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ﴿يَا أَيُّهَا الْمَسَاكِينُ﴾ فرمایا ہے لیکن امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾ کے معزز خطاب سے یاد فرمایا ہے ﴿رَاعِنَا﴾ کے معنی ہماری طرف کان لگانے کے ہیں بروزن "عَاطِنَا۔" [4] حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کے معنی خلاف کے بھی ہیں [5] یعنی خلاف نہ کہا کرو ان سے یہ بھی مروی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ آپ ہماری سنئے اور ہم آپ کی سنیں۔

انصار نے بھی یہی لفظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہنا شروع کر دیا تھا جس سے قرآن پاک نے انہیں روک دیا [6] حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں 'راعن' مذاق کی بات کو کہتے ہیں۔ یعنی تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں اور اسلام سے مذاق نہ کیا کرو۔ ابوصخر رحمہ اللہ کہتے ہیں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جانے لگتے تو جنہیں کوئی بات کہنی ہوتی وہ کہتے اپنا کان ادھر کیجئے اللہ تعالیٰ نے اس بے ادبی کے کلمہ سے روک دیا اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کرنے کی تعلیم فرمائی۔ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں رفاعہ بن زید یہودی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرتے ہوئے یہ لفظ کہا کرتا تھا مسلمانوں نے بھی یہ خیال کر کے کہ یہ لفظ ادب کے ہیں یہی لفظ استعمال کرنے شروع کر دئیے جس پر انہیں روک دیا گیا جیسے سورۂ نساء میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس کلمہ کو اللہ نے برا جانا اور اس کے استعمال سے مسلمانوں کو روک دیا جیسے حدیث میں آیا ہے کہ

---

[1] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب السلام : باب النھی عن ابتداء اھل الکتاب بالسلام (۲۱۶۶)]

[2] [حسن بالشواھد : مسند احمد (۲/۵۰-۹۲) ابن ابی شیبہ (۵/۳۱۳)] امام ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔ شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح الجامع الصغیر (۲۸۳۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اسے حسن کہتے ہیں۔]

[3] [حسن صحیح : ابو داؤد : کتاب اللباس : باب فی لبس الشھرۃ (۴۰۳۱) ابن ابی شیبہ (۵/۲۲)] شیخ البانیؒ نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ [ارواء الغلیل (۱۲۶۹)]

[4] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/۴۶۱)]

[5] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۱۸)]

[6] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۱۸)]

انگور کو کرم اور غلام کو عبد نہ کہو وغیرہ [1] اب اللہ تعالیٰ ان بد باطن لوگوں کے حسد و بغض کو بیان فرماتا ہے کہ اے مسلمانو! تمہیں جو اس کامل نبی ﷺ کے ذریعہ کامل شریعت ملی ہے اس سے یہ تو جل بھن رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ یہ تو اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عنایت فرمائے وہ بڑے ہی فضل و کرم والا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

جس آیت کو ہم منسوخ کر دیں یا بھلا دیں اس سے بہتر یا اس جیسی اور لاتے ہیں کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ○ کیا تجھے علم نہیں کہ زمین اور آسمان کا ملک اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی ولی اور مددگار نہیں۔ ○

احکام کے نسخ کا مقصد: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نسخ کے معنی بدل کے ہیں [2] مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں مٹانے کے معنی ہیں، [3] جو (کبھی) لکھنے میں باقی رہتی ہے اور حکم بدل جاتا ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے اور ابوالعالیہ اور محمد بن کعب قرظی رحمہم اللہ سے بھی اسی طرح مروی ہے [4] ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں بھلا دینے کے معنی ہیں۔ عطا رحمہ اللہ فرماتے ہیں چھوڑ دینے کے معنی ہیں سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں اٹھا لینے کے معنی ہیں جیسے آیت ﴿اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا الْبَتَّةَ﴾ [5] یعنی زانی مرد و عورت کو سنگسار کر دیا کرو اور جیسے آیت ﴿لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَابْتَغٰى لَهُمَا ثَالِثًا﴾ [6] یعنی ابن آدم کو اگر دو جنگل سونے کے مل جائیں جب بھی وہ تیسرے کی جستجو میں رہے گا۔ [7] امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ احکام میں تبدیلی ہم کر دیا کرتے ہیں حلال کو حرام حرام کو حلال جائز کو ناجائز، ناجائز کو جائز وغیرہ امر و نہی روک اور رخصت جائز اور ممنوع کاموں میں نسخ ہوتا ہے ہاں جو خبریں دی گئی ہیں واقعات بیان کئے گئے ہیں ان میں رد و بدل و ناسخ و منسوخ نہیں ہوتا۔

نسخ کے لفظی معنی نقل کرنے کے بھی ہیں جیسے کتاب کے ایک نسخے سے دوسرا نقل کر لینا۔ اسی طرح یہاں بھی چونکہ

---

[1] [**صحیح**: صحیح مسلم: کتاب الالفاظ من الادب: باب کراھة تسمیة العنب کرما (۲۲۴۸)، (۲۲۴۹) بخاری فی الادب المفرد (۷۹۵)]

[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/۴۷۳)] [3] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۲۱)]

[4] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۲۲)]

[5] [**صحیح**: نسائی فی السنن الکبریٰ (۷۱۴۵ ـ ۷۱۴۸) طبرانی کبیر (۸۶۷) السنن الکبریٰ للبیہقی (۱۷۳۶۷) تہذیب الآثار للطبری (۳/۲۵۸) سنن دارمی (۲۳۲۳) صحیح ابن حبان (۴۴۲۸) مسند احمد (۲۰۶۱۳) مسند بزار (۱/۷۱)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[صحیح ابن ماجہ (۲۰۶۷) ارواء الغلیل (۲۳۳۸) السلسلة الصحیحة (۲۹۱۳)]

[6] [**صحیح**: صحیح بخاری: کتاب الرقاق: باب ما یتقی من فتنه المال (۶۴۴۰)]

[7] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۲۴)]

ایک حکم کے بدلے دوسرا حکم ہوتا ہے اس لیے نسخ کہتے ہیں خواہ وہ حکم کا بدل جانا ہو خواہ الفاظ کا۔ علماء اصول کی عبارتیں اس مسئلہ میں گو مختلف ہیں مگر معنی کے لحاظ سے سب قریب قریب ایک ہی ہیں۔ نسخ کے معنی کسی حکم شرعی کا پچھلی دلیل کی رو سے ہٹ جانا ہے کبھی ہلکی چیز کے بدلے بھاری ہوتی ہے اور کبھی بھاری کے بدلہ ہلکی اور کبھی کوئی بدل ہی نہیں ہوتا رہے نسخ کے احکام اس کی قسمیں اس کی شرطیں وغیرہ ہیں سو اس کے لیے اس فن کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تفصیلات کی بسط کی جگہ نہیں طبرانی میں ایک روایت ہے کہ دو شخصوں نے نبی ﷺ سے ایک سورت یاد کی تھی اسے وہ پڑھتے رہے ایک مرتبہ رات کی نماز میں ہر چند اسے پڑھنا چاہا لیکن یاد نے ساتھ نہ دیا گھبرا کر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ سے اس کا ذکر کیا آپ نے فرمایا یہ منسوخ ہوگئی اور بھلا دی گئی دلوں میں سے نکال لی گئی تم غم نہ کرو بے فکر ہو جاؤ۔

حضرت زہری رحمہ اللہ نون خفیف پیش کے ساتھ پڑھتے تھے اس کے ایک راوی سلیمان بن ارقم ضعیف ہیں۔ [1] ابوبکر بن انباری رحمہ اللہ نے بھی دوسری سند سے اسے مرفوع روایت کیا ہے [2] جیسے قرطبی رحمہ اللہ کا کہنا ہے۔ "نُنْسِهَا" کو "نَنْسَأْهَا" بھی پڑھا گیا ہے۔ "نَنْسَأْهَا" کے معنی موخر کرنے پیچھے ہٹا دینے کے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں یعنی ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں منسوخ کرتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد کہتے ہیں یعنی ہم اس کے الفاظ کو باقی رکھتے ہیں لیکن حکم کو بدل دیتے ہیں۔ [3] عبد بن عمیر، مجاہد اور عطا رحمہم اللہ سے مروی ہے ہم اسے موخر کرتے ہیں اور ملتوی کرتے ہیں۔ عطیہ عوفی رحمہ اللہ کہتے ہیں یعنی منسوخ نہیں کرتے۔ [4]

سدی اور ربیع رحمہما اللہ بھی یہی کہتے ہیں ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں ناسخ کو منسوخ کے پیچھے رکھتے ہیں ابوالعالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں اپنے پاس اسے روک لیتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں "نَنْسَأْهَا" پڑھا اور اس کے معنی موخر ہونے کے بیان کیے "نُنْسِهَا" جب پڑھیں تو یہ مطلب ہوگا کہ ہم اسے بھلا دیں۔ اللہ تعالیٰ جس حکم کو اٹھا لینا چاہتا تھا وہ نبی ﷺ کو بھلا دیتا تھا اس طرح وہ آیت اٹھ جاتی تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ "نُنْسِهَا" پڑھتے تھے تو ان سے قاسم بن ربیعہ رحمہ اللہ نے کہا کہ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ تو "نَنْسَأْهَا" پڑھتے ہیں تو آپ نے فرمایا سعید بن مسیّب پر یا سعید کے خاندان پر تو قرآن نہیں اترا؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ﴾ (الاعلی/٦) ہم تجھے پڑھائیں گے جسے تو نہ بھولے گا اور فرماتا ہے ﴿وَاذْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ﴾ (الکہف/ ٢٤) جب بھول جائے رب کو یاد کر۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ علی رضی اللہ عنہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں اور ابی رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ اچھے قرآن کے قاری ہیں اور ہم ابی رضی اللہ عنہ کا قول چھوڑ دیتے ہیں اس لیے کہ ابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے تو جو کچھ رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے اسے نہیں چھوڑوں گا اور فرماتے ہیں ﴿مَا نَنْسَخْ﴾ (البقرہ/١٠٦) الخ یعنی ہم جو منسوخ کریں یا بھلا دیں اس سے بہتر لاتے ہیں یا اس جیسا (بخاری ومسند احمد) [5] اس سے بہتر ہوتا ہے یعنی بندوں کی سہولت اور ان کے آرام کے لحاظ سے یا اس جیسا ہوتا

---

[1] [مجمع الزوائد (١١٥٩٢)]
[2] [تفسیر قرطبی (٦٢/٢- ٦١٩)]
[3] [تفسیر ابن جریر الطبری (٤٧٣/٢)]
[4] [تفسیر ابن جریر الطبری (٤٧٧/٢)]
[5] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب التفسیر سورۃ البقرۃ: باب قولہ ما ننسخ من ایۃ (٤٤٨١)، (٥٠٠٥) مسند احمد (١١٣/٥)]

ہے لیکن مصلحت الٰہی اس سابقہ چیز میں ہوتی ہے۔
مخلوق میں تغیر وتبدیل کرنے والا پیدائش اور حکم کا اختیار رکھنے والا ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے جس طرح جسے چاہتا ہے بناتا ہے جسے چاہے نیک بختی دیتا ہے جسے چاہے بدبختی دیتا ہے جسے چاہے تندرستی جسے چاہے بیماری' جسے چاہے توفیق جسے چاہے بے نصیب کردے۔ بندوں میں جو حکم چاہے جاری کرے جسے چاہے حلال جسے چاہے حرام فرمادے جسے چاہے رخصت دے جسے چاہے روک دے وہ حاکم مطلق ہے جو چاہے احکام جاری فرمائے کوئی اس کے حکموں کو رد نہیں کرسکتا جو چاہے کرے کوئی اس سے باز پرس نہیں کرسکتا وہ بندوں کو آزماتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ نبیوں اور رسولوں کے کیسے تابعدار ہیں کسی چیز کا کسی مصلحت کی وجہ سے حکم دیا پھر مصلحت کی وجہ سے ہی اس کو ہٹادیا اب آزمائش ہوجاتی ہے نیک لوگ اس وقت بھی اطاعت کے لیے کمربستہ تھے اور اب بھی ہیں لیکن بد باطن لوگ باتیں بناتے ہیں اور ناک بھوں چڑھاتے ہیں حالانکہ تمام مخلوق کو اپنے خالق کی تمام باتیں ماننی چاہئیں اور ہر حال میں رسول ﷺ کی پیروی کرنی چاہیے اور جو وہ کہے اسے دل سے سچا ماننا چاہیے' جو حکم دے بجالانا چاہیے جس سے روکے رک جانا چاہیے۔
اس مقام پر بھی یہودیوں کا زبردست رد ہے اور ان کے کفر کا بیان ہے کہ وہ نسخ کے قائل نہ تھے بعض تو کہتے تھے اس میں عقلی محال لازم آتا ہے اور بعض نقلی محال بھی مانتے تھے اس آیت میں گو خطاب فخر عالم ﷺ کو ہے مگر دراصل یہ کلام یہودیوں کو سنانا ہے جو انجیل کو اور قرآن کو اس وجہ سے نہیں مانتے تھے کہ ان میں بعض احکام توراۃ کے منسوخ ہوگئے تھے اور اسی وجہ سے وہ ان نبیوں کی نبوت کے بھی منکر ہوگئے تھے اور صرف عناد وتکبر کی بنا تھی ورنہ عقلاً نسخ محال نہیں اس لیے کہ جس طرح وہ اپنے کاموں میں با اختیار رہے اسی طرح اپنے حکموں میں بھی با اختیار ہے جو چاہے اور جب چاہے پیدا کرے جسے چاہے اور جس طرح چاہے اور جس وقت چاہے رکھے۔ اسی طرح جو چاہے اور جس وقت چاہے حکم دے اس حاکموں کے حاکم کا حاکم کون؟ اسی طرح نقلاً بھی یہ ثابت شدہ امر ہے اگلی کتابوں اور پہلی شریعتوں میں موجود ہے۔
حضرت آدم علیہ السلام کی بیٹیاں بیٹے آپس میں بھائی بہن ہوتے تھے لیکن نکاح جائز تھا پھر اسے حرام کردیا نوح علیہ السلام جب کشتی سے اترتے ہیں تب تمام حیوانات کا کھانا حلال تھا لیکن پھر بعض کی حلت منسوخ ہوگئی دو بہنوں کا نکاح اسرائیل اور ان کی اولاد پر حلال تھا لیکن پھر توراۃ میں اور اس کے بعد حرام ہوگیا ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کی قربانی کا حکم دیا پھر قربان کرنے سے پہلے ہی منسوخ کردیا بنواسرائیل کو حکم دیا جاتا ہے کہ بچھڑا پوجنے میں جو شامل تھے سب اپنی جانوں کو قتل کرڈالیں لیکن پھر بہت سے باقی ہیں کہ یہ حکم منسوخ ہوجاتا ہے اسی طرح کے اور بہت سے واقعات موجود ہیں اور خود یہودیوں کو ان کا اقرار ہے لیکن پھر بھی قرآن اور نبی آخرالزمان ﷺ کو یہ کہہ کر نہیں مانتے کہ اس سے اللہ کے کلام میں نسخ لازم آتا ہے اور وہ محال ہے۔
بعض لوگ جو اس کے جواب میں لفظی بحثوں میں پڑجاتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ اس سے دلالت نہیں بدلتی اور مقصود وہی رہتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بشارت یہ لوگ اپنی کتابوں میں پاتے تھے آپ کی تابعداری کا حکم بھی دیکھتے تھے یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کی شریعت کے مطابق جو عمل نہ ہو وہ مقبول نہیں ہوگا یہ اور بات ہے کہ کوئی کہے کہ

اگلی شریعتیں صرف آپ کے آنے تک ہی تھیں اس لیے یہ شریعت ان کی ناسخ نہیں یا کہے کہ ناسخ ہے بہرصورت رسول مقبول ﷺ کی تابعداری کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے کہ آپ آخری کتاب اللہ کے پاس سے ابھی ابھی لے کر آئے ہیں پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نسخ کے جواز کو بیان فرما کر اس ملعون گروہ یہود کا رد کیا۔

سورۂ آل عمران میں بھی جس کے شروع میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے نسخ کے واقع ہونے کا ذکر موجود ہے فرماتا ہے ﴿كُلُّ الطَّعَامِ﴾ [1] الخ یعنی سبھی کھانے بنی اسرائیل پر حلال تھے مگر جس چیز کو حضرت اسرائیل علیہ السلام نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اس کی مزید تفسیر وہیں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ مسلمان کل کے کل متفق ہیں کہ احکام باری تعالیٰ میں نسخ کا ہونا جائز ہے بلکہ واقع بھی ہے اور پروردگار کی حکمت بالغہ کا دستور بھی یہی ہے ابومسلم اصبہانی مفسر نے لکھا ہے کہ قرآن میں نسخ واقع نہیں ہوتا لیکن اس کا یہ قول ضعیف اور مردود اور محض غلط اور جھوٹ ہے جہاں جہاں نسخ قرآن موجود ہے اس کے جواب میں گو بعض نے بہت محنت سے اس کی تردید کی ہے لیکن محض بے سود۔ دیکھئے پہلے اس عورت کی عدت جس کا خاوند مر جائے ایک سال تھی لیکن پھر چار مہینے دس دن ہوئی۔ اور دونوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں قبلہ پہلے بیت المقدس تھا۔ پھر کعبۃ اللہ ہوا۔ اور دوسری آیت صاف اور پہلا حکم بھی ضمناً مذکور ہے پہلے مسلمانوں کو حکم تھا کہ ایک ایک مسلمان دس دس کافروں سے لڑے اور ان کے مقابلے سے نہ ہٹے لیکن یہ پھر حکم منسوخ ہو کر دو دو کے مقابلہ میں صبر کرنے کا حکم ہوا اور دونوں آیتیں کلام اللہ میں موجود ہیں پہلے حکم تھا کہ نبی ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو پھر یہ حکم منسوخ ہوا اور دونوں آیتیں قرآن کریم میں موجود ہیں وغیرہ وغیرہ واللہ اعلم۔

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ
بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۱۰۸

کیا تم اپنے رسول سے وہی پوچھنا چاہتے ہو جو اس سے پہلے موسیٰ سے پوچھا گیا تھا (سنو) ایمان کو کفر سے بدلنے والا سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے ○

کثرت سوال ایک مذموم فعل: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو روکتے ہوئے فرماتا ہے کہ کسی واقعہ کے ہونے سے پہلے میرے نبی سے فضول سوال نہ کیا کرو۔ یہ کثرت سوال کی عادت بہت بری ہے۔ جیسے اور جگہ ارشاد ہے ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَاۗءَ﴾ (المائدہ/ ۱۰۱) الخ ایمان والو! ان چیزوں کا سوال نہ کیا کرو جو اگر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں برا لگے گا اور اگر تم قرآن کے نازل ہونے کے زمانہ میں ایسے سوالوں کا سلسلہ جاری رکھو گے تو یہ باتیں ظاہر کردی جائیں گی۔ کسی بات کے واقع ہونے سے پہلے اس کی نسبت سوال کرنے میں خوف یہ ہے کہ کہیں اس سوال کی وجہ سے وہ حرام نہ ہو جائیں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جو اس چیز کے بارے میں سوال کرے جو حرام نہ تھی پھر اس کے سوال سے

---

[1] [سورۃ آل عمران : آیت ۹۳]

حرام ہوگئی [1] ایک مرتبہ حضور ﷺ سے سوال کیا گیا کہ "ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ غیر مرد کو پائے تو کیا کرے؟ اگر لوگوں کو خبر کرے تو یہ بھی بے شرمی کی بات ہے اور اگر چپ ہو جائے تو بڑی بے غیرتی کی بات ہے؟ حضور ﷺ کو یہ سوال بہت برا معلوم ہوا آخر اسی شخص کو ایسا واقعہ پیش آیا اور لعان کا حکم نازل ہوا۔ [2] صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ فضول بکواس سے' مال کو ضائع کرنے اور زیادہ پوچھ گچھ سے منع فرمایا کرتے تھے۔ [3] صحیح مسلم میں ہے میں جب تک کچھ نہ کہوں' تم بھی نہ پوچھو تم سے پہلے لوگوں کو اسی بدخصلت نے ہلاک کر دیا کہ وہ بکثرت سوال کرتے تھے اور اپنے نبیوں کے سامنے اختلاف کرتے تھے۔ جب میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اپنی طاقت کے مطابق بجالاؤ اور اگر منع کروں تو ترک جایا کرو۔ یہ آپ نے اس وقت فرمایا تھا جب لوگوں کو خبر دی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے تو کسی نے کہا حضور ﷺ ہر سال؟ آپ ﷺ خاموش ہو گئے اس نے پھر پوچھا آپ نے کوئی جواب نہ دیا اس نے تیسری دفعہ پھر یہی سوال کیا آپ نے فرمایا ہر سال نہیں لیکن اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا اور پھر تم کبھی بھی اس حکم کو بجا نہ لا سکتے [4] پھر آپ ﷺ نے مندرجہ بالا فرمان ارشاد فرمایا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب ہمیں آپ ﷺ سے سوال کرنے سے روک دیا گیا تو ہم حضور ﷺ سے پوچھنے میں ہیبت کھاتے تھے چاہتے تھے کہ کوئی بادیہ نشین ناواقف شخص آ جائے وہ پوچھے تو ہم بھی سن لیں۔ [5] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں کوئی سوال حضور ﷺ سے کرنا چاہتا تھا تو سال سال بھر گذر جاتا تھا کہ مارے ہیبت کے پوچھنے کی جرات نہیں ہوتی تھی ہم تو خواہش رکھتے تھے کہ کوئی اعرابی آئے اور حضور ﷺ سے سوال کر بیٹھے پھر ہم بھی سن لیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اصحاب محمد ﷺ سے بہتر کوئی جماعت نہیں انہوں نے حضور ﷺ سے صرف بارہ ہی مسئلہ پوچھے جو سب سوال مع جواب کے قرآن پاک میں مذکور ہیں جیسے شراب وغیرہ کا سوال حرمت والے مہینوں کی بابت سوال' یتیموں کی بابت سوال وغیرہ وغیرہ۔

یہاں پر "ام" یا "تو بل" کے معنی میں ہے یا اپنے اصلی معنی میں ہے یعنی سوال کے بارے میں جو یہاں پر انکاری ہے یہ حکم مومن کا فرسب کو ہے کیونکہ حضور ﷺ کی رسالت سب کی طرف تھی قرآن میں اور جگہ ہے

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری : کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة : باب ما یکره من کثرة السوال (۷۲۸۹) صحیح مسلم : کتاب الفضائل (۲۳۵۸) مسند احمد (۱/۱۷۶)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری : کتاب الطلاق : باب من جوز الطلاق الثلاث (۵۲۵۹) صحیح مسلم : کتاب اللعان (۱۴۹۲) مسند احمد (۵/۳۳۶-۳۳۷)]

[3] [صحیح: صحیح بخاری : کتاب الاستقراض : باب ما ینهی عن اضاعة المال (۲۴۰۸) صحیح مسلم : کتاب الاقضیة : باب النهی عن کثرة المسائل (۵۹۳)]

[4] [صحیح: صحیح مسلم : کتاب الحج : باب فرض الحج مرة فی العمر (۱۳۳۷) صحیح بخاری : کتاب الاعتصام : باب الاقتداء بسنن رسول اللہ ﷺ (۷۳۸۸) نسائی : کتاب مناسك الحج : باب وجوب الحج (۲۶۲۰) مسند احمد (۲/۴۴۷ ـ ۴۵۷)]

[5] [صحیح: صحیح مسلم : کتاب الایمان : باب السوال من ارکان الاسلام (۱۲)]

﴿یَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ﴾ (النساء/ ۱۵۳) الخ اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر کوئی آسمانی کتاب اتارے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا کہ اللہ کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں جس ظلم کی وجہ سے انہیں ایک تند و تیز آواز سے ہلاک کر دیا گیا۔ رافع بن حریملہ اور وہب بن زید نے کہا تھا کہ یارسول اللہ ﷺ کوئی آسمانی کتاب ہم پر نازل کیجیے جسے ہم پڑھیں اور ہمارے شہروں میں دریا جاری کر دیں تو ہم آپ کو مان لیں اس پر یہ آیت اتری۔ (۱)

ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے کہا یارسول اللہ ﷺ کاش کہ ہمارے گناہوں کا کفارہ بھی اسی طرح ہو جاتا جس طرح بنی اسرائیل کے گناہوں کا کفارہ تھا آپ نے یہ سنتے ہی تین دفعہ جناب باری تعالیٰ میں عرض کی کہ ''نہیں اللہ نہیں'' ہم یہ نہیں چاہتے پھر فرمایا سنو بنو اسرائیل میں سے جہاں کوئی گناہ کرتا اس کے دروازے پر قدرتاً لکھا ہوا پایا جاتا اور ساتھ ہی اس کا کفارہ بھی لکھا ہوا ہوتا تھا اب یا تو دنیا کی رسوائی کو منظور کر کے کفارہ ادا کر دے اور اپنے پوشیدہ گناہوں کو ظاہر کرے یا کفارہ نہ دے اور آخرت کی رسوائی منظور کرے لیکن تم سے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ (النساء/ ۱۱۰) یعنی جس سے کوئی برا کام ہو جائے یا وہ اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے پھر استغفار کرے تو وہ اللہ کو بہت بڑا بخشش اور مہربانی کرنے والا پائے گا۔ اسی طرح ایک نماز دوسری نماز تک گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے پھر جمعہ دوسرے جمعہ تک کا کفارہ ہو جاتا ہے (۲) سنو جو شخص برائی کا ارادہ کرے لیکن برائی نہ کرے تو برائی لکھی نہیں جاتی اور اگر کر گذرے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے اور اگر بھلائی کا ارادہ کرے پھر گو نہ کرے لیکن بھلائی لکھ لی جاتی ہے اور اگر کر بھی لے تو دس بھلائیاں لکھی جاتی ہیں اب بتاؤ تم اچھے رہے یا بنی اسرائیل؟ تم بنی اسرائیل سے بہت ہی اچھے ہو ہاں باوجود اتنے کرم اور رحم کے پھر بھی کوئی ہلاک ہو تو سمجھو کہ یہ خود ہلاک ہونے والا ہی تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۳)

قریشیوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ اگر صفا پہاڑ سونے کا ہو جائے تو ہم ایمان لاتے ہیں آپ نے فرمایا اچھا لیکن پھر مائدہ (آسمانی دستر خوان) مانگنے والوں کا جو انجام ہوا وہی تمہارا بھی ہوگا اس پر وہ انکاری ہو گئے اور اپنے سوال کو چھوڑ دیا (۴) مراد یہ ہے کہ تکبر، عناد، سرکشی کے ساتھ نبیوں سے سوال کرنا نہایت مذموم حرکت ہے جو کفر کو ایمان کے بدلے مول لے اور آسانی کو سختی سے بدلے وہ سیدھی راہ سے ہٹ کر جہالت و ضلالت میں گر جاتا ہے اسی طرح غیر ضروری سوال کرنے والا بھی جیسے اور جگہ ہے ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا﴾ (ابراھیم/ ۲۸۔۲۹) الخ کیا تو نے انہیں نہیں دیکھا جو اللہ کی نعمت کو کفر سے بدلتے ہیں اور اپنی قوم کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں وہ جہنم میں داخل ہوں گے اور وہ بڑی بری قرار گاہ ہے۔

---

(۱) [تفسیر ابن جریر الطبری (۲/ ٤٩٠)]

(۲) [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الطهارة: باب الصلوات الخمس والجمعة (۲۳۳)]

(۳) [مرسل وضعیف: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۷۸٦)]

(٤) [مرسل وضعیف: تفسیر ابن جریر الطبری (۱۷۸۳ ۔ ۱۷۸٤)]

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

ان اہل کتاب کے اکثر لوگ باوجود حق کھل جانے کے محض حسد و بغض کی بنا پر تمہیں بھی ایمان سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔ تم بھی معاف کرو اور چھوڑو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ○ تم نمازیں قائم رکھو زکوٰۃ دیتے رہا کرو اور جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے سب کچھ اللہ کے پاس پالو گے اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے ○

قومی عصبیت باعث شقاوت: ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حیی بن اخطب اور ابو یاسر بن اخطب یہ دونوں یہودی سب سے زیادہ مسلمانوں کے حاسد تھے لوگوں کو اسلام سے روکتے تھے اور عربوں سے جلتے تھے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی کعب بن اشرف کا بھی یہ شغل تھا زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے یہ بھی یہودی تھا اور اپنے شعروں میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کیا کرتا تھا [1] گو ان کی کتاب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق موجود تھی اور یہ بخوبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفتیں جانتے تھے اور آپ کو اچھی طرح پہچانتے تھے پھر یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ قرآن ان کی کتاب کی تصدیق کر رہا ہے ایک امی اور ان پڑھ وہ کتاب پڑھتا ہے جو سراسر معجزہ ہے لیکن صرف حسد کی بنا پر کہ عرب میں آپ کیوں مبعوث ہوئے کفر و انکار پر آمادہ ہو گئے بلکہ اور لوگوں کو بھی بہکانا شروع کر دیا پس اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو حکم دیا کہ تم درگذر کرتے رہو اور اللہ کے حکم کا اور اس کے فیصلے کا انتظار کرو۔ جیسے اور جگہ فرمایا تمہیں مشرکوں اور اہل کتاب سے بہت کڑوی باتیں سننی پڑیں گی مگر بعد میں حکم نازل فرما دیا کہ ان مشرکین سے اب دب کر نہ رہو ان سے لڑائی کرنے کی تمہیں اجازت ہے۔ [2]

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب مشرکین اور اہل کتاب سے درگذر کرتے تھے اور ان کی ایذاء اور تکلیف سہتے تھے اور اس آیت پر عمل پیرا تھے یہاں تک کہ دوسری آیتیں اتریں اور یہ حکم ہٹ گیا اب ان سے بدلہ لینے اور اپنا بچاؤ کرنے کا حکم ملا اور پہلی ہی لڑائی جو بدر کے میدان میں ہوئی اس میں کفار کو شکست فاش ہوئی اور ان کے بڑے بڑے سرداروں کی لاشیں میدان میں بچھ گئیں [3] پھر مومنوں کو رغبت دلائی جاتی ہے کہ تم نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کی حفاظت کرو یہ تمہیں آخرت کے عذابوں سے بچانے کے علاوہ دنیا میں بھی غلبہ اور نصرت دے گی۔

پھر فرمایا کہ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہر نیک و بد عمل کا بدلہ دونوں جہان میں دے گا اس سے کوئی چھوٹا، بڑا، چھپا، کھلا، اچھا، برا عمل پوشیدہ نہیں یہ اس لیے فرمایا کہ لوگ اطاعت کی طرف توجہ کریں اور نافرمانی سے بچیں۔ "مُبْصِر" کے بدلے "بَصِیْر" کہا جیسے "مُبْدِع" کے بدلے "بَدِیْع" اور "مُؤْلِم" کے بدلے

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۳۳۱/۱)] [2] [سورۃ التوبۃ: آیت ۵]

[3] [تفسیر ابن ابی حاتم (۳۳۳/۱)]

"اَلِیْمِ۔" ابن ابی حاتم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت میں ﴿سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ﴾ پڑھتے تھے اور فرماتے تھے اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ (1)

وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ
هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ
مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۳ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ
لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ
يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

یہ کہتے ہیں کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا اور کوئی نہ جائے گا' یہ صرف ان کی امنگیں ہیں' ان سے کہو کہ اگر تم سچے ہو تو کوئی دلیل تو پیش کرو○ سنو جو بھی اپنے آپ کو خلوص کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکا دے بے شک اسے اس کا رب پورا بدلہ دے گا اس پر نہ تو کوئی خوف ہوگا نہ غم اور نہ اداسی○ یہود کہتے ہیں کہ نصرانی حق پر نہیں اور نصرانی کہتے ہیں کہ یہود نہیں۔ حالانکہ یہ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اسی طرح ان ہی جیسی بات بے علم بھی کہتے ہیں قیامت کے دن اللہ ان کے اس اختلاف کا فیصلہ ان میں کر دے گا○

شیطان صفت یہودی: یہاں پر یہودیوں اور نصرانیوں کے غرور کا بیان ہو رہا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کو کچھ بھی نہیں سمجھتے اور صاف کہتے ہیں کہ ہمارے سوا جنت میں کوئی نہیں جائے گا سورۂ مائدہ میں ان کا ایک قول یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں (2) جس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ پھر تم پر قیامت کے دن عذاب کیوں ہوگا؟ اسی طرح کے مفہوم کا بیان پہلے بھی گذرا ہے کہ ان کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ ہم چند دن جہنم میں رہیں گے جس کے جواب میں ارشاد باری ہوا کہ یہ دعویٰ بھی محض بے دلیل ہے اسی طرح یہاں ان کے ایک دعویٰ کی تردید کی اور کہا کہ لاؤ دلیل پیش کرو' انہیں عاجز ثابت کر کے پھر فرمایا کہ ہاں جو کوئی بھی اللہ کا فرمانبردار ہو جائے اور خلوص و توحید کے ساتھ نیک عمل کرے اسے پورا پورا اجر و ثواب ملے گا' جیسے اور جگہ فرمایا کہ یہ اگر جھگڑیں تو ان سے کہہ دو کہ میں اور میرے ماننے والوں نے اپنے چہرے اللہ کے سامنے متوجہ کر دیئے ہیں۔ (3) غرض یہ ہے کہ اخلاص اور مطابقت سنت ہر عمل کی قبولیت کے لیے شرط ہے تو ﴿اَسْلَمَ وَجْهَهٗ﴾ سے مراد خلوص (4) اور ﴿وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ سے مراد اتباع سنت ہے نرا خلوص بھی عمل کو مقبول نہیں کرا سکتا جب تک سنت کی تابعداری نہ ہو حدیث شریف میں ہے جو شخص ایسا عمل کرے جس پر ہمارا حکم نہ ہو وہ مردود ہے۔ (مسلم) (5)

پس رہبانیت کا عمل گو خلوص پر مبنی ہو لیکن تاہم اتباع سنت نہ ہونے کی وجہ سے وہ مردود ہے ایسے ہی اعمال کی

---

(1) [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۳۶)] (2) [سورة المائدة : آیت ۱۸]
(3) [سورة آل عمران : آیت ۲۰] (4) [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۳۷۱)]
(5) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الاقضية : باب نقض الاحكام الباطلة (۱۷۱۸)]

نسبت قرآن حکیم کا ارشاد ہے ﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا﴾ (الفرقان / ۲۳) یعنی انہوں نے جو اعمال کیے تھے ہم نے سب رد کر دیئے دوسری جگہ فرمایا کافروں کے اعمال ریت کے چمکیلے تودوں کی طرح ہیں جنہیں پیاسا پانی سمجھتا ہے لیکن جب اس کے پاس جاتا ہے تو کچھ نہیں پاتا [1] اور جگہ ہے کہ قیامت کے دن بہت سے چہروں پر ذلت برستی ہو گی جو عمل کرنے والے تکلیفیں اٹھانے والے ہوں گے اور بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور گرم کھولتا ہوا پانی انہیں پلایا جائے گا۔ [2] حضرت امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں مراد یہود و نصاریٰ کے علماء اور عابد لیے ہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ کوئی عمل گو بظاہر سنت کے مطابق ہو لیکن عمل میں اخلاص نہ ہو مقصود اللہ کی خوشنودی نہ ہو تو وہ عمل بھی مردود ہے ریاکار اور منافق لوگوں کے اعمال کا بھی یہی حال ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ منافق اللہ کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ انہیں دھوکہ دیتا ہے اور نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں صرف لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرتے ہیں اور اللہ کا ذکر بہت ہی کم کرتے ہیں [3] اور فرمایا ﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ﴾ (الماعون / ٤-٧) الخ ان نمازیوں کے لیے ویل ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی روکتے پھرتے ہیں اور جگہ ارشاد ہے ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا﴾ (الکھف/ ۱۱۰) الخ جو شخص اپنے رب کی ملاقات کا آرزومند ہو اسے نیک عمل کرنا چاہیے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا چاہیے پھر فرمایا انہیں ان کا رب اجر دے گا اور ڈر خوف سے بچائے گا آخرت میں انہیں ڈر نہیں اور دنیا کے چھوڑنے کا ملال نہیں۔ پھر یہود و نصاریٰ کی آپس کی بغض و عداوت کا ذکر فرمایا۔

نجران کے نصرانیوں کا وفد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو ان کے پاس یہودیوں کے علماء بھی آئے اس وقت ان لوگوں نے انہیں اور انہوں نے ان کو گمراہ بتایا حالانکہ دونوں اہل کتاب ہیں توراۃ میں انجیل کی تصدیق اور انجیل میں توراۃ کی تصدیق موجود ہے پھر ان کا یہ قول کس قدر لغو ہے' اگلے یہود و نصاریٰ دین حق پر قائم تھے لیکن پھر بدعتوں اور فتنہ پردازیوں کی وجہ سے دین ان سے چھن گیا اب نہ یہود ہدایت پر تھے نہ نصرانی۔ پھر فرمایا کہ نہ جاننے والوں نے بھی اسی طرح کہا اس میں بھی اشارہ انہی کی طرف ہے اور بعض نے کہا مراد اس سے یہود و نصاریٰ سے پہلے کے لوگ ہیں۔ بعض کہتے ہیں عرب لوگ مراد ہیں امام ابن جریر رحمہ اللہ اس سے عام لوگ مراد لیتے ہیں گویا سب شامل ہیں اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ واللہ اعلم۔ پھر فرمایا کہ اختلاف کا فیصلہ قیامت کو خود اللہ تعالیٰ کرے گا جس دن کوئی ظلم وزور نہیں ہو گا اور یہی مضمون دوسری جگہ بھی آیا ہے سورۂ حج میں ارشاد ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ﴾ (الحج ۱۷) (پوری آیت) یعنی مومنوں اور یہودیوں اور صابیوں اور نصرانیوں اور مجوسیوں اور مشرکوں میں قیامت کے دن اللہ فیصلہ فرمائے گا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ اور موجود ہے اور جگہ ارشاد ہے ﴿قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا﴾ (السبا/۲٦) کہہ دے کہ ہمارا رب ہمیں جمع کرے گا پھر حق کے ساتھ فیصلے کرے گا وہ باخبر فیصلے کرنے والا ہے۔

---

[1] [سورۃ النور : آیت ۳۹] [2] [سورۃ الغاشیۃ : آیت ۲-۵]

[3] [سورۃ النسآء : آیت ۱٤۲]

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر کیے جانے کو روکے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے ایسے لوگوں کو خوف کھاتے ہوئے ہی ان میں جانا چاہیے۔ ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بڑے بڑے عذاب ہیں ○

اللہ کی مساجد سے روکنے والے: اس آیت کی تفسیر میں دو قول ہیں ایک تو یہ کہ اس سے مراد نصاریٰ ہیں دوسرا یہ کہ اس سے مراد مشرکین ہیں نصرانی بھی بیت المقدس کی مسجد میں پلیدی ڈال دیتے تھے اور لوگوں کو اس میں نماز ادا کرنے سے روکتے تھے، بخت نصر نے جب بیت المقدس کی بربادی کے لیے چڑھائی کی تھی تو ان نصرانیوں نے اس کا ساتھ دیا تھا اور مدد کی تھی، بخت نصر بابل کا رہنے والا مجوسی تھا اور یہودیوں کی دشمنی پر نصرانیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا اور اس لیے بھی کہ بنی اسرائیل نے حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کو قتل کرڈالا تھا اور مشرکین نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیبیہ والے سال کعبۃ اللہ سے روکا تھا یہاں تک کہ ذی طویٰ میں آپ کو قربانیاں کر دینا پڑیں، اور مشرکین سے صلح کرنے کے بعد آپ وہیں سے واپس آ گئے حالانکہ یہ امن کی جگہ تھی باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی یہاں کوئی نہیں چھیڑتا تھا اور اس کے اجاڑنے کی کوشش یہی تھی کہ ذکر اللہ اور حج وعمرہ کرنے والی مسلم جماعت کو روک دیں [1] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلے قول کو پسند فرمایا ہے اور کہا ہے کہ مشرکین کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کی سعی نہیں کرتے تھے یہ سعی نصاریٰ کی تھی کہ وہ بیت المقدس کی ویرانی کے درپے ہو گئے تھے۔ لیکن حقیقت میں دوسرا قول زیادہ صحیح ہے ابن زید رحمہ اللہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے اور اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہیے کہ جب نصرانیوں نے یہودیوں کو بیت المقدس سے روکا تھا اس وقت یہودی بھی محض بے دین ہو چکے تھے ان پر تو حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبانی لعنتیں نازل ہو چکی تھیں وہ نافرمان اور حد سے متجاوز ہو چکے تھے اور نصرانی حضرت مسیح کے دین پر تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد مشرکین مکہ ہیں اور یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اوپر یہود ونصاریٰ کی مذمت بیان ہوئی تھی اور یہاں مشرکین عرب کی اس بدخصلت کا بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں رضی اللہ عنہم کو مسجد الحرام سے روکا مکہ سے نکالا پھر حج وغیرہ سے بھی روک دیا۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ فرمان کہ مکہ والے بیت اللہ کی ویرانی میں کوشاں نہ تھے اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو وہاں سے روکنے اور نکال دینے اور بیت اللہ میں بت بٹھا دینے سے بڑھ کر اس کی ویرانی کیا ہو سکتی ہے؟ خود قرآن میں موجود ہے ﴿وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (الانفال/ ٣٤) اور جگہ فرمایا ﴿مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا﴾ [2] الخ یعنی یہ لوگ مسجد حرام سے روکتے

---

[1] [تفسیر ابن جریر الطبری (٢/ ٥٢١)] [2] [سورۃ التوبہ: آیت ١٧]

ہیں مشرکوں سے اللہ کی مسجدیں آباد نہیں ہوسکتیں جو اپنے کفر کے خود گواہ ہیں جن کے اعمال غارت ہیں اور جو ہمیشہ کے لیے جہنمی ہیں مسجدوں کی آبادی ان لوگوں سے ہوتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے اور نماز زکوۃ کے پابند اور صرف اللہ ہی سے ڈرنے والے ہیں یہی لوگ راہ راست والے ہیں اور جگہ فرمایا ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (الفتح/ ۲۵) الخ ان لوگوں نے کفر بھی کیا اور تمہیں مسجد حرام سے بھی روکا اور قربانیوں کو ان کے ذبح ہونے کی جگہ تک نہ پہنچنے دیا اگر ہمیں ان مومن مردوں اور عورتوں کا خیال نہ ہوتا جو اپنی ضعیفی اور کم قوتی کے باعث مکہ سے نہیں نکل سکے۔ جنہیں تم جانتے بھی نہیں ہو تو ہم تمہیں ان سے لڑ کر ان کے غارت کر دینے کا حکم دے دیتے لیکن یہ بے گناہ مسلمان پیس نہ دیئے جائیں اس لیے ہم نے سر دست یہ حکم نہیں دیا لیکن یہ کفار اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو وہ وقت دور نہیں جب ان پر ہمارے دردناک عذاب برس پڑیں۔ پس جب وہ مسلمان ہستیاں جن سے مسجدوں کی آبادی حقیقی معنی میں ہے وہ ہی روک دیئے گئے تو مسجدوں کے اجاڑنے میں کون سی کمی رہ گئی؟ مسجدوں کی آبادی صرف ظاہری زیب وزینت رنگ وروغن سے نہیں ہوتی بلکہ اس میں ذکر اللہ کا ہونا اس میں شریعت کا قائم رہنا اور شرک اور ظاہری میل کچیل سے پاک رکھنا یہ ان کی حقیقی آبادی ہے۔

پھر فرمایا کہ انہیں لائق نہیں کہ بے خوف ہو کر یہ مسجد میں آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو انہیں بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ بیت اللہ میں نہ آنے دو ہم تمہیں غالب کر دیں گے اس وقت یہی کرنا چنانچہ جب مکہ فتح ہو گیا اگلے سال ۹ ہجری میں اعلان کرادیا کہ اس سال کے بعد حج میں کوئی مشرک نہ آنے پائے اور بیت اللہ شریف کا طواف کوئی ننگا ہو کر نہ کرے جن لوگوں کے درمیان صلح کی کوئی مدت مقرر ہوئی ہے وہ قائم ہے [1] یہ حکم دراصل تصدیق اور عمل ہے اس آیت پر ﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ (التوبة/ ۲۸) یعنی مشرک لوگ نجس ہیں اس سال کے بعد انہیں مسجد حرام میں نہ آنے دو اور یہ معنی بھی بیان کیے گئے ہیں کہ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ مشرک کانپتے اور خوف زدہ مسجد میں آئیں لیکن برخلاف اس کے الٹے یہ مسلمانوں کو روک رہے ہیں یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایمانداروں کو بشارت دیتا ہے کہ عنقریب میں تمہیں غلبہ دوں گا اور یہ مشرک اس مسجد کی طرف رخ کرنے سے بھی کپکپانے لگیں گے چنانچہ یہی ہوا اور حضور علیہ السلام نے وصیت کی کہ جزیرہ عرب میں دو دین باقی نہ رہنے پائیں اور یہود ونصاریٰ کو وہاں سے نکال دیا جائے [2] الحمد للہ کہ اس امت کے بزرگوں نے اس وصیت رسول ﷺ پر عمل بھی کر دکھایا اس سے مسجدوں کی فضیلت اور بزرگی بھی ثابت ہوئی بالخصوص اس جگہ کی اور مسجد کی جہاں سب سے بڑے اور کل جن وانس کے رسول محمد ﷺ بھیجے گئے تھے۔ ان کفار پر دنیا کی رسوائی بھی آئی، جس طرح انہوں نے

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: كتاب الصلوة: باب ما يستر من العورة (۳۶۹) صحيح مسلم: كتاب الحج: باب لا يحج البيت مشرك (۱۳۴۷) نسائی: كتاب المناسك: باب قوله عزوجل خذوا زينتكم عند كل مسجد (۲۹۶) ترمذی: كتاب الحج: باب ما جاء في كراهية الطواف عريانا (۸۷۱) ابو يعلى (۴۵۲) بيهقى (۲۰۷/۹) حميدى (۴۸) دارمی (۱۹۱۹)]

[2] [مرسل: مؤطا: كتاب الجامع: باب ما جاء في اجلاء ايهود من المدينة (۱۷-۱۸)، (۸۹۲/۲)]

مسلمانوں کو روکا جلاوطن کیا ٹھیک اس کا پورا بدلہ انہیں ملا یہ بھی روکے گئے' اور جلاوطن کیے گئے اور ابھی اخروی عذاب باقی ہیں کیونکہ انہوں نے بیت اللہ شریف کی حرمت توڑی وہاں بت بٹھائے غیر اللہ سے دعائیں اور مناجات شروع کر دیں۔ ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا وغیرہ اور اگر اس سے مراد نصرانی لیے جائیں تو بھی ظاہر ہے کہ وہ بھی بیت المقدس کی مسجد میں ڈرتے ہوئے جاتے ہیں' انہوں نے بھی مسجد بیت المقدس کی بے حرمتی کی تھی' بالخصوص اس صخرہ (پتھر) کی جس کی طرف یہود نماز پڑھتے تھے' اسی طرح جب یہودیوں نے بھی نصرانیوں کی بہت زیادہ ہتک کی تو ان پر ذلت بھی اس وجہ سے زیادہ نازل ہوئی دنیا کی رسوائی سے مراد امام مہدی علیہ السلام کے زمانہ کی رسوائی بھی ہے اور جزیہ کی ادائیگی بھی ہے حدیث شریف میں ایک دعا وارد ہوئی ہے ﴿اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْاُمُوْرِ كُلِّهَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَةِ﴾ اے اللہ تو ہمارے تمام کاموں کا انجام اچھا کر اور دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے نجات دے۔ [1] یہ حدیث حسن ہے مسند احمد میں موجود ہے صحاح ستہ میں نہیں اس کے راوی بسر بن ارطاۃ صحابی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان سے ایک تو یہ حدیث مروی ہے دوسری وہ حدیث مروی ہے جس میں ہے کہ غزوے اور جنگ کے موقعہ پر وہیں ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔ [2]

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

اور مشرق و مغرب کا مالک اللہ ہی ہے تم جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا منہ ہے اللہ تعالیٰ کشادگی اور سمائی والا اور بڑے علم والا ہے ○

کعبہ صرف ایک سمت: اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ان اصحاب رضی اللہ عنہم کو تسلی دی جارہی ہے کہ جو مکہ سے نکالے گئے اور اپنی مسجد سے روکے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ شریف میں نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھتے تھے تو کعبۃ اللہ بھی سامنے ہی ہوتا تھا جب مدینہ تشریف لائے تو سولہ سترہ ماہ تک تو ادھر ہی نماز پڑھتے رہے مگر پھر اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا [3] امام ابوعبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ناسخ منسوخ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت وارد کی ہے کہ قرآن میں سب سے پہلا منسوخ حکم یہی قبلہ کا حکم ہے ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ﴾ والی

---

[1] [**ضعیف**: مسند احمد (٤/ ١٨١) ابن حبان (الموارد۔ ٩٤٩) طبرانی کبیر (٢/ ٣٣)، (١١٩٧) حاکم (٣/ ٥٩١) بخاری فی التاریخ الکبیر (١/ ٣٠) ابن عدی فی الکامل (٢/ ٤٣٨)] امام ہیثمی نے فرمایا ہے کہ احمد کے راوی ثقہ ہیں۔[مجمع الزوائد (١٠/ ١٧٨) شیخ البانی نے اسے ضعیف کہا ہے۔[السلسلة الضعيفة (٢٩٠٧) ضعيف الجامع الصغير (١١٦٩)]

[2] [**صحیح**: ابوداؤد: كتاب الحدود: باب السارق يسرق في الغزو أيقطع (٤٤٠٨) ترمذی: كتاب الحدود: باب ما جاء ان لا تقطع الايدی (١٤٥٠) نسائی: كتاب قطع السارق: باب القطع في السفر (٤٩٨٧) ابن عدی (٦/٢)] حافظ ابن حجرؒ نے اس کی سند کو قوی کہا ہے۔[الاصابة (١/ ٢٤٣)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[صحيح ترمذی، المشكاة (٣٦٠١)]

[3] [**صحیح**: صحیح بخاری: كتاب الصلوة: باب التوجه نحو القبلة (٣٩٩) صحيح مسلم: كتاب المساجد: باب تحويل القبلة (٥٢٥)]

آیت نازل ہوئی حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھنے لگے پھر یہ آیت ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ﴾ (البقرہ/١٤٩) الخ نازل ہوئی اور آپ نے بیت اللہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرنی شروع کی۔ [1]

مدینہ میں جب حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے لگے تو یہود بہت خوش ہوئے لیکن جب یہ حکم چند ماہ کے بعد منسوخ ہوا اور آپ کو اپنی چاہت، دعا اور انتظار کے مطابق کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھنے کا حکم دیا گیا تو ان یہودیوں نے طعنے دینے شروع کر دیئے کہ اب اس قبلہ سے کیوں ہٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ مشرق و مغرب کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے الخ پھر یہ اعتراض کیا؟ جدھر اس کا حکم ہو پھر جانا چاہیے [2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ مشرق و مغرب میں جہاں کہیں بھی ہوؤ منہ کعبہ کی طرف کرو، بعض بزرگوں کا بیان ہے کہ یہ آیت کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کے حکم سے پہلے اتری ہے اور مطلب یہ ہے کہ مشرق مغرب جدھر چاہو منہ پھیرو سب جہتیں اللہ ہی کی ہیں اور سب طرف اللہ موجود ہے اس سے کوئی جگہ خالی نہیں جیسے فرمایا ﴿وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾ (المجادلة/٧) تھوڑے بہت جو بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہے۔

پھر یہ حکم منسوخ ہو کر کعبۃ اللہ کی طرف متوجہ ہونا فرض ہوا۔ اس قول میں جو یہ لفظ ہیں کہ اللہ سے کوئی جگہ خالی نہیں اگر اس سے مراد علم اللہ ہو تو صحیح ہے کوئی مکان اللہ کے علم سے خالی نہیں اور اگر ذات باری مراد ہو تو ٹھیک نہیں اللہ تعالیٰ کی پاک ذات اس سے بہت بلند و بالا ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں سے کسی چیز میں محصور ہو ایک مطلب آیت کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہ آیت سفر اور راہ روی اور خوف کے وقت کے لیے ہے کہ ان وقتوں میں نفل نماز کو جس طرف منہ ہو ادا کر لیا کرو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان کی اونٹنی کا منہ جس طرف ہوتا تھا نماز پڑھ لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ حضور ﷺ کا طریقہ یہی تھا اور اس آیت کا مطلب بھی یہی ہے آیت کا ذکر کیے بغیر یہ حدیث مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ وغیرہ میں مروی ہے اور اصل اس کی صحیح بخاری، صحیح مسلم میں بھی موجود ہے [3] صحیح بخاری شریف میں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب نماز خوف کے بارے میں پوچھا جاتا تو نماز خوف کو بیان فرماتے اور کہتے کہ جب اس سے بھی زیادہ خوف ہو تو پیدل اور سوار کھڑے کھڑے پڑھ لیا کرو منہ خواہ قبلہ کی جانب ہو خواہ نہ ہو حضرت نافع رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما میرے خیال سے اسے مرفوع بیان کرتے تھے۔ [4] امام

---

[1] [الناسخ والمنسوخ (٢١) تفسیر ابن ابی حاتم (٣٤٦/١) مستدرك حاکم (٢٦٧/٢)] امام حاکم ؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے۔]

[2] [ضعیف و منقطع : تفسیر ابن جریر الطبری (١٨٣٥ ـ ٢١٦٥)]

[3] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب التقصیر : باب الایماء علی الدابة (١٠٩٦) صحیح مسلم : کتاب صلاة المسافرین : باب جواز الصلوٰة النافلة علی الدابة (٧٠٠) ترمذی : کتاب تفسیر القرآن (٢٩٥٨) مسند احمد (٢٠/٢)]

[4] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب التفسیر سورة البقرہ : باب قوله فان خفتم فرجالا او رکبانا (٤٥٣٥) صحیح ابن خزیمه (١٣٦٦) موطا (١٨٤/١)]

شافعی رحمہ اللہ کا مشہور فرمان اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ سفر خواہ پر امن ہو خواہ خوف ڈر اور لڑائی کا ہو سواری پر نفل ادا کر لینے جائز ہیں امام مالک رحمہ اللہ اور آپ کی جماعت اس کے خلاف ہے۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور ابوسعید اصطخری رحمہ اللہ بغیر سفر کے بھی اسے جائز کہتے ہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی یہ روایت ہے امام ابوجعفر طبری رحمہ اللہ بھی اسے پسند فرماتے ہیں یہاں تک کہ وہ تو پیدل چلنے والے کو بھی رخصت دیتے ہیں۔

بعض اور مفسرین کے نزدیک یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہیں قبلہ معلوم نہ ہو سکا اور انہوں نے قیاس سے مختلف جہتوں کی طرف نماز پڑھی جس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی وہ نماز ادا شدہ بتائی گئی حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے ایک منزل پر اترے رات اندھیری تھی لوگوں نے پتھر لے کر بطور نشان کے قبلہ رخ رکھ کر نماز پڑھنی شروع کر دی صبح اٹھ کر روشنی میں دیکھا تو نماز قبلہ کی طرف ادا نہیں ہوئی تھی، ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی' یہ حدیث ترمذی شریف میں ہے [1] امام صاحب نے اسے حسن کہا ہے اس کے دو راوی ضعیف ہیں ایک اور روایت میں ہے کہ اس وقت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ہم نے نماز پڑھ کر اپنے اپنے سامنے خط کھینچ دیئے تھے تاکہ صبح روشنی میں معلوم ہو جائے کہ نماز قبلہ کی طرف ادا ہوئی یا نہیں؟ صبح معلوم ہوا کہ قبلہ جاننے میں ہم نے غلطی کی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وہ نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا اور یہ آیت نازل ہوئی اس روایت کے بھی دو راوی ضعیف ہیں یہ روایت دارقطنی وغیرہ میں موجود ہے۔ [2]

ایک روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ تھے یہ بھی سنداً ضعیف ہے ایسی نماز کے لوٹانے کے بارے میں علماء کے دو قول میں سے ٹھیک قول یہی ہے کہ دوہرائی نہ جائے اور اسی قول کی تائید کرنے والی یہ حدیثیں ہیں جو اوپر بیان ہوئیں۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے نازل ہونے کا باعث نجاشی ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی موت کی خبر دی اور کہا ان کے جنازہ کی غائبانہ نماز پڑھو تو بعض نے کہا کہ وہ تو مسلمان نہ تھا نصرانی تھا اس پر آیت نازل ہوئی کہ ﴿وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ﴾ (ال عمران/ ۱۹۹) الخ یعنی بعض اہل کتاب اللہ تعالیٰ پر اور اس چیز پر جو اے مسلمانو تمہاری طرف نازل ہوئی [3] اور اس چیز پر جو ان پر نازل کی گئی ایمان لاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں صحابہ نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہ قبلہ کی طرف تو نماز نہیں پڑھتا تھا اس پر یہ آیت نازل

---

[1] [حسن : ترمذی : کتاب الصلوۃ : باب ما جآء فی الرجل یصلی لغیر القبلة فی الغنم (۳۴۵) ابن ماجہ : کتاب اقامة الصلوۃ : باب من یصلی لغیر القبلة وھو لا یعلم (۱۰۲۰) طیالسی (۱۱۴۵) دارقطنی (۲۷۲/۱) ابو نعیم (۱۷۹/۱)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔[ارواء الغلیل (۲۹۱) صحیح ترمذی ۔ تاہم حافظ زبیر علی زئی نے عاصم بن عبیداللہ راوی کی وجہ سے اس کی سند کو ضعیف کہا ہے۔]

[2] [ضعیف : دار قطنی (۲۷۱/۱) بیھقی فی السنن الکبری (۲۷۱/۱) مستدرك حاکم (۲۰۶/۱)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے۔]

[3] [ضعیف و مرسل : تفسیر ابن جریر الطبری (۱۸۴۶)، (۵۳۲/۲)]

ہوئی لیکن یہ روایت غریب ہے واللہ اعلم۔ اس کے معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ وہ بیت المقدس کی طرف اس لیے نمازیں پڑھتے رہے کہ انہیں اس کے منسوخ ہو جانے کا علم نہیں ہوا تھا' قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کے جنازے کی نماز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی اور یہ دلیل ہے کہ جنازے کی نماز غائبانہ ادا کرنی چاہیے۔

اور اس کے نہ ماننے والے اس حکم کو مخصوص جانتے ہیں اور اس کی تین تاویلیں کرتے ہیں ایک تو یہ کہ آپ نے اس کے جنازے کو دیکھ لیا زمین آپ کے لیے لپیٹ لی گئی تھی' دوسری یہ کہ چونکہ وہاں ان کے پاس ان کے جنازہ کی نماز پڑھنے والا اور کوئی نہ تھا اس لیے آپ نے یہاں غائبانہ ادا کی ابن عربی رحمہ اللہ اسی جواب کو پسند کرتے ہیں قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک بادشاہ مسلمان ہو اور اس کی قوم کا کوئی شخص اس کے پاس مسلمان نہ ہو' ابن عربی رحمہ اللہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ شاید ان کے نزدیک جنازے کی نماز ان کی شریعت میں نہ ہو' یہ جواب بہت اچھا ہے' تیسری یہ کہ یہ نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے ادا کی کہ دوسرے لوگوں کی رغبت کا سبب ہو اور اس جیسے دوسرے بادشاہ بھی دین اسلام کی طرف مائل ہوں۔

(لیکن یہ تینوں تاویلیں ظاہر کے خلاف ہونے کے علاوہ صرف احتمالات کی بنا پر ہیں اور انہیں مان لینے کے بعد بھی مسئلہ وہیں رہتا ہے کیا جنازہ غائبانہ پڑھنا چاہیے؟ کیونکہ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جنازے کا مشاہدہ کر لیا ہو لیکن پھر بھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی نماز تو غائبانہ ہی رہی۔ اگر ہم دوسرا جواب مان لیں تو بھی جنازہ تو غائبانہ ہی ہوا جو لوگ سرے سے نماز جنازہ غائبانہ کے قائل ہی نہیں وہ تو اس صورت میں بھی قائل نہیں ہیں اور یہ بات تو دل کو لگتی ہی نہیں کہ ان کے نزدیک نماز جنازہ مشروع نہ ہو شریعت ان کی بھی اسلام ہی تھی نہ کہ کوئی اور۔ تیسرا جواب بھی کچھ ایسا ہی ہے اور بر تقدیر تسلیم اب بھی وہ وجہ باقی ہے کہ جنازہ غائبانہ ادا کیا کریں تاکہ دوسرے لوگوں کی رغبت اسلام کا باعث ہو واللہ اعلم۔ مترجم)

ابن مردویہ میں حدیث ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اہل مدینہ' اہل شام' اہل عراق کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان ہے [1] یہ روایت ترمذی میں بھی دوسرے الفاظ سے مروی ہے اور اس کے ایک راوی ابو معشر کے حافظہ پر بعض اہل علم نے کلام کیا ہے امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے ایک اور سند سے بھی وارد کیا ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے [2] حضرت عمر بن خطاب' علی بن ابو طالب حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی یہ مروی ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جب تو مغرب کو اپنی دائیں جانب اور مشرق کو بائیں جانب کر لے تو تیرے سامنے کی جہت قبلہ ہو جائے گا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی اوپر کی طرح حدیث مروی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ [3]

---

(1) [صحیح : ترمذی : کتاب الصلوۃ : باب ما جآء ان ما بین المشرق والمغرب قبلۃ (۳۴۲) ابن ماجہ : کتاب اقامۃ الصلوۃ : باب القبلۃ (۱۰۱۱) السنن الکبری للبیھقی (۹/۲) السنن الکبری للنسائی (۹۶/۲) موطا (۴۶۱) دارقطنی (۲۷۰/۱) شرح السنۃ للبغوی (۳۴۰/۱) کنز العمال (۱۹۱۵۹) مسند بزار (۴۳۸/۲) ابن ابی شیبۃ (۳۶۲/۲)] امام ترمذیؒ نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [صحیح ابن ماجہ (۸۲۶) ارواء الغلیل (۲۹۲) المشکاۃ (۷۱۵)] حافظ زبیر علی زئی بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔]

(2) [المرجع السابق : ترمذی (۳۴۴)]

(3) [ترمذی (۳۴۴) ابن ماجہ (۱۰۱۱)]

ملاحظہ ہو دارقطنی ① بیہقی وغیرہ امام ابن جریر فرماتے ہیں یہ مطلب بھی اس آیت کا ہو سکتا ہے کہ تم مجھ سے دعائیں مانگنے میں اپنا منہ جس طرف بھی کرو میرا منہ بھی اسی طرف پاؤ گے اور میں تمہاری دعاؤں کو قبول فرماؤں گا' حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت ﴿اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ (المومن ۶۰) مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا اتری تو لوگوں نے کہا کس طرف رخ کر کے دعا کریں اس کے جواب میں آیت ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا﴾ الخ نازل ہوئی پھر فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام وسعتوں پر غالب' گنجائش والا اور علم والا ہے جس کی کفایت سخاوت اور فضل وکرم نے تمام مخلوق کا احاطہ کر رکھا ہے وہ سب چیزوں کو جانتا بھی ہے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے علم سے باہر نہیں بلکہ وہ تمام چیزوں کا عالم ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝١١٦ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝١١٧

یہ کہتے ہیں اللہ کی اولاد ہے (نہیں بلکہ) وہ پاک ہے۔ زمین و آسمان کی تمام مخلوق اس کی ملکیت میں ہے اور ہر ایک اس کا فرمانبردار ہے ○ وہ زمین و آسمان کا ابتدأ پیدا کرنے والا ہے۔ وہ جس کام کو کرنا چاہے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا بس وہ وہیں ہو جاتا ہے ○

اللہ تعالیٰ ہی قادر مطلق: یہ اور اس کے ساتھ کی آیت نصرانیوں کے رد میں ہے اور اسی طرح ان جیسے یہود و مشرکین کی تردید میں ہے جو اللہ کی اولاد بتاتے تھے ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین و آسمان وغیرہ تمام چیزوں کا تو اللہ مالک ہے ان کا پیدا کرنے والا انہیں روزیاں دینے والا ان کے اندازے مقرر کرنے والا انہیں قبضہ میں رکھنے والا ان میں ہر تغیر و تبدل کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے پھر بھلا اس مخلوق میں سے کوئی اس کی اولاد کیسے ہو سکتا ہے؟ نہ عزیر اور نہ ہی عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے بن سکتے ہیں جیسے کہ یہود و نصاریٰ کا خیال تھا نہ فرشتے اس کی بیٹیاں بن سکتے ہیں جیسے کہ مشرکین عرب کا خیال تھا۔ اس لیے کہ دو برابر کی مناسبت رکھنے والے ہم جنس سے اولاد ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا نہ کوئی نظیر نہ اس کی عظمت و کبریائی میں اس کا کوئی شریک نہ اس کی جنس کا کوئی اور وہ تو آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے اس کی اولاد کیسے ہو گی؟ اس کی کوئی بیوی بھی نہیں وہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز کا عالم ہے۔ ②

یہ لوگ رحمٰن کی اولاد بتاتے ہیں یہ کتنی بے معنی اور بیہودہ بے تکی بات تم کہتے ہو؟ اتنی بری بات زبان سے نکالتے ہو کہ اس سے آسمانوں کا پھٹ جانا اور زمین کا شق ہو جانا اور پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہو جانا ممکن ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے اللہ کی اولاد تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی اس کے سوا جو بھی ہے سب اس کی ہی ملکیت ہے زمین و آسمان کی تمام ہستیاں اس کی غلامی میں حاضر ہونے والی ہیں جنہیں ایک ایک کر کے اس نے گھیر رکھا ہے اور شمار کر رکھا ہے ان میں سے ہر ایک اس کے پاس قیامت والے دن تنہا تنہا پیش ہونے

① [دارقطنی (۱/۲۷۰) بیہقی (۲/۹)] ② [سورۃ الانعام: آیت ۱۰۱]

والا ہے [1] پس غلام اولاد نہیں بن سکتا ملکیت اور ولدیت دو مختلف اور متضاد حیثیتیں ہیں دوسری جگہ پوری سورت میں اس کی نفی فرمائی ارشاد ہوا ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّـهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۝﴾ (اخلاص) کہہ دو کہ اللہ ایک ہی ہے اللہ بے نیاز ہے اس کی نہ اولاد ہے نہ ماں باپ اس کا ہم جنس کوئی نہیں ان آیتوں اور ان جیسی اور آیتوں میں اس خالق کائنات نے اپنی تسبیح وتقدیس بیان کی اور اپنا بے نظیر، بے مثل اور لاشریک ہونا ثابت کیا اور ان مشرکین کے اس گندے عقیدے کو باطل قرار دیا اور بتایا کہ وہ تو سب کا خالق ورب ہے پھر اس کی اولاد بیٹے بیٹیاں کہاں سے ہوں گی؟

سورۂ بقرہ کی اس آیت کی تفسیر میں صحیح بخاری شریف کی ایک قدسی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجھے ابن آدم جھٹلاتا ہے اسے یہ لائق نہ تھا مجھے وہ گالیاں دیتا ہے اسے یہ نہیں چاہیے تھا اس کا جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ خیال کر بیٹھتا ہے کہ میں اسے مارڈالنے کے بعد پھر زندہ کرنے پر قادر نہیں ہوں اور اس کا گالیاں دینا یہ ہے کہ وہ میری اولاد بتاتا ہے حالانکہ میں پاک ہوں اور بلند وبالا ہوں اس سے کہ میری اولاد اور بیوی ہو [2] یہی حدیث دوسری سندوں سے اور کتابوں میں بھی باختلاف الفاظ مروی ہے صحیحین میں ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں بری باتیں سن کر صبر کرنے میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ کوئی کامل نہیں۔ لوگ اس کی اولاد بتائیں اور وہ انہیں رزق وعافیت دیتا رہے [3] پھر فرمایا ہر چیز اس کی اطاعت گذار ہے اس کی غلامی کا اقرار کیے ہوئے ہے اور اس کے لیے مخلص ہے۔ اس کی سرکار میں قیامت کے روز دست بستہ کھڑی ہونے والی اور دنیا میں بھی عبادت گذار ہے جس کو کہے یوں ہو جاؤ یا اسی طرح بن۔ فوراً وہ اسی طرح ہو جاتی اور بن جاتی ہے۔ اسی طرح ہر ایک اس کے سامنے پست ومطیع ہے کفار نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے مطیع ہیں۔ قرآن نے اور جگہ فرمایا ﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ﴾ [4] الخ آسمان وزمین کی کل چیزیں خوشی ناخوشی میں اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہیں ان کے سائے صبح شام جھکتے رہتے ہیں۔

ایک حدیث میں مروی ہے کہ جہاں کہیں قرآن میں قنوت کا لفظ ہے وہاں مراد اطاعت ہے [5] لیکن اس کا مرفوع ہونا صحیح نہیں ممکن ہے صحابی کا یا اور کسی کا کلام ہو اس سند سے اور آیتوں کی تفسیر بھی مرفوعاً مروی ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ضعیف ہے کوئی شخص اس سے دھوکہ میں نہ پڑے واللہ اعلم۔

پھر فرمایا وہ آسمان وزمین کو بغیر کسی سابقہ نمونہ کے پہلی ہی بار کی پیدائش میں پیدا کرنے والا ہے لغت میں

---

[1] [سورۃ مریم : آیت ۸۸۔۹۵]

[2] [**صحیح** : صحیح بخاری : کتاب التفسیر سورہ البقرہ : باب وقالوا اتخذ اللہ ولدا (۴۴۸۲)]

[3] [**صحیح** : صحیح بخاری : کتاب الادب : باب الصبر فی الاذی (۶۰۹۹) صحیح مسلم : کتاب صفات المنافقین : باب لا احد اصبر اذی (۲۸۰۴)]

[4] [سورۃ الرعد : آیت ۱۵]

[5] [**ضعیف** : تفسیر ابن ابی حاتم (۱۱۳۵)، (۳۴۸/۱) مسند احمد (۷۵/۳)] شیخ البانیؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔[السلسلۃ الضعیفۃ (۴۱۰۵)] شیخ مصطفی السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اس کی سند کو ضعیف کہتے ہیں۔]

بدعت کے معنی نو پیدا کرنے نیا بنانے کے ہیں حدیث میں ہے ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے [1] یہ تو شرعی بدعت ہے کبھی بدعت کا اطلاق صرف لغۃً ہوتا ہے شرعاً مراد نہیں ہوتی۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز تراویح پر جمع کیا اور پھر اسے اسی طرح جاری دیکھ کر فرمایا تھا اچھی بدعت ہے [2] "بدیع" کا "مبدع" سے تصرف کیا گیا ہے جیسے "مولم" سے "الیم" اور "مسمع" سے "سمیع" معنی "مبدع" کے انشا اور نو پیدا کرنے والے کے ہیں بغیر مثال بغیر نمونہ اور بغیر پہلی پیدائش کے پیدا کرنے والے بدعتی کو اس لیے بدعتی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اللہ کے دین میں وہ کام یا وہ طریقہ ایجاد کرتا ہے جو اس سے پہلے شریعت میں نہ ہو اسی طرح کسی نئی بات کے پیدا کرنے والے کو عرب مبتدع کہتے ہیں امام ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اولاد سے پاک ہے وہ آسمان وزمین کی تمام چیزوں کا مالک ہے ہر چیز اس کی وحدانیت کی دلیل ہے ہر چیز اس کی اطاعت گزاری کا اقرار کرتی ہے۔ سب کا پیدا کرنے والا بنانے والا موجود کرنے والا بغیر اصل اور مثال کے انہیں وجود میں لانے والا ایک وہی رب العالمین ہے اس کی گواہی ہر چیز دیتی ہے خود مسیح علیہ السلام بھی اس کے گواہ اور بیان کرنے والے ہیں جس رب نے ان تمام چیزوں کو بغیر نمونے کے اور بغیر مادے اور اصل کے پیدا کیا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بے باپ کے پیدا کر دیا پھر کوئی وجہ نہیں کہ انہیں تم خواہ مخواہ اللہ کا بیٹا مان لو پھر فرمایا اس اللہ کی قدرت وسلطنت سطوت وشوکت ایسی ہے کہ جس چیز کو جس طرح کی بنانا اور پیدا کرنا چاہے اسے کہہ دیتا ہے کہ اس طرح کی اور ایسی ہو جا وہ اسی وقت ہو جاتی ہے جیسے فرمایا ﴿اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (یسین/۸۲) دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (النحل/۴۰) اور ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ﴾ (القمر/۵۰) شاعر کہتا ہے

اِذَا مَـــا اَرَادَ اَمْـــرًا فَـــاِنَّـمَـــا يَـقُـوْلُ لَــهٗ كُـنْ قَـوْلَـهٗ فَـيَـكُـوْنُ

مطلب سب کا یہ ہے کہ ادھر اللہ نے کسی چیز کا ارادہ فرمایا اس نے کہا ہو جا وہیں وہ ہو گیا اس کے ارادے سے مراد جدا نہیں پس مندرجہ بالا آیت میں عیسائیوں کو نہایت لطیف پیرایہ میں یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی کن کے کہنے سے پیدا ہوئے ہیں دوسری جگہ صاف صاف فرمادیا ﴿اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (ال عمران/۵۹) یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت آدم علیہ السلام جیسی ہے جنہیں مٹی سے پیدا کیا پھر فرمایا ہو جا وہ ہو گئے۔

---

[1] [صحیح: ابو داؤد: کتاب السنۃ: باب لزوم السنۃ (۴۶۰۷) ابن ماجہ: مقدمۃ: باب اجتناب البدع والجدل (۴۶) ترمذی: کتاب العلم: باب ما جاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع (۲۶۷۶) السنن الکبری للنسائی (۵۵۰/۱) طبرانی کبیر (۹۷/۹) السنن الکبری للبیہقی (۲۰۶/۳) سنن دارمی (۸۰/۱) صحیح ابن حبان (۱۷۹/۱) مسند ابی یعلی (۲۱۱۹)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [ارواء الغلیل (۲۴۵۵)] شیخ شعیب ارناؤوط بھی اسے صحیح کہتے ہیں۔ [مسند احمد محقق (۱۷۱۴۵)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب صلوۃ التراویح: باب فضل من قام رمضان (۲۰۱۰)]

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اسی طرح بے علم لوگوں نے بھی کہا کہ خود اللہ ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اسی طرح ایسی ہی بات ان کے اگلوں نے بھی کہی تھی۔ ان کے اور ان کے دل یکساں ہو گئے ہم نے تو یقین والوں کے لیے نشانیاں بیان کر دیں○

ہر چیز خود دیکھنے کا مطالبہ محض حماقت: رافع بن حریملہ نے حضور ﷺ سے کہا تھا کہ اگر آپ سچے ہیں تو اللہ تعالیٰ خود ہم سے کیوں نہیں کہتا؟ ہم بھی تو خود اس سے اس کا کلام سنیں اس پر یہ آیت اتری [1] مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ بات نصرانیوں نے کہی تھی ابن جریر رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہی ٹھیک بھی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ آیت انہی سے متعلق بیان کے دوران میں ہے لیکن یہ قول سوچنے کے قابل ہے قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ ﷺ کی نبوت کی اطلاع خود جناب باری ہمیں کیوں نہیں دیتا؟ اور یہی بات ٹھیک ہے واللہ اعلم۔ بعض اور مفسر کہتے ہیں یہ قول کفار عرب کا تھا اور پھر جو فرمایا کہ اسی طرح بے علم لوگوں نے بھی کہا تھا اس سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں [2] قرآن کریم میں اور جگہ ہے ﴿وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ (الانعام/ ۱۲۵) الخ ان کے پاس جب کبھی کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو نہیں مانیں گے جب تک کہ ہم کو بھی وہ نہ دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اور جگہ فرمایا ﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ﴾ (الاسراء/ ۹۰) الخ یعنی انہوں نے کہا کہ ہم آپ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ آپ ہمارے لیے ان زمینوں میں چشمے جاری نہ کر دیں اور جگہ فرمایا ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا﴾ (الفرقان/ ۲۱) الخ یعنی ہماری ملاقات کے منکر کہتے ہیں ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے اللہ تعالیٰ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتا الخ اور جگہ فرمایا: ﴿بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ﴾ (المدثر/ ۵۲) الخ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ خود کوئی کتاب دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔

آیتیں جو صاف بتاتی ہیں کہ مشرکین عرب نے حضور ﷺ سے صرف تکبر وعناد کی بنا پر ایسی ایسی چیزیں طلب کیں اسی طرح یہ مطالبہ بھی انہی مشرکین کا تھا ان سے پہلے اہل کتاب نے بھی ایسے ہی بے معنی سوالات کیے تھے ارشاد ہوتا ہے ﴿يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ﴾ (النساء/ ۱۵۳) الخ اہل کتاب تم سے چاہتے ہیں کہ تم ان پر کوئی آسمانی کتاب اتارو اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے اس سے بھی بڑا سوال کیا تھا ان سے تو کہا تھا کہ ہمیں اللہ کو ہماری آنکھوں سے دکھا اور جگہ فرمان ہے کہ جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک اپنے رب کو سامنے نہ دیکھ لیں [3] پھر فرمایا ان کے اور ان کے دل یکساں اور مشابہ ہو گئے یعنی ان مشرکین کے

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۳۵۲)] [2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/ ۳۵۳)]

[3] [سورۃ البقرۃ: آیت ۵۵]

دل سابقہ کفار جیسے ہو گئے اور جگہ فرمایا ہے کہ پہلے گزرنے والوں نے بھی اپنے انبیاء علیہم السلام کو جادوگر اور دیوانہ کہا تھا انہوں نے بھی ان ہی باتوں کو دہرایا تھا۔ (۱) پھر فرمایا ہم نے یقین والوں کے لیے اپنی آیتیں بیان کر دیں جن سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق عیاں ہے کسی اور چیز کی وضاحت باقی نہیں رہی یہی نشانیاں ایمان لانے کے لیے کافی ہیں جن کے دلوں پر مہر لگی ہوئی ہو انہیں کسی آیت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا جیسے فرمایا ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ﴾ (یونس/۹۶۔۹۷) الخ جن پر تیرے رب کی بات ثابت ہو چکی ہے وہ ایمان نہ لائیں گے گو ان کے پاس تمام آیتیں آ جائیں جب تک کہ وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

ہم نے تجھے حق کے ساتھ خوشخبری دینے اور ڈراوا دینے والا بنا کر بھیجا ہے' جہنمیوں کے بارے میں تجھ سے پرسش نہیں ہوگی ○

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم محض واعظ وناصح: حدیث میں ہے خوشخبری دینے والے جنت کی اور ڈراوا جہنم سے (۲) "لَا تُسْئَلُ" کی دوسری قرات "مَا تُسْئَلُ" بھی ہے اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات میں "لَنْ تُسْئَلَ" بھی ہے یعنی تجھ سے کفار کی بابت سوال نہیں کیا جائے گا جیسے فرمایا ﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ (الرعد/۴۰) یعنی تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے حساب تو ہمارے ذمہ ہے اور فرمایا ﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَّسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○﴾ (الغاشية/۲۱'۲۲) تو نصیحت کرتا رہ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے ان پر داروغہ نہیں اور جگہ فرمایا ﴿نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ﴾ (ق/۴۵) الخ ہم ان کی باتیں بخوبی جانتے ہیں تم ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو تم قرآن کی نصیحتیں انہیں سنا دو جو قیامت سے ڈرتے ہوں اسی مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں ایک قرات اس کی "وَلَا تَسْأَلْ" بھی ہے یعنی ان جہنمیوں کے بارے میں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔

عبدالرزاق میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کاش کہ میں اپنے ماں باپ کا حال جان لیتا' کاش کہ میں اپنے ماں باپ کا حال جان لیتا' کاش کہ میں اپنے ماں باپ کا حال جان لیتا' اس پر یہ فرمان نازل ہوا۔ پھر آخری دم تک آپ نے والدین کا ذکر نہ فرمایا۔ (۳) ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسے بروایت موسیٰ بن عبیدہ وارد کیا ہے لیکن اس راوی پر کلام ہے قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جہنمیوں کا حال انتا بد

---

(۱) [سورة الذاريات : آيت ۵۲]

(۲) [**ضعیف**: تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۵۴)] اس کی سند میں عبدالرحمٰن بن محمد فزاری راوی ضعیف ہے۔ امام ابوحاتم نے اسے غیر قوی کہا ہے۔ [میزان الاعتدال (۲/۵۸۵)]

(۳) [**ضعیف ومرسل**: عبدالرزاق فی تفسیرہ (۱۲۶) تفسیر ابن جریر الطبری (۱۸۷۷-۱۸۷۸)] اس میں موسیٰ بن عبیدہ راوی سخت ضعیف ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اس روایت کو سخت ضعیف کہا ہے۔ شیخ عبدالرزاق مہدی، مولانا مبشر احمد ربانی اور حافظ زبیر علی زئی بھی اسے ضعیف کہتے ہیں۔]

اور برا ہے کہ تم کچھ نہ پوچھو۔

تذکرہ میں قرطبی رحمہ اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ کے والدین زندہ کیے گئے اور ایمان لے آئے اور صحیح مسلم میں جو حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے کسی کے سوال پر فرمایا ہے کہ میرا باپ اور تیرا باپ آگ میں ہیں [1] اس کا جواب بھی وہاں ہے لیکن یاد رہے کہ آپ کے ماں باپ کے زندہ ہونے کی روایت کتب صحاح ستہ وغیرہ میں نہیں اور اس کی اسناد ضعیف ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن جریر کی ایک مرسل حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک دن پوچھا کہ میرے ماں باپ کہاں ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی، [2] ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کی تردید کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ محال ہے کہ حضور ﷺ اپنے ماں باپ کے بارے میں شک کریں پہلی ہی قرات ٹھیک ہے لیکن ہمیں امام ہمام پر تعجب آتا ہے کہ انہوں نے اسے محال کیسے کہہ دیا؟

ممکن ہے یہ واقعہ اس وقت کا ہو جب آپ ﷺ اپنے ماں باپ کے لیے استغفار کرتے تھے اور انجام معلوم نہ تھا پھر جب ان دونوں کی حالت معلوم ہوگئی تو آپ اس سے ہٹ گئے اور بیزاری ظاہر فرمائی اور صاف بتادیا کہ وہ دونوں جہنمی ہیں جیسے کے صحیح حدیث سے ثابت ہو چکا ہے اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے حضرت عطا بن یسار رحمہ اللہ نے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کی صفت وثنا توراۃ میں کیا ہے تو آپ نے فرمایا ہاں اللہ کی قسم جو صفتیں آپ ﷺ کی قرآن میں ہیں وہی توراۃ میں بھی ہیں، توراۃ میں بھی ہے کہ اے نبی ہم نے تجھے گواہ اور خوشخبریاں دینے والا اور ڈرانے والا اور ان پڑھوں کا بچاؤ بنا کر بھیجا ہے تو میرا بندہ اور میرا رسول ہے میں نے تیرا نام متوکل رکھا ہے تو نہ بدزبان ہے نہ سخت گو نہ بدخلق نہ بازاروں میں شور و غل کرنے والا ہے نہ تو برائی کے بدلے برائی کرنے والا ہے بلکہ معاف اور درگذر کرنے والا ہے اللہ تعالیٰ انہیں دنیا سے نہ اٹھائے گا جب تک کہ ٹیڑھے دین کو ان کی وجہ سے بالکل ٹھیک اور درست نہ کردے اور لوگ ﴿لَآ اِلٰـهَ اِلاَّ اللّٰهُ﴾ کا اقرار نہ کرلیں اور ان کی اندھی آنکھیں کھل نہ جائیں اور ان کے بہرے کان سننے نہ لگ جائیں اور ان کے زنگ آلود دل صاف نہ ہو جائیں [3] بخاری کی کتاب البیوع میں بھی یہ حدیث ہے اور کتاب التفسیر میں بھی۔

ابن مردویہ میں اس روایت کے بعد مزید یہ ہے کہ میں نے پھر جا کر حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے یہی سوال کیا تو انہوں نے بھی ٹھیک یہی جواب دیا۔ [4]

---

[1] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الایمان : باب بیان ان من مات علی الکفر (۲۰۳) ابوداؤد : کتاب السنة: باب فی ذراری المشرکین (۴۷۱۸) مسند احمد (۳/۲۶۸)]

[2] [مرسل وضعیف : تفسیر ابن جریر الطبری (۱۸۷۹)]

[3] [صحیح : مسند احمد (۲/۱۷۴) صحیح بخاری : کتاب البیوع : باب کراھیة السخب فی السوق (۲۱۲۵) و کتاب التفسیر : باب انا ارسلناك شاھدا ومبشرا ونذیرا (۴۸۳۸)]

[4] [بیهقی فی دلائل النبوة (۱/۳۷۳۔ ۳۷۴)]

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى
اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ
مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ
اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

وقف منزل

تجھ سے یہود و نصاریٰ ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک کہ تو ان کے مذہب کا تابع نہ بن جائے۔ تو کہہ دے کہ اللہ کی ہدایت ہی ہدایت ہے اور اگر تو نے باوجود اپنے پاس علم آ جانے کے پھر ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو اللہ کے ہاں نہ تو تیرا کوئی ولی ہوگا اور نہ مددگار ○ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے اور وہ اسے پڑھنے کے حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے ساتھ کفر کرے وہ نقصان والا ہے ○

دین حق کا باطل سے سمجھوتہ جرم عظیم: آیت بالا کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تجھ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے لہٰذا تو بھی انہیں چھوڑ اور رب کی رضا کے پیچھے لگ جا تو نے انہیں دعوت رسالت پہنچا دی۔ دین حق وہی ہے جو اللہ نے تجھے دیا ہے تو اس پر جم جا۔ حدیث شریف میں ہے میری امت کی ایک جماعت حق پر جم کر دوسروں کے مقابلہ میں رہے گی اور غلبہ کے ساتھ رہے گی یہاں تک کہ قیامت آئے [1] پھر اپنے نبی ﷺ کو خطاب کر کے دھمکایا کہ ہرگز ان کی رضامندی اور ان سے صلح جوئی کے لیے اپنے دین میں سست نہ ہونا ان کی طرف نہ جھکنا ان کی نہ ماننا۔ فقہاء کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ کفر ایک ہی مذہب ہے خواہ وہ یہود ہوں نصرانی ہوں یا کوئی اور ہوں اس لیے کہ ملت کا لفظ یہاں مفرد ہی رکھا جیسے اور جگہ ہے ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون / ٦) تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے اس استدلال پر اس مسئلہ کی بناڈالی ہے کہ مسلمان اور کفار آپس میں وارث نہیں ہو سکتے اور کافر آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں گو وہ دونوں ایک ہی قسم کے کافر ہوں یا دو الگ الگ کفروں کے کافر ہوں، امام شافعی اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہما کا یہی مذہب ہے اور امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی قول منقول ہے اور دوسری روایت میں امام احمد کا اور امام مالک رحمہ اللہ علیہما کا یہ قول مروی ہے کہ دو مختلف مذہب والے آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہ ہوں ایک صحیح حدیث میں بھی یہی مضمون ہے۔ واللہ اعلم۔ [2]

تلاوت کے حق کا مفہوم: پھر فرمایا کہ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ حق تلاوت ادا کرتے ہوئے پڑھتے ہیں،

---

[1] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب نزول عیسی بن مریم (١٥٦)]

[2] [صحیح: ابن ماجہ: کتاب الفرائض: باب میراث اهل الاسلام من اهل الشرك (٢٧٣١) ابوداود (٢٥٢٣) ترمذی (٢٠٣٤) دارقطنی (٧٢/٤) السنن الصغیر للبیهقی (٣٣٣٤) السنن الکبری للبیهقی (٢٢١/٦) مستدرك حاكم (٢٩٤٤)] شیخ البانیؒ نے اسے حسن کہا ہے۔ [صحیح ابن ماجه (٢٢٠٧) ارواء الغلیل (١٢٠) المشکاة بتحقیق الثانی (٣٠٤٦) صحیح الجامع الصغیر (٧٦١٣)] یہی مفہوم صحیح بخاری (٦٧٦٤) کی اس حدیث میں بھی ہے ﴿لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم﴾۔]

قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں اس سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں اور روایت میں ہے کہ اس سے مراد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حق تلاوت یہ ہے کہ جنت کے ذکر کے وقت جنت کا سوال کیا جائے اور جہنم کے ذکر کے وقت اس سے پناہ مانگی جائے [1] ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حلال وحرام کو جاننا کلمات کو ان کی جگہ رکھنا تغیر وتبدل نہ کرنا وغیرہ یہی تلاوت کا حق ادا کرنا ہے [2] حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کھلی آیتوں پر عمل کرنا متشابہ آیتوں پر ایمان لانا مشکلات کو علماء کے سامنے پیش کرنا حق تلاوت کے ساتھ پڑھنا ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا مطلب حق اتباع بجالانا بھی مروی ہے پس تلاوت بمعنی اتباع ہے جیسے ﴿ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ﴾ (الشمس / ۲) میں ایک مرفوع حدیث میں بھی اس کے یہی معنی مروی ہیں لیکن اس کے بعض راوی مجہول ہیں گو معنی ٹھیک ہے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں قرآن کی اتباع کرنے والا جنت کے باغیچوں میں اترنے والا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تفسیر کے مطابق یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی رحمت کے ذکر کی آیت پڑھتے تو ٹھہر جاتے اور اللہ سے رحمت طلب کرتے اور جب کبھی کسی عذاب کی آیت تلاوت فرماتے تو رک کر اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب فرماتے۔ [3] پھر فرمایا اس پر ایمان یہی لوگ رکھتے ہیں یعنی جو اہل کتاب اپنی کتاب کی سوچ سمجھ کر تلاوت کرتے ہیں وہ قرآن پر ایمان لانے پر مجبور ہو جاتے ہیں جیسے اور جگہ ہے ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ ﴾ (المائدہ / ٦٦) الخ اگر یہ توراۃ وانجیل پر اور اللہ کی ان کی طرف نازل کردہ چیز پر قائم رہتے تو ان کے اوپر سے اور پیروں تلے سے انہیں کھانا ملتا الخ اور فرمایا اے اہل کتاب جب تک تم توراۃ وانجیل کو اور جو تمہاری طرف تمہارے رب کی طرف سے اترا اس کو قائم نہ کرلو تب تک تم کسی چیز پر نہیں ہو [4] ان کا قائم کرنا مستلزم ہے کہ تم اس میں جو ہے اسے سچا جانو اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر آپ کی صفات آپ کی تابعداری کا حکم آپ کی اتباع کی رغبت سب کچھ موجود ہے۔

اور جگہ فرمایا جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم امی کی تابعداری کرتے ہیں جس رسول کا ذکر اور تصدیق اپنی کتاب توراۃ وانجیل میں بھی لکھا دیکھتے ہیں [5] اور جگہ فرمایا ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ ﴾ (الاسراء / ۱۰۷-۱۰۸) الخ یعنی تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جنہیں اس سے پہلے علم دیا گیا ہے ان پر جب اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں منہ کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں اور زبانی کہتے ہیں کہ ہمارا رب پاک ہے ہمارے رب کا وعدہ بالکل سچا اور صحیح ہے اور جگہ ہے جنہیں ہم نے اس سے اگلی کتاب دی ہے وہ بھی اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان پر یہ پڑھی جاتی ہے تو اپنے ایمان کا اقرار کر کے کہتے ہیں ہم تو پہلے ہی سے ماننے والوں میں ہیں انہیں ان کے صبر کا دوہرا اجر دیا جائے گا یہ لوگ برائی کو بھلائی سے ہٹاتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے دوسروں کو دیتے ہیں [6] اور جگہ ارشاد ہے ﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ﴾ (ال عمران / ۲۰) الخ یعنی پڑھے

---

[1] [تفسیر قرطبی (۹۵/۲)]
[2] [تفسیر ابن جریر الطبری (۵٦۷/۲)]
[3] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب صلاۃ المسافرین : باب استحباب تطویل القراءۃ فی صلاۃ اللیل (۷۷۲)]
[4] [سورۃ المائدہ : آیت ٦۸]
[5] [سورۃ الاعراف : آیت ۱۵۷]
[6] [سورۃ القصص : آیت ۵۲-۵٤]

لکھے اور بے پڑھے لوگوں سے کہہ دو کہ کیا تم اسلام قبول کرتے ہو؟ اگر مان لیں تو راہ پر ہیں اور اگر نہ مانیں تو تجھ پر صرف تبلیغ ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے اسی لیے یہاں فرمایا کہ اس کے ساتھ کفر کرنے والے خسارے والے ہیں، جیسے فرمایا ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ﴾ (ھود/ ۱۷) جو بھی اس کے ساتھ کفر کرے اس کے وعدے کی جگہ آگ ہے صحیح حدیث میں ہے اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس امت میں سے جو بھی مجھے سنے خواہ یہودی ہو خواہ نصرانی ہو پھر مجھ پر ایمان نہ لائے وہ جہنم میں جائے گا۔ [1]

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝١٢٢
وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝١٢٣

اے اولاد یعقوب میں نے جو نعمتیں تم پر انعام کی ہیں' انہیں یاد کرو۔ میں نے تو تمہیں تمام جہان پر فضیلت دے رکھی ہے ○ اس دن سے ڈرو جس دن کوئی نفس کسی نفس کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ نہ کسی شخص سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا نہ اسے کوئی شفاعت نفع دے گی نہ ان کی مدد کی جائے گی ○

تنبیہ: پہلے بھی اس جیسی آیت شروع سورت میں گذر چکی ہے اور اس کی مفصل تفسیر بھی بیان ہو چکی ہے یہاں صرف تاکید کے طور پر ذکر کی گئی' اور انہیں نبی امی ﷺ کی تابعداری کی رغبت دلائی گئی جن کی صفتیں وہ اپنی کتابوں میں پاتے تھے جن کا نام اور کام بھی اس میں لکھا ہوا تھا بلکہ ان کی امت کا ذکر بھی اس میں موجود ہے پس انہیں اس کے چھپانے اور اللہ کی دوسری نعمتوں کو پوشیدہ کرنے سے ڈرایا جا رہا ہے اور دینی اور دنیوی نعمتوں کو ذکر کرنے کو کہا جا رہا ہے اور عرب میں جو نسلی طور پر بھی ان کے چچا زاد بھائی ہیں اللہ کی جو نعمت آئی ان میں جس خاتم الانبیاء ﷺ کو اللہ نے مبعوث فرمایا ان سے حسد کر کے نبی ﷺ کی مخالفت اور تکذیب پر آمادہ نہ ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰھٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَـمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝١٢٤

جب ابراہیم کو ان کے رب نے کئی کئی باتوں سے آزمایا اور انہوں نے سب کو پورا کر دیا تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا امام بنا دوں گا عرض کرنے لگے میری اولاد کو؟ فرمایا میرا وعدہ ظالموں سے نہیں ○

امام توحید: اس آیت میں خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی کا بیان ہو رہا ہے جو توحید میں دنیا کے امام ہیں جنہوں نے تکالیف پر صبر کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری میں ثابت قدمی اور جوانمردی دکھائی۔ فرماتا ہے اے نبی (ﷺ) تم ان مشرکین اور اہل کتاب کو جو ملت ابراہیمی کے دعویدار ہیں ذرا ابراہیم علیہ السلام کی فرمانبرداری اور اطاعت گذاری کے واقعات تو سناؤ تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ دین حنیف پر' اسوۂ ابراہیمی پر کون قائم ہے وہ

[1] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب وجوب الایمان برسالۃ نبینا (۱۵۳)]

یا آپ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم ؟ قرآن کریم کا ارشاد ہے ﴿وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰى﴾ (النجم/ ۳۷) ابراہیم (علیہ السلام) وہ ہیں جنھوں نے پوری وفاداری دکھائی اور فرمایا ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ﴾ (النحل/ ۱۲۰-۱۲۳) الخ ابراہیم (علیہ السلام) پیشوا اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار' مخلص اور نعمت کے شکرگذار تھے جنہیں اللہ عزوجل نے پسند فرما کر راہ راست پر لگا دیا تھا جنہیں ہم نے دنیا میں بھلائی دی تھی اور آخرت میں بھی صالح اور نیک انجام کار بنایا تھا پھر ہم نے تیری طرف اے نبی وحی کی کہ تو بھی ابراہیم حنیف کی ملت کی پیروی کر جو مشرکین میں سے نہ تھے اور جگہ ارشاد ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی تھے نہ مشرک تھے بلکہ خالص مسلمان تھے ان سے قربت اور نزدیکی والا وہ شخص ہے جو ان کی تعلیم کا تابع ہو اور یہ نبی ﷺ اور ایمان والے ان ایمان والوں کا دوست اللہ تعالیٰ خود ہے [۱] "اِبْتِلَاءٌ" کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں۔

کلمات سے مراد شریعت' حکم اور ممانعت وغیرہ ہے کلمات سے مراد کلمات تقدیر یہ بھی ہوتے ہیں جیسے مریم رضی اللہ عنہا کی بابت ارشاد ہے ﴿وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا﴾ (التحریم/ ۱۲) یعنی انہوں نے اپنے رب کے کلمات کی تصدیق کی۔ اور اس کے لکھے ہوئے کی بھی وہ بڑی فرماں بردار تھیں۔ کلمات سے مراد کلمات شرعیہ بھی ہوتے ہیں ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا﴾ (الانعام/ ۱۱۵) یعنی اللہ تعالیٰ کے شرعی کلمات سچائی اور عدل کے ساتھ پورے ہوئے یہ کلمات یا تو سچی خبریں ہیں یا طلب عدل ہے غرض ان کلمات کو پورا کرنے کی جزا میں انہیں امامت کا درجہ ملا' ان کلمات کی نسبت بہت سے اقوال ہیں مثلاً احکام حج' مونچھوں کو کم کرنا' کلی کرنا' ناک صاف کرنا' مسواک کرنا' سر کے بال منڈھوانا یا رکھوانا' مانگ نکالنا' ناخن کاٹنا' زیر ناف کے بال لینا' ختنہ کرانا' بغل کے بال کاٹنا' پیشاب پاخانہ کے بعد استنجا کرنا' جمعہ کے دن غسل کرنا' طواف کرنا' صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا' رمی جمار کرنا' طواف افاضہ کرنا۔

مکمل اسلام: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس سے مراد پورا اسلام ہے جس کے تیس حصے ہیں دس کا بیان سورۂ برات میں ہے ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ﴾ سے ﴿مُؤْمِنِيْنَ﴾ [۲] تک یعنی توبہ کرنا' عبادت کرنا' حمد کرنا' اللہ کی راہ میں پھرنا' رکوع کرنا' سجدہ کرنا' بھلائی کا حکم دینا' برائی سے روکنا' اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنا' ایمان لانا دس کا بیان ﴿قَدْ اَفْلَحَ﴾ کے شروع سے ﴿يُحَافِظُوْنَ﴾ تک ہے اور سورۂ معارج میں ہے یعنی نماز کو خشوع خضوع سے ادا کرنا' لغو اور فضول باتوں اور کاموں سے منہ پھیر لینا' زکوٰۃ دیتے رہا کرنا' شرمگاہ کی حفاظت کرنا' امانت داری کرنا' وعدہ وفائی کرنا' نماز پر ہیشگی اور حفاظت کرنا' قیامت کو سچا جاننا' عذابوں سے ڈرتے رہنا' سچی شہادت پر قائم رہنا اور دس کا بیان سورۂ احزاب میں ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ سے ﴿عَظِيْمًا﴾ [۳] تک ہے یعنی اسلام لانا' ایمان رکھنا' قرآن پڑھنا' سچ بولنا' صبر کرنا' عاجزی کرنا' خیرات دینا' روزہ رکھنا' بدکاری سے بچنا' اللہ تعالیٰ کا ہر وقت بکثرت ذکر کرنا' ان تینوں احکام کا جو عامل ہو وہ پورے اسلام کا پابند ہے اور اللہ کے عذابوں سے بری ہے۔

کلمات ابراہیمی میں اپنی قوم سے علیحدگی کرنا' بادشاہ وقت سے نڈر ہو کر اسے بھی تبلیغ کرنا پھر اللہ تعالیٰ کی راہ

---

[۱] [سورۃ آل عمران : آیت ۶۷-۶۸]

[۲] [سورۃ التوبۃ : آیت ۱۱۲]

[۳] [سورۃ مؤمنون : آیت ۱ - ۹]

[۴] [سورۃ الاحزاب : آیت ۳۵]

میں جو مصیبت آئے اس پر صبر کرنا سہنا پھر وطن اور گھر بار کو اللہ کی راہ میں چھوڑ کر ہجرت کرنا مہمانداری کرنا اللہ کی راہ میں جانی اور مالی مصیبت راہ اللہ برداشت کرنا یہاں تک کہ بچہ کو اللہ کی راہ قربان کرنا اور وہ بھی اپنے ہی ہاتھ سے یہ کل احکام خلیل الرحمٰن علیہ السلام بجالائے۔ سورج چاند اور ستاروں سے بھی آپ کی آزمائش ہوئی امامت کے ساتھ بیت اللہ بنانے کے حکم کے ساتھ حج کے حکم اور مقام ابراہیم کے ساتھ بیت اللہ کے رہنے والوں کی روزیوں کے ساتھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے دین پر بھیجنے کے ساتھ بھی آزمائش ہوئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے خلیل میں تمہیں آزماتا ہوں دیکھتا ہوں تم کیا ہو؟ تو آپ نے فرمایا مجھے لوگوں کا امام بنادے' اس کعبہ کو لوگوں کے ثواب اور اجتماع کا مرکز بنادے' یہاں والوں کو پھلوں کی روزیاں دے یہ تمام باتیں عزوجل نے پوری کر دیں اور یہ سب نعمتیں آپ کو عطا ہوئیں صرف ایک آرزو پوری نہ ہوئی وہ یہ کہ میری اولاد کو بھی امامت ملے تو جواب ملا ظالموں کو میرا عہد نہیں پہنچتا کلمات سے مراد اس کے ساتھ کی آیتیں بھی ہیں۔

موطا وغیرہ میں ہے کہ سب سے پہلے ختنہ کرانے والے' سب سے پہلے مہمان نوازی کرنے والے' سب سے پہلے ناخن کٹوانے والے سب سے پہلے مونچھیں پست کرنے والے سب سے پہلے سفید بال دیکھنے والے حضرت ابراہیم ہی ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) سفید بال دیکھ کر پوچھا کہ اے اللہ یہ کیا ہے؟ جواب ملا وقار وعزت ہے کہنے لگے پھر تو اے اللہ اسے اور زیادہ کر۔ [1] سب سے پہلے منبر پر خطبہ کہنے والے' سب سے پہلے قاصد بھیجنے والے' سب سے پہلے تلوار چلانے والے' سب سے پہلے مسواک کرنے والے' سب سے پہلے پانی کے ساتھ استنجا کرنے والے' سب سے پہلے پاجامہ پہننے والے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں۔ ایک غیر ثابت حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں منبر بناؤں تو میرے باپ ابراہیم علیہ السلام نے بھی بنایا تھا اور اگر میں لکڑی ہاتھ میں رکھوں تو یہ بھی میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے [2] مختلف بزرگوں سے کلمات کی تفسیر میں جو کچھ ہم نے نقل کر دیا اور ٹھیک بھی یہ ہے کہ یہ سب باتیں ان کلمات میں تھیں کسی خاص تخصیص کی کوئی وجہ ہمیں نہیں ملی واللہ اعلم۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دس باتیں فطرت کی اور اصل دین کی ہیں مونچھیں کم کرنا' داڑھی بڑھانا' مسواک کرنا' ناک میں پانی دینا' ناخن لینا' پوریاں دھونی' بغل کے بال لینا' زیر ناف کے بال لینا' استنجا کرنا راوی کہتا ہے میں دسویں بات بھول گیا شاید کلی کرنا تھی۔ [3] صحیحین

---

[1] [مقطوع : مؤطا : كتاب صفة النبى (٢/٩٢٢) ابن ابى شيبة (٦) بيهقى فى شعب الايمان (٨٦٤٠)]

[2] [منکر و ضعیف : بزار (٦٣٣) طبرانى (١٦٧/٢٠)] شیخ البانی نے اس روایت کو منکر کہا ھے۔ [السلسلة الضعيفة (١٦٨٠)] اس کی سند میں موسیٰ بن محمد تیمی راوی سخت ضعیف ہے۔ حافظ زبیر علی زئی بھی اس کی سند کو ضعیف کہتے ہیں۔]

[3] [صحیح : صحيح مسلم : كتاب الطهارة : باب خصال الفطرة (٢٦١) نسائى : كتاب الزينة : باب الفطرة (٥٠٤٣) ابن ماجه : كتاب الطهارة : باب الفطرة (٢٩٣) ابو داؤد : كتاب الطهارة : باب السواك من الفطرة (٥٣) ترمذى : كتاب الادب : باب ما جاء فى تقليم الاظفار (٢٧٥٧)]

میں ہے حضور ﷺ فرماتے ہیں پانچ باتیں فطرت کی ہیں ختنہ کرانا' موئے (بال) زہار لینا' مونچھیں کم کرنا' ناخن لینا' بغل کے بال لینا [1] ایک حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وفا کرنے والا اس لیے فرمایا ہے کہ وہ ہر صبح کے وقت پڑھتے تھے۔ ﴿سُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ○ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ○ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ﴾ [2] ایک اور روایت میں ہے کہ ہر دن چار رکعتیں پڑھتے تھے [3] لیکن یہ دونوں حدیثیں ضعیف ہیں اور ان میں کئی کئی راوی ضعیف ہیں اور ضعف کی بہت سی وجوہات ہیں بلکہ ان کا بیان بھی بے بیان ضعف جائز نہیں متن بھی ضعف پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی امت کی خوشخبری سن کر اپنی اولاد کے لئے بھی یہی دعا کرتے تھے جو قبول تو کی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی خبر کر دی جاتی ہے کہ آپ کی اولاد میں ظالم بھی ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کا عہد نہ پہنچے گا وہ امام نہ بنائے جائیں گے نہ ان کی اقتدا اور پیروی کی جائے گی سورۂ عنکبوت کی آیت میں اس مطلب کو واضح کر دیا گیا ہے کہ خلیل اللہ کی یہ دعا بھی قبول ہوئی وہاں ہے ﴿وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ﴾ (العنکبوت/۲۷) یعنی ہم نے ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔ حضرت ابرہیم علیہ السلام کے بعد جتنے انبیاء علیہم السلام اور رسول آئے وہ سب آپ علیہ السلام ہی کی اولاد میں تھے اور جتنی کتابیں نازل ہوئیں سب آپ ہی کی اولاد میں ہوئیں۔ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِمْ اَجْمَعِيْنَ۔ یہاں یہ بھی خبر دی گئی ہے کہ آپ کی اولاد میں ظلم کرنے والے بھی ہوں گے' حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ میں ظالم کو امام نہیں بناؤں گا' ظالم سے مراد بعض نے مشرک بھی لیا ہے عہد سے مراد امر ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں ظالم کو کسی چیز کا والی اور بڑا نہ بنانا چاہیے گو وہ اولاد ابراہیم علیہ السلام میں سے ہو' حضرت خلیل علیہ السلام کی دعا ان کی نیک اولاد کے حق میں قبول ہوئی ہے یہ بھی معنی کیے گئے ہیں کہ ظالم سے کوئی عہد نہیں کہ اس کی اطاعت کی جائے اس کا عہد توڑ دیا جائے پورا نہ کیا جائے اور یہ بھی مطلب ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے اسے کچھ دینے کا عہد نہیں کیا دنیا میں تو کھا پی رہا ہے اور عیش وعشرت کر رہا ہے۔ بس یہی ہے عہد سے مراد دین بھی ہے یعنی تیری کل اولاد دیندار نہیں جیسے اور جگہ ہے ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ﴾ (الصفت/۱۱۳) یعنی ان کی اولاد میں بھلے بھی ہیں اور برے بھی۔ اطاعت کے معنی کیے گئے ہیں یعنی اطاعت صرف معروف اور بھلائی میں ہوگی' اور عہد کے معنی نبوت کے بھی آئے ہیں ابن خویز منداد مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ظالم شخص نہ تو خلیفہ بن سکتا ہے نہ حاکم نہ مفتی نہ گواہ نہ راوی۔

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب اللباس: باب قص الشوارب (۵۸۸۹) صحیح مسلم: کتاب الطھارۃ: باب خصال الفطرۃ (۲۵۷)]

[2] [سورۃ الروم: آیت ۱۷۔ ۱۹]

[3] [ضعیف جدا: تفسیر ابن جریر (۱۵/۳)] اس میں جعفر بن زبیر سخت ضعیف ہے۔ شیخ البانی ؒ نے اسے سخت ضعیف کہا ہے۔ [السلسلۃ الضعیفۃ (۲۹/۹)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس اس کی سند کو سخت ضعیف کہتے ہیں۔ حافظ زبیر علی زئی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔]

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ

ہم نے بیت اللہ لوگوں کے لیے ثواب کی اور امن وامان کی جگہ بنائی ۔تم مقام ابراہیم کو قبلہ مقرر کرلو۔

مقام ابراہیم جائے نماز مقرر: ﴿مَثَابَةً﴾ سے مراد بار بار آنا ۔حج کرنے کے بعد بھی دل میں لگن لگی رہتی ہے گویا حج کرنے کے بعد بھی ہر بار دل میں ایک بار اور حج کرنے کی تمنا رہتی ہے دنیا کے ہر گوشہ سے لوگ بھاگے دوڑے اس کی طرف جوق در جوق چلے آرہے ہیں یہی جمع ہونے کی جگہ ہے اور یہی امن کا مقام ہے جس میں ہتھیار نہیں اٹھایا جاتا جاہلیت کے زمانہ میں بھی اس کے آس پاس تو لوٹ مار ہوتی رہتی لیکن یہاں امن وامان ہی رہتا کوئی کسی کو گالی بھی نہیں دیتا ۔یہ جگہ ہمیشہ متبرک اور شریف رہی ۔نیک روحیں اس کی طرف مشتاق ہی رہتی ہیں گو ہر سال زیارت کریں لیکن پھر بھی شوق زیارت کم نہیں ہوتا ہے ۔یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا اثر ہے ۔آپ نے دعا مانگی تھی کہ ﴿فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ﴾ (ابراھیم /٣٧) الخ تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے ۔یہاں باپ اور بھائی کے قاتل کو بھی کوئی دیکھتا تو خاموش ہو جاتا سورۂ مائدہ میں ہے ﴿قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ [1] یعنی یہ لوگوں کے قیام کا باعث ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں اگر لوگ حج کرنا چھوڑ دیں تو آسمان زمین پر گرا دیا جائے ۔اس گھر کے اس شرف کو دیکھ کر پھر اس کے بانی اول حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے شرف کو خیال فرمائیے ۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ﴾ (الحج /٢٦) الخ ہم نے بیت اللہ کی جگہ ابراہیم علیہ السلام کو بتا دی (اور کہہ دیا) کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور جگہ ہے ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ﴾ (ال عمران /٩٦) الخ اللہ جل شانہ کا پہلا گھر مکہ میں ہے جو برکت وہدایت والا نشانیوں والا ۔مقام ابراہیم والا امن وامان والا ہے مقام ابراہیم سے مراد کل حرم ہے اور خاص مقام ابراہیم بھی ہے' اور حج کل کا کل بھی ہے ۔مثلاً عرفات' مشعر الحرام' منیٰ' رمی' جمار' صفا مروہ کا طواف' مقام ابراہیم دراصل وہ پتھر ہے جسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بیوی صاحبہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہانے کے لیے ان کے پاؤں کے نیچے رکھا تھا' [2] لیکن حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں یہ غلط ہے ۔دراصل یہ وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ بناتے تھے' حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی لمبی حدیث میں ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کر لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مقام ابراہیم کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔کیا یہی ہمارے باپ ابراہیم کا مقام ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں کہا پھر ہم اسے قبلہ کیوں نہ بنالیں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ۔[3]

ایک اور روایت میں ہے کہ فاروق رضی اللہ عنہ کے سوال پر تھوڑی ہی دیر گذری تھی جو حکم نازل ہوا [4] ایک اور حدیث میں ہے کہ فتح مکہ والے دن مقام ابراہیم کے پتھر کی طرف اشارہ کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا یہی ہے

---

[1] [سورة المائدة : آيت ٩٧]
[2] [تفسير ابن جرير الطبری (٣/٣٥)]
[3] [تفسير ابن جرير الطبری (٣/٣٥)]
[4] [النسائی فی السنن الكبریٰ (١٠٩٩٨)]

جسے قبلہ بنانے کا ہمیں حکم ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں یہی۔ [1]

صحیح بخاری شریف میں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے اپنے رب سے تین باتوں میں موافقت کی جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا وہی میری زبان سے نکلا میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کاش کہ ہم مقام ابراہیم کو قبلہ بنا لیتے تو حکم ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ (البقرہ / ۱۲۵) نازل ہوا میں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاش کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو پردے کا حکم دیں اس پر پردے کی آیت اتری جب مجھے معلوم ہوا کہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں سے خفا ہیں تو میں نے جا کر ان سے کہا کہ اگر تم باز نہ آؤ گی تو اللہ تعالیٰ تم سے اچھی بیویاں تمہارے بدلے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے گا اس پر فرمان باری نازل ہوا کہ ﴿عَسٰى رَبُّهٗ﴾ [2] الخ اس حدیث کی بہت سی اسناد ہیں اور بہت سی کتابوں میں مروی ہے [3] ایک روایت میں بدر کے قیدیوں کے بارے میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت مروی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ان سے فدیہ نہ لیا جائے بلکہ انہیں قتل کر دیا جائے اللہ سبحانہ تعالیٰ کو بھی یہی منظور تھا۔ [4] عبداللہ بن ابی بن سلول منافق جب مر گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے جنازے کی نماز ادا کرنے کے لیے تیار ہوئے تو میں نے کہا تھا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس منافق کافر کا جنازہ پڑھیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ڈانٹ دیا اور اس پر آیت ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (التوبة / ٨٤) الخ نازل ہوئی اور آپ کو ایسوں کے جنازے سے روکا گیا۔

ابن جریج میں روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے طواف میں تین مرتبہ رمل کیا یعنی دوڑ کی چال چلے اور چار پھیرے چل کر کیے پھر مقام ابراہیم کے پیچھے آ کر دو رکعت نماز ادا کی اور یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى﴾ [4] حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ مقام ابراہیم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور بیت اللہ کے درمیان کر لیا تھا۔ [5] ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام ابراہیم سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ بنا رہے تھے حضرت اسماعیل علیہ السلام آپ کو پتھر دیتے جاتے تھے اور آپ کعبہ کی بنا کرتے جاتے تھے اور اس پتھر کو سرکاتے جاتے تھے جہاں دیوار اونچی کرنی ہوتی تھی وہاں لے جاتے تھے اسی طرح کعبہ کی دیواریں پوری کیں اس کا پورا بیان حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اس پتھر

---

[1] [صحیح: تفسیر ابن ابی حاتم (۳۷۰)] شیخ البانی ؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[صحیح نسائی (۲۷۷۳)] حافظ زبیر علی زئی فرماتے ہیں کہ یہ روایت اپنی تمام سندوں کے ساتھ ضعیف ہے۔]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الصلوة: باب ما جاء فی القبلة (۲) و کتاب التفسیر سورہ البقرہ (٤٤٨٣) ابن ماجہ: کتاب اقامة الصلوة باب القبلة (۱۰۰۹) ترمذی: کتاب تفسیر القرآن: باب ومن سورة البقرہ (۲۹۵۹) مسند احمد (۱/ ۲٤)]

[3] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة: باب من فضائل عمر (۲۳۹۹)]

[4] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الحج: باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم (۱۲۱۸)]

[5] [تفسیر ابن جریر الطبری (۳/ ۳٦)]

پر آپ کے دونوں قدموں کے نشان ظاہر تھے عرب کی جاہلیت کے زمانہ کے لوگوں نے بھی دیکھے تھے۔ ابو طالب نے اپنے مشہور قصیدہ میں کہا ہے:

وَمَوْطِیءُ اِبْرَاهِیْمَ فِی الصَّخْرِ رَطْبَةً عَلٰی قَدَمَیْهِ حَافِیًا غَیْرَ نَاعِلِ

یعنی اس پتھر میں ابراہیم علیہ السلام کے دونوں پیروں کے نشان تازہ بتازہ ہیں جن میں جوتی نہیں بلکہ مسلمانوں نے بھی اسے دیکھا تھا حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مقام ابراہیم میں حضرت خلیل اللہ کے پیروں کی انگلیوں اور آپ کے تلوے کا نشان دیکھا تھا پھر لوگوں کے چھونے سے وہ نشان مٹ گئے حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں حکم اس کی جانب نماز ادا کرنے کا ہے تبرک کے طور پر چھونے اور ہاتھ لگانے کا نہیں اس امت نے بھی اگلی امتوں کی طرح بلا حکم الہ العالمین بعض کام اپنے ذمہ لازم کر لیے جو نقصان رساں ہیں وہ نشان لوگوں کے ہاتھ لگانے سے مٹ گئے۔ یہ مقام ابراہیم پہلے دیوار کعبہ کے متصل تھا کعبہ کے دروازے کی طرف حجر اسود کی جانب دروازے سے جانے والے کے دائیں جانب مستقل جگہ پر تھا جو آج بھی لوگوں کو معلوم ہے خلیل اللہ نے یا تو اسے یہاں رکھوا دیا تھا یا بیت اللہ بناتے ہوئے آخری حصہ یہی بنایا ہوگا اور یہیں وہ پتھر رکھا ہے۔

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں اسے پیچھے ہٹا دیا اس کے ثبوت میں بہت سی روایتیں ہیں پھر ایک مرتبہ پانی کے سیلاب میں یہ پتھر یہاں سے بھی ہٹ گیا تھا خلیفہ ثانی نے اسے پھر اپنی جگہ رکھوا دیا حضرت سفیان رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے معلوم نہیں ہوا کہ یہ اصلی جگہ سے ہٹایا گیا اس سے پہلے دیوار کعبہ سے کتنی دور تھا ایک روایت میں ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس کی اصلی جگہ سے ہٹا کر وہاں رکھا تھا جہاں اب ہے لیکن یہ روایت مرسل ہے ٹھیک بات یہی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے پیچھے رکھا۔ واللہ اعلم۔

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰكِفِیْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾

ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو○ جب ابراہیم نے کہا اے پروردگار تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے باشندوں کو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں، پھلوں کی روزیاں دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں کافروں کو بھی تھوڑا فائدہ

دوں گا۔ پھر انہیں آگ کے عذاب کی طرف بے بس کر دوں گا۔ یہ پہنچنے کی جگہ بری ہے ○ ابراہیم اور اسماعیل کعبہ کی بنیادیں اور دیواریں اٹھاتے جاتے تھے اور کہتے جارہے تھے کہ ہمارے پروردگار تو ہم سے قبول فرما تو سننے اور جاننے والا ہے ○ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا لے اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک جماعت اپنی اطاعت گذار رکھ اور ہمیں اپنی عبادتیں سکھا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ تو توبہ قبول فرمانے والا اور رحم و کرم کرنے والا ہے ○

حکم کے برابر عہد: یہاں عہد سے مراد وہ حکم ہے جس میں کہا گیا ہے گندی اور نجس اور بری چیزوں سے پاک رکھنا[1] عہد کا تعدیہ الی سے ہو تو معنی ہم نے وحی کی اور پہلے سے کہہ دیا کہ پاک رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے بتوں سے بچانا غیر اللہ کی عبادت نہ ہونے دینا لغو کاموں، فضول بکواس، جھوٹی باتوں، شرک و کفر، ہنسی اور مذاق سے اسے محفوظ رکھنا بھی اسی میں شامل ہے طائف کے ایک معنی تو طواف کرنے والوں کے ہیں دوسرے معنی باہر سے آنے والوں کے ہیں اس تقدیر پر ﴿عَاكِفِينَ﴾ کے معنی مکہ کے باشندے ہوں گے ایک مرتبہ لوگوں نے کہا کہ امیر وقت سے کہنا چاہیے کہ لوگوں کو بیت اللہ شریف میں سونے سے منع کریں کیونکہ ممکن ہے کوئی کسی وقت جنبی ہو جائے ممکن ہے کبھی آپس میں فضول باتیں کریں تو ہم نے سنا کہ انہیں نہ روکنا چاہیے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما انہیں بھی ﴿عَاكِفِينَ﴾ کہتے تھے ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مسجد نبوی میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سویا کرتے تھے وہ جوان اور کنوارے تھے۔[2] ﴿رُكَّعِ السُّجُودِ﴾ سے مراد نمازی ہیں[3] پاک رکھنے کا حکم اس واسطے دیا گیا کہ اس وقت بھی بت پرستی رائج تھی دوسرے اس لیے کہ یہ بزرگ اپنی نیتوں میں خلوص کی بات رکھیں دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا﴾ الخ[4] اس آیت میں بھی حکم ہے کہ میرے ساتھ شریک نہ کرنا اور میرے گھر کو پاک صاف رکھنا فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ بیت اللہ کی نماز افضل ہے یا طواف؟ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں باہر والوں کے لیے طواف افضل ہے اور جمہور کا قول ہے کہ ہر ایک کے لیے نماز افضل ہے اس کی تفصیل کی جگہ تفسیر نہیں۔

مقصد اس سے مشرکین کو تنبیہ اور تردید ہے کہ بیت اللہ تو خاص اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے اس میں اوروں کی عبادت کرنا اور خالص اللہ کی عبادت کرنے والوں کو اس سے روکنا کس قدر صریح بے انصافی ہے اور اسی لیے قرآن میں فرمایا ہے کہ ایسے ظالموں کو ہم دردناک عذاب چکھائیں گے[5] مشرکین کی اس کھلی تردید کے ساتھ ہی یہود و نصاریٰ کی تردید بھی اس آیت میں ہو گئی کہ جب وہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی افضلیت، بزرگی اور نبوت کے قائل ہیں اور یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ یہ شریف گھرانے کے متبرک ہاتھوں کا بنا ہوا ہے جب وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ یہ محض نماز و طواف و دعا اور عبادت اللہ کے لیے بنایا گیا ہے حج و عمرے اور اعتکاف وغیرہ کے لیے مخصوص کیا گیا ہے تو پھر ان نبیوں کی

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۷۳)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الصلوۃ: باب نوم الرجل فی المسجد (۴۴۰) صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابۃ: باب فضائل عبداللہ بن عمر (۲۴۷۹)]

[3] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۷۶)] [4] [سورۃ الحج: آیت ۲۶]

[5] [سورۃ الحج: آیت ۲۵]

تابعداری کے دعوے کے باوجود کیوں حج وعمرے سے رکے ہوئے ہیں؟ کیوں بیت اللہ شریف میں حاضری نہیں دیتے؟ بلکہ خود موسیٰ علیہ السلام نے اس گھر کا حج کیا جیسا کہ حدیث میں صاف موجود ہے۔ (1) آیۃ کریمہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اور مسجدوں کو بھی پاک صاف رکھنا چاہیے اور جگہ قرآن میں ہے ﴿فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ يُسَبِّحُ لَهُ فِيهَا بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ﴾ (النور/٣٦) اللہ تعالیٰ نے مسجدوں کو بلند کرنے کی اجازت دی ہے ان میں اس کا نام ذکر کیا جائے ان میں صبح شام اس کی تسبیح اس کے نیک بندے کرتے ہیں۔

حدیث شریف میں بھی ہے کہ مسجدیں اسی کام کے لیے ہیں (2) اور احادیث میں بہت ہی تاکید کے ساتھ مسجدوں کی پاکیزگی کا حکم آیا ہے امام ابن کثیر نے اس بارے میں ایک خاص رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ بعض لوگ تو کہتے ہیں سب سے پہلے کعبۃ اللہ فرشتوں نے بنایا تھا لیکن یہ سنداً غریب ہے بعض کہتے ہیں آدم علیہ السلام نے سب سے پہلے بنایا تھا حرا، طور سینا، طور زیتا، جبل لبنان اور جودی ان پانچ پہاڑوں سے بنایا تھا لیکن یہ بھی سنداً غریب ہے بعض کہتے ہیں شیث علیہ السلام نے سب سے پہلے بنایا تھا لیکن یہ بھی اہل کتاب کی بات ہے۔ حدیث شریف میں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا اور فرمایا میں مدینہ منورہ کو حرم قرار دیتا ہوں۔ اس میں شکار نہ کھیلا جائے یہاں کے درخت نہ کاٹے جائیں یہاں ہتھیار نہ اٹھائے جائیں (3) صحیح مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ لوگ تازہ پھل لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے لے کر دعا کرتے کہ اے اللہ ہمارے پھلوں میں ہمارے شہر میں ہمارے ناپ تول میں بھی برکت دے۔ اے اللہ ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے تیرے خلیل اور تیرے رسول تھے میں بھی تیرا بندہ تیرا رسول ہوں انہوں نے تجھ سے مکہ کے لیے دعا کی تھی میں تجھ سے مدینہ (منورہ) کے لیے دعا کرتا ہوں جیسے انہوں نے مکہ مکرمہ کے لیے کی تھی بلکہ ایسی ہی ایک اور بھی۔ آپ کسی چھوٹے بچے کو بلا کر وہ پھل اسے عطا فرما دیا کرتے۔ (4)

انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جاؤ اپنے بچوں میں سے کسی ایک کو ہماری خدمت کے لیے لے آؤ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مجھے لے کر حاضر ہوئے میں اب سفر وحضر میں حاضر خدمت رہنے لگا۔ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے آ رہے تھے جب احد پہاڑ پر نظر پڑی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ پہاڑ ہم سے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ جب مدینہ نظر آیا تو فرمانے لگے یا اللہ میں اس کے دونوں کناروں کے درمیان کی جگہ کو حرم مقرر کرتا ہوں جیسے ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرم بنایا اے اللہ ان کے مد اور صاع میں اور ناپ میں برکت دے۔ (5) اور روایت میں ہے یا اللہ جتنی برکت تو نے مکہ میں دی ہے اس سے دگنی برکت مدینہ میں

---

(1) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الایمان : باب الاسرآء برسول اللہ (١٦٦)]

(2) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الطھارۃ : باب وجوب الغسل البول وغیرہ (٢٨٥)]

(3) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الحج : باب فضل المدینۃ (١٣٦٢)]

(4) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الحج : باب فضل المدینۃ (١٣٧٣) ابن ماجہ : کتاب الاطعمۃ (٣٣٢٩) ترمذی : کتاب الدعوات (٣٤٥٤)]

(5) [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الجھاد : باب فضل الخدمۃ فی العزو (٢٨٨٩) صحیح مسلم : کتاب الحج : باب فضل المدینۃ (١٣٦٥) مسند احمد (٣/١٥٩ـ ٢٤٢)]

دے [1] اور روایت میں ہے مدینہ میں قتل نہ کیا جائے اور چارے کے سوا اور پتے بھی یہاں کے درختوں کے نہ جھاڑے جائیں اسی مضمون کی حدیثیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینہ بھی مثل مکہ کے حرم ہے اور بھی بہت سی ہیں۔

یہاں ان احادیث کے وارد کرنے سے ہماری غرض مکہ شریف کی حرمت اور یہاں کا امن بیان کرنا ہے' بعض تو کہتے ہیں کہ یہ شروع سے حرم اور مامن ہے۔ بعض کہتے ہیں خلیل اللہ کے زمانہ سے لیکن پہلا قول زیادہ ظاہر ہے بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ والے دن فرمایا جب سے اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین پیدا کیے تب سے اس شہر کو حرمت وعزت والا بنایا ہے اب یہ قیامت تک حرمت وعزت والا ہی رہے گا اس میں جنگ وقتال کسی کو حلال نہیں میرے لیے بھی صرف آج کے دن ہی ذرا سی دیر کے لیے حلال ہوا تھا اب وہ حرام ہی حرام ہے سنو اس کے کانٹے نہ کاٹے جائیں اس کا شکار نہ بھگایا جائے۔ اس میں کسی کی گری پڑی چیز نہ اٹھائی جائے ہاں جو پہنچوائی جائے اس کے لیے اٹھانا جائز ہے اس کی گھاس نہ کاٹی جائے دوسری روایت میں ہے کہ یہ حدیث آپ نے اثنائے خطبہ میں بیان فرمائی تھی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ نے اذخر نامی گھاس کے کاٹنے کی اجازت دی تھی۔ [2]

حضرت ابوشریح عدوی رضی اللہ عنہ نے عمرو بن سعید سے اس وقت کہا جب وہ مکہ کی طرف لشکر بھیج رہا تھا کہ اے امیر سن فتح مکہ والے دن صبح ہی صبح رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں فرمایا جسے میرے کانوں نے سنا دل نے یاد رکھا اور میں نے آنکھوں سے حضور ﷺ کو اس وقت دیکھا آپ ﷺ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ مکہ کو رب ذوالجلال نے حرم کیا ہے لوگوں نے نہیں کیا' کسی ایماندار کو اس میں خون بہانا یا اس کا درخت کاٹنا حلال نہیں۔ اگر کوئی میری اس لڑائی کو دلیل بنائے تو کہہ دینا کہ میرے لیے صرف آج ہی کے دن کی ایسی ساعت یہاں جہاد حلال تھا۔ پھر اس شہر کی حرمت آ گئی ہے جیسے کل تھی۔ خبردار ہر حاضر غائب کو یہ پہنچا دے لیکن عمرو نے یہ حدیث سن کر صاف جواب دے دیا کہ میں تجھ سے زیادہ اس حدیث کو جانتا ہوں۔ حرم نافرمان کو اور خونی کو اور بربادی کرنے والے کو نہیں بچاتا۔ (بخاری' مسلم) [3]

ان دونوں احادیث میں کوئی تعارض نہ سمجھے تطبیق یوں ہے کہ مکہ روز اول سے حرمت والا تھا لیکن اس حرمت کی تبلیغ حضرت خلیل اللہ نے کی جس طرح آنحضرت نبی ﷺ تو اس وقت سے تھے جب کہ حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر گوندھ رکھا تھا بلکہ آپ ﷺ اس وقت بھی خاتم الانبیاء لکھے ہوئے تھے [4] لیکن تاہم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

---

[1] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب فضائل المدینة (١٨٨٥) صحیح مسلم : کتاب الحج : باب فضل المدینة (١٣٦٩) مسند احمد (١٤٢/٣)]

[2] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب جزاء الصید : باب لا یحل القتال بمکة (١٨٣٤) صحیح مسلم : کتاب الحج : باب تحریم مکه (١٣٥٣)]

[3] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب جزاء الصید : باب لا یعضد شجر الحرم (١٨٣٢) صحیح مسلم : کتاب الحج : باب تحریم مکه (١٣٥٣)]

[4] [صحیح بالشواهد : مسند احمد (١٢٧/٤۔١٢٨) ابن حبان (٦٤٠٤) مستدرك حاکم (٦٠٠/٢) حافظ زبیر علی زئی اس کی سند کو حسن کہتے ہیں۔]

آپ ﷺ کی نبوت کی دعا کی کہ ﴿وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ (البقرہ/۱۲۹) ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیج جو اللہ نے پوری کی اور تقدیر کی لکھی ہوئی وہ بات ظاہر و باہر ہوئی۔ ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آپ سے کہا کہ آپ اپنی ابتدا نبوت کا تو کچھ ذکر کیجئے۔ آپ نے فرمایا میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی بشارت اور میری ماں کا خواب وہ دیکھتی ہیں کہ ان سے گویا ایک نور نکلا جس نے شام کے محلات کو روشن کر دیا اور وہ نظر آنے لگے۔ [1]

مدینہ افضل یا مکہ؟ اس بات کا بیان کہ مکہ افضل ہے یا مدینہ؟ جیسا کہ جمہور کا قول ہے جیسے کہ امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے تابعین کا مذہب ہے مدینہ افضل ہے مکہ سے۔ اسے دونوں طرف کے دلائل کے ساتھ عنقریب ہم بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ اس جگہ کو امن والا شہر بنا یعنی یہاں کے رہنے والوں کو نڈر اور بے خوف رکھ۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے جیسے کہ فرمایا ﴿وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ اٰمِنًا﴾ [2] اس میں جو آیا وہ امن والا ہو گیا۔ اور جگہ ارشاد ہے: ﴿اَوَلَمْ يَرَوْا﴾ الخ [3] کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے حرم کو امن والا بنایا لوگ اس کے آس پاس سے اچک لیے جاتے ہیں اور یہاں وہ پرامن رہتے ہیں۔ اسی قسم کی اور آیتیں بھی ہیں اور اس مضمون کی بہت سی حدیثیں بھی اوپر گذر چکی ہیں کہ مکہ شریف میں قتال حرام ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے کسی کو حلال نہیں کہ مکہ میں ہتھیار اٹھائے۔ [4] (صحیح مسلم) آپ ﷺ کی یہ دعا حرمت کعبۃ اللہ کی بنا سے پہلے تھی اس لیے کہا کہ اے اللہ اس جگہ کو امن والا شہر بنا' سورہ ابراہیم میں یہی دعا ان لفظوں میں ہے ﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا﴾ (ابراھیم/۳۵) شاید یہ دعا دوبارہ کی تھی۔ جب بیت اللہ شریف تیار ہو گیا اور شہر بس گیا اور حضرت اسحاق علیہ السلام جو حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تین سال چھوٹے تھے تولد ہو چکے اسی لیے اس دعا کے آخر میں ان کی پیدائش کا شکر یہ بھی ادا کیا۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ﴾ سے آخر تک اللہ تعالیٰ کا کلام ہے بعض نے اسے بھی دعا میں داخل کیا ہے تو اس تقدیر پر یہ مطلب ہو گا کہ کفار کو بھی تھوڑا سا فائدہ دے پھر انہیں عذاب کی طرف بے بس کر اس میں بھی ابراہیم علیہ السلام کی خلّت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنی بری اولاد کے بھی مخالف ہیں اور اسے کلام اللہ ماننے کا یہ مطلب ہو گا کہ چونکہ امامت کا سوال جب اپنی اولاد کے لیے کیا اور ظالموں کی محرومی کا اعلان سن چکے اور معلوم ہو گیا کہ آپ کے پیچھے آنے والوں میں بھی اللہ کے نافرمان ہوں گے تو مارے ڈر کے ادب کے ساتھ بعد میں آنے والی نسلوں کی روزی طلب کرتے ہوئے صرف ایماندار اولاد کے لیے کہا۔ مگر ارشاد باری ہوا کہ دنیاوی فائدہ تو کفار کو بھی دیتا ہوں جیسے اور جگہ ہے: ﴿كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ﴾ (الاسراء/ ۲۰) الخ یعنی ہم انہیں اور ان کو بھی فائدہ دیں

---

[1] [حسن: طیالسی (۱۱٤۰) مسند احمد (۲٦۲/۵) ابن سعد (۱۰۲/۱)] شیخ البانی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ [السلسلة الصحيحة (٤/٦٢)] حافظ زبیر علی زئی بھی اس کی سند کو حسن کہتے ہیں۔]

[2] [سورة آل عمران: آیت ۹۷] [3] [سورة العنكبوت: آیت ٦٧]

[4] [صحیح: صحيح مسلم: كتاب الحج: باب النهي عن حمل السلاح بمكة (۱۳۵٦)]

گے تیرے رب کی بخشش محدود نہیں اور جگہ ہے جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پاتے دنیا کا کچھ فائدہ گو اٹھا لیں لیکن ہماری طرف آ کر اپنے کفر کے بدلے سخت عذاب چکھیں گے اور جگہ ہے [1] کافروں کا کفر تجھے غمگین نہ کرے جب یہ ہماری طرف لوٹیں گے تو ان کے اعمال پر ہم انہیں تنبیہ کریں گے اللہ تعالیٰ سینوں کی چھپی باتوں کو بخوبی جانتا ہے ہم انہیں یونہی سا فائدہ پہنچا کر سخت غیظ عذابوں کی طرف بے قرار کریں گے [2] اور جگہ ہے ﴿وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ﴾ (الزخرف/ ۳۳) الخ اگر یہ خطرہ نہ ہوتا کہ لوگ ایک ہی امت ہو جائیں تو ہم کافروں کی چھتیں اور سیڑھیاں چاندی کی بنا دیتے اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جن پر ٹیکیں لگائے بیٹھے رہتے اور سونا بھی دیتے لیکن یہ سب دنیوی فوائد ہیں آخرت کا بھلا گھر تو صرف پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

یہی مضمون پرہیزگاروں کے لیے ہے۔ یہی مضمون اس آیت میں بھی ہے کہ ان کا انجام برا ہے یہاں ڈھیل پا لیں گے لیکن وہاں سخت پکڑ ہوگی۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ﴾ (الحج /۴۸) الخ بہت سی ظالم بستیوں کو ہم نے مہلت دی پھر پکڑ لیا انجام کو تو ہمارے ہی پاس لوٹنا ہے بخاری و مسلم کی حدیث میں ہے گندی باتوں کو سن کر صبر کرنے میں اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں لوگ اس کی اولاد بتاتے ہیں لیکن تاہم وہ انہیں رزق و عافیت دے رہا ہے [3] اور حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ ظالم کو ڈھیل دیتا ہے پھر اسے اچانک پکڑ لیتا ہے [4]

پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ﴾ (هود/ ۱۰۲) الخ [5] اس جملہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں شامل کرنا شاذ قرات کی بنا پر ہے جو ساتوں قاریوں کی قرات کے خلاف ہے اور ترکیب سیاق و سباق بھی بظاہر اس کا انکار کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔ اس لیے کہ ﴿قَالَ﴾ کی ضمیر کا مرجع اللہ کی طرف ہے اور اس شاذ قرات کی بنا پر اس کے فاعل اور قائل بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہوتے ہیں جو نظم کلام سے بظاہر مخالف ہے واللہ اعلم۔

"قَوَاعِدُ" جمع ہے قَاعِدَةٌ کی، ترجمہ اس کا پایہ اور نیو ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے نبی (ﷺ) اپنے والوں کو بنائے ابراہیمی کی خبر دو! ایک قرات میں "وَاِسْمَاعِيْلُ" کے بعد "وَيَقُوْلَانِ" بھی ہے اسی کی دلالت میں آگے لفظ "مُسْلِمَيْنِ" بھی ہے دونوں نبی نیک کام میں مشغول ہیں اور قبول نہ ہونے کا کھٹکا ہے تو اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے ہیں حضرت وہیب بن ورد رحمہ اللہ جب اس آیت کی تلاوت کرتے تو بہت روتے اور فرماتے آہ! خلیل الرحمن علیہ السلام جیسے اللہ کے مقبول پیغمبر اللہ کا کام اللہ کے حکم سے کرتے ہیں اس کا گھر اس کے فرمان

---

[1] [سورۃ یونس : آیت ۷۰] [2] [سورۃ لقمان : آیت ۲۳۔ ۲۴]

[3] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الادب : باب الصبر فی الاذی (۶۰۹۹) صحیح مسلم : کتاب صفات المنافقین : باب لا احدا صبر علی اذی (۲۸۰۴)]

[4] [فتح الباری (۸/ ۲۰۵)]

[5] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب التفسیر سورہ ہود : باب و کذلک اخذ ربك اذا اخذ القری (۴۶۸۶) صحیح مسلم : کتاب البر والصلة : باب تحریم الظلم (۲۵۸۳) ابن ماجه : کتاب الفتن : باب العقوبات (۴۰۱۸) ترمذی : کتاب تفسیر القرآن سورہ ہود (۳۱۱۰)]

سے بناتے ہیں اور پھر خوف ہے کہ کہیں یہ قبولیت سے گر نہ جائے سچ ہے مخلص مومنوں کا یہی حال ہے ﴿يُؤْتُونَ مَآ آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ (المومنون / ٦٠) وہ نیک کام کرتے ہیں صدقے خیرات کرتے ہیں لیکن پھر بھی خوف اللہ سے کانپتے رہتے ہیں (کہ ایسا نہ ہو کہ قبول نہ ہوں) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوال پر اس آیت کا یہی مطلب زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان ہوا ہے [1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بنیادیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اٹھاتے تھے اور دعا حضرت اسماعیل علیہ السلام کرتے تھے لیکن صحیح یہی ہے کہ دونوں ہر ایک کام میں شریک تھے صحیح بخاری شریف کی ایک روایت اور بعض اور آثار بھی اس واقعہ کے متعلق یہاں ذکر کیے جانے کے قابل ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کمر بند باندھنا عورتوں نے حضرت اسماعیل کی والدہ محترمہ سے سیکھا ہے انہوں نے اسے باندھا تھا کہ حضرت مائی سارہ رضی اللہ عنہا کو ان کا نقش قدم نہ ملے انہیں اور ان کے جگر کے ٹکڑے اپنے اکلوتے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نکلے جبکہ یہ پیارا بچہ دودھ پیتا تھا۔

سناٹے کی آغوش میں زندگی: اب جہاں پر بیت اللہ بنا ہوا ہے یہاں ایک ٹیلہ تھا اور سنسان بیابان تھا کوئی رہنے سہنے والا وہاں نہ تھا یہاں پہنچ کر ماں بیٹے کو بٹھا کر پاس تھوڑی سی کھجوریں اور ایک مشکیزہ پانی کا رکھ کر آپ چلے گئے جب خلیل اللہ علیہ السلام نے پیٹھ موڑی اور جانے لگے تو مائی ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے آواز دی اے خلیل اللہ ہمیں اس دہشت و وحشت والے بیابان میں یکہ وتنہا چھوڑ کر جہاں ہمارا کوئی مونس و ہمدم نہیں آپ کہاں تشریف لے جارہے ہیں؟ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس طرف توجہ تک نہ کی' منہ موڑ کر بھی نہ دیکھا۔

حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کے بار بار کہنے پر بھی جب آپ علیہ السلام نے التفات نہ فرمایا تو آپ فرمانے لگیں اللہ کے خلیل آپ ہمیں کسے سونپ چلے؟ آپ نے کہا اللہ تعالیٰ کو۔ کہا اے خلیل اللہ کیا اللہ تعالیٰ کا آپ کو یہ حکم ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں مجھے اللہ کا یہی حکم ہے یہ سن کر ام اسماعیل رضی اللہ عنہا کو تسکین ہوگئی اور فرمانے لگیں پھر تشریف لے جائیے وہ اللہ جل شانہ ہمیں ہرگز ضائع نہ کرے گا اسی کا بھروسہ اور اسی کا سہارا ہے۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا لوٹ گئیں اور اپنے کلیجہ کی ٹھنڈک اپنی آنکھوں کے نور' ابن نبی اللہ کو گود میں لے کر اس سنسنان بیابان میں اس ہو کے عالم میں لاچار اور مجبور ہو کر بیٹھ رہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب ثنیہ کے پاس پہنچے اور یہ معلوم کر لیا کہ اب حضرت ہاجرہ پیچھے نہیں اور وہاں سے یہاں تک ان کی نگاہ کام بھی نہیں کر سکتی تو بیت اللہ شریف کی طرف متوجہ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور کہا ﴿رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ﴾ (ابراهیم / ٣٧) الخ الہ العالمین میں نے اپنے بال بچوں کو ایک غیر آباد جنگل میں تیرے برگزیدہ گھر کے پاس چھوڑا ہے تاکہ وہ نماز قائم کریں تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکا دے اور انہیں پھلوں کی روزیاں دے شاید وہ شکر گذاری کریں آپ تو یہ دعا کر کے حکم اللہ بجالا کر اپنی اہل و عیال کو اللہ کے سپرد کر کے چلے گئے۔

---

[1] [صحیح: ترمذی: كتاب تفسير القرآن سورة المومنون (٣١٧٥) ابن ماجه: كتاب الزهد: باب التوقى على العمل (٤١٩٨)] شیخ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔[صحيح ترمذی (٢٥٣٧) صحيح ابن ماجه (٤١٩٨) السلسلة الصحيحة (١٦٢) المشكاة (٥٣٥٠)] حافظ زبیر علی زئی اسے حسن کہتے ہیں۔]

ادھر حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا صبر وشکر کے ساتھ بچے سے دل بہلانے لگیں جب تھوڑی سی کھجوریں اور ذرا سا پانی ختم ہوگیا اب اناج کا ایک دانہ پاس ہے نہ پانی کا گھونٹ خود بھی بھوکی پیاسی ہیں اور بچہ بھی بھوک پیاس سے بیتاب ہے یہاں تک کہ اس معصوم نبی زادے کا پھول سا چہرہ کملانے لگا اور وہ تڑپنے اور بلکنے لگا ماماتا بھری ماں کبھی اپنی تنہائی اور بے کسی کا خیال کرتی ہے کبھی اپنے ننھے سے اکلوتے بچے کا یہ حال بغور دیکھتی ہے اور سہمی جاتی ہے معلوم ہے کہ کسی انسان کا گذر اس بھیانک جنگل میں نہیں' میلوں تک آبادی کا نام ونشان نہیں کھانا تو کہاں؟ پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں آسکتا۔

آخر اس ننھی سی جان کا یہ ابتر حال نہیں دیکھا جاتا تو اٹھ کر چلی جاتی ہیں اور صفا پہاڑ جو پاس ہی تھا اس پر چڑھ جاتی ہیں اور میدان کی طرف نظریں دوڑاتی ہیں کہ کوئی آتا جاتا نظر آئے لیکن نگاہیں مایوسی کے ساتھ چاروں طرف سے واپس آتی ہیں تو اتر کر وادی میں پہنچ کر دامن اٹھا کر دوڑتی ہوئی مروہ پہاڑ کی طرف جاتی ہیں اس پر چڑھ کر نگاہیں چاروں طرف ڈالتی ہیں اور کسی کو بھی نہ دیکھ کر پھر وہاں سے اتر آتی ہیں اور اسی طرح درمیانی تھوڑا سا حصہ دوڑ کر باقی حصہ جلدی جلدی طے کر کے پھر صفا پر چڑھتی ہیں اسی طرح سات مرتبہ کرتی ہیں ہر بار آکر بچہ کو دیکھ جاتی ہیں کہ اس کی حالت ساعت بہ ساعت بگڑتی جارہی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں صفا مروہ کی سعی جو حاجی کرتے ہیں اس کی ابتداء یہی سے سا تویں مرتبہ جب حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا مروہ پر آتی ہیں تو کچھ آواز کان پر پڑتی ہے آپ خاموش ہوکر احتیاط کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ یہ آواز کیسی؟ آواز پھر آتی ہے اور اس مرتبہ صاف سنائی دیتی ہے تو آپ آواز کی طرف لپک کر آتی ہیں اور اب جہاں زمزم ہے وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو پاتی ہیں۔

حضرت جبرئیل پوچھتے ہیں تم کون ہو؟ آپ جواب دیتی ہیں میں ہاجرہ ہوں میں حضرت ابراہیم کے لڑکے کی ماں ہوں فرشتہ پوچھتا ہے ابراہیم علیہ السلام تمہیں اس سنسان بیابان میں کسے سونپ گئے ہیں؟ آپ فرماتی ہیں اللہ کو فرمایا پھر تو وہ کافی ہے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اے غیبی شخص آواز تو میں نے سن لی کیا کچھ میرا کام بھی نکلے گا؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنی ایڑی زمین پر رگڑی وہیں زمین سے ایک چشمہ پانی کا ابلنے لگا۔ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے ہاتھوں سے اس پانی کو مشک میں بھرنا شروع کیا مشک پُر کر کے پھر اس خیال سے کہ پانی ادھر ادھر بہ کر نکل نہ جائے آس پاس باڑ باندھنی شروع کردی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ ام اسماعیل پر رحم کرے اگر وہ اس طرح پانی کو نہ روکتیں تو زمزم کنویں کی شکل میں نہ ہوتا بلکہ وہ ایک جاری نہر کی صورت میں ہوتا اب حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے پانی پیا اور بچہ کو بھی پلایا اور دودھ پلانے لگیں فرشتے نے کہہ دیا کہ تم بے فکر رہو اللہ تمہیں ضائع نہ کرے گا جہاں تم بیٹھی ہو یہاں اللہ کا ایک گھر اس بچے اور اس کے باپ کے ہاتھوں بنے گا حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا اب یہیں رہ پڑیں زمزم کا پانی پیتیں اور بچہ سے دل بہلاتیں بارش کے موسم میں پانی کے سیلاب چاروں طرف سے آتے لیکن یہ جگہ ذرا اونچی تھی ادھر ادھر سے پانی گذر جاتا ہے اور یہاں امن رہتا کچھ مدت کے بعد جرہم کا قبیلہ کدا کے راستہ کی طرف سے اتفاقاً گذرا اور مکہ شریف کے نیچے کے حصہ میں اترا ان کی نظریں ایک آبی پرند پر پڑیں تو آپس میں کہنے لگے یہ پرندہ تو

پانی کا ہے اور یہاں پانی کبھی نہ تھا ہماری آمدورفت یہاں سے کئی مرتبہ ہوئی یہ تو خشک جنگل اور چٹیل میدان ہے یہاں پانی کہاں؟ چنانچہ انہوں نے اپنے آدمی اصلیت معلوم کرنے کے لیے بھیجے انہوں نے واپس آ کر خبر دی کہ وہاں تو بہترین اور بہت سا پانی ہے اب وہ سب آئے اور حضرت ام اسماعیل رضی اللہ عنہا سے عرض کرنے لگے کہ مائی صاحبہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم بھی یہاں ٹھہر جائیں پانی کی جگہ ہے آپ نے فرمایا ہاں شوق سے رہو لیکن پانی پر قبضہ میرا ہی رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ہاجرہ تو چاہتی تھی کہ کوئی ہم جنس مل جائے چنانچہ یہ قافلہ یہاں رہ پڑا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی بڑے ہو گئے ان سب کو آپ سے بڑی ہی محبت ہو گئی یہاں تک کہ جب آپ بالغ ہوئے تو انہی میں نکاح بھی کیا اور انہی سے عربی بھی سیکھی۔ مائی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا انتقال یہیں ہوا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ملی تو آپ اپنے لخت جگر کی ملاقات کے لیے تشریف لائے بعض روایات میں ہے کہ آپ کا یہ آنا جانا براق پر ہوتا تھا ملک شام سے آتے تھے اور پھر واپس جاتے تھے یہاں آئے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام گھر پر نہ ملے اپنی بہو سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ تو جواب ملا کہ کھانے پینے کی تلاش میں یعنی شکار کو گئے ہیں آپ نے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ کہا برا حال ہے بڑی تنگی اور سختی ہے فرمایا اچھا تمہارے خاوند آئیں تو انہیں سلام کہنا اور کہہ دینا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالیں۔

حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام جب واپس آئے تو گویا آپ کو کچھ انس سا معلوم ہوا پوچھنے لگے کیا کوئی صاحب تشریف لائے تھے؟ بیوی نے کہا ہاں ایسی ایسی شکل و شباہت کے ایک عمر رسیدہ بزرگ آئے تھے؟ آپ کی نسبت پوچھا میں نے کہا وہ شکار کی تلاش میں باہر گئے ہیں پھر پوچھا کہ گذران کیسی چلتی ہے؟ میں نے کہا بڑی سختی اور تنگی سے گذر اوقات ہوتی ہے پوچھا کچھ مجھ سے کہنے کو بھی فرما گئے ہیں؟ بیوی نے کہا ہاں کہہ گئے کہ جب وہ آئیں میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل ڈالیں آپ فرمانے لگے بیوی سنو یہ میرے والد صاحب تھے اور جو فرما گئے ہیں اس سے مطلب یہ ہے کہ (چونکہ تم نے ناشکری کی) میں تم کو الگ کر دوں جاؤ میں نے تمہیں طلاق دی انہیں طلاق دے کر آپ نے اسی قبیلہ میں اپنا دوسرا نکاح کر لیا۔

ایک مدت کے بعد پھر حضرت ابراہیم باجازت الٰہی یہاں آئے اب کی مرتبہ بھی اتفاقاً حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام سے ملاقات نہ ہوئی بہو سے پوچھا تو جواب ملا کہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں شکار کو گئے ہیں آپ آیئے تشریف رکھئے جو کچھ حاضر ہے تناول فرمایئے۔ آپ نے فرمایا یہ تو بتاؤ کہ گذر بسر کیسی ہوتی ہے؟ کیا حال ہے؟ جواب ملا الحمدللہ ہم خیریت سے ہیں اور بفضل رب کعبہ کشادگی اور راحت ہے اللہ کا بڑا شکر ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تمہاری خوراک کیا ہے؟ کہا گوشت پوچھا تم پیتے کیا ہو؟ جواب ملا پانی آپ نے دعا کی کہ پروردگار انہیں گوشت اور پانی میں برکت دے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر اناج ان کے پاس ہوتا اور یہ کہتیں تو حضرت خلیل علیہ السلام ان کے لیے اناج کی برکت کی دعا بھی کرتے اب اس دعا کی برکت سے اہل مکہ صرف گوشت اور پانی پر گذر کر سکتے ہیں۔ اور لوگ نہیں کر سکتے آپ نے فرمایا اچھا میں تو جا رہا ہوں تم اپنے میاں کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ وہ اپنی چوکھٹ کو ثابت اور آباد رکھیں ازاں بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے سارا واقعہ معلوم ہوا آپ نے

فرمایا یہ میرے والد مکرم تھے مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تمہیں الگ نہ کروں (تم شکر گذار ہو)۔

کعبہ کی تعمیر: پھر ایک مدت کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اجازت ملی اور آپ تشریف لائے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کو زمزم کے پاس ایک ٹیلے پر تیر سیدھے کرتے ہوئے پایا' حضرت اسماعیل علیہ السلام باپ کو دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اور باادب ملے جب باپ بیٹے ملے تو خلیل اللہ علیہ السلام نے فرمایا اے اسماعیل مجھے اللہ کا ایک حکم ہوا ہے آپ نے فرمایا ابا جان جو حکم ہوا ہو اس کی تعمیل کیجئے' کہا بیٹا تمہیں بھی میرا ساتھ دینا پڑے گا۔ عرض کرنے لگے بہت بہتر اب باپ بیٹوں نے بیت اللہ کی نیو رکھی اور دیواریں اونچی کرنی شروع کیں' حضرت اسماعیل علیہ السلام پتھر لا لا کر دیتے جاتے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام چنتے جاتے تھے جب دیواریں قدرے اونچی ہوگئیں تو حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام یہ پتھر یعنی مقام ابراہیم کا پتھر لائے' اس اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کعبہ کے پتھر رکھتے جاتے تھے اور دونوں باپ بیٹے یہ دعا مانگتے جاتے تھے کہ باری تعالیٰ تو ہماری اس ناچیز خدمت کو قبول فرما تو سننے اور جاننے والا ہے [1] یہ روایت اور کتب حدیث میں بھی ہے کہیں مختصراً اور کہیں مفصلاً ایک صحیح حدیث میں بھی ہے کہ حضرت ذبیح اللہ علیہ السلام کے بدلے جو دنبہ ذبح ہوا تھا اس کے سینگ بھی کعبۃ اللہ میں تھے۔ [2]

اوپر کی لمبی روایت بروایت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی مروی ہے کہ اس میں یہ بھی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جب بیت اللہ شریف کے قریب پہنچے تو آپ نے اپنے سر پر ایک بادل سا ملاحظہ فرمایا جس میں سے آواز آئی کہ اے ابراہیم جہاں جہاں تک اس بادل کا سایہ ہے وہاں تک کی زمین بیت اللہ میں لے لو کمی زیادتی نہ ہو اس روایت میں یہ بھی ہے کہ بیت اللہ بنا کر وہاں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو چھوڑ کر آپ تشریف لے گئے لیکن پہلی روایت ہی ٹھیک ہے اور اس طرح تطبیق بھی ہو سکتی ہے کہ بنا پہلے رکھ دی تھی لیکن بنایا بعد میں' اور بنانے میں بیٹا اور باپ دونوں شامل تھے جیسے کہ قرآن پاک کے الفاظ بھی ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بناء بیت اللہ کی شروع کیفیت دریافت کی تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ میرا گھر بناؤ حضرت ابراہیم علیہ السلام گھبرائے کہ مجھے کہاں بنانا چاہیے کس طرح اور کتنا بڑا بنانا چاہیے وغیرہ اس پر سکینہ نازل ہوا اور حکم ہوا کہ جہاں یہ ٹھہرے وہاں تم میرا گھر بناؤ آپ نے بنانا شروع کیا جب حجر اسود کی جگہ پہنچے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام سے کہا بیٹا کوئی اچھا سا پتھر ڈھونڈ لاؤ آپ پتھر ڈھونڈ لائے تو دیکھا کہ آپ اور پتھر وہاں لگا چکے ہیں' پوچھا یہ پتھر کون لایا؟ آپ نے فرمایا اللہ کے حکم سے یہ پتھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان سے لے کر آئے' حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اب جہاں بیت اللہ ہے وہاں زمین کی پیدائش سے پہلے پانی پر بلبلوں کے ساتھ جھاگ سی تھی یہیں سے زمین پھیلائی گئی' حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کعبۃ اللہ بنانے کے لیے حضرت خلیل اللہ علیہ السلام آرمینیہ سے تشریف لائے تھے' حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء: باب یزفون النسلان فی المشی (۳۳۶۵)]

[2] [صحیح: مسند احمد (۱/ ۶۰۱) ابو داود (۲۰۳۰)] شیخ البانیؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔[صحیح ابو داود (۱۷۸۶)] حافظ زبیر علی زئی اسے حسن کہتے ہیں۔]

حجر اسود حضرت جبرئیل علیہ السلام ہند سے لائے تھے اس وقت وہ سفید چمکدار یاقوت تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے اترا تھا پھر لوگوں کے خطا کار ہاتھوں سے اس کا رنگ سیاہ ہوگیا اس روایت میں یہ بھی ہے کہ نیو اور بنیادیں پہلے سے موجود تھیں انہی پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنا کی' مسند عبدالرزاق میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ہند میں اترے تھے اس وقت ان کا قد لمبا تھا زمین میں آنے کے بعد فرشتوں کی تسبیح نماز ودعا وغیرہ سنتے تھے جب قد گھٹ گیا اور وہ پیاری آوازیں آنی بند ہوگئیں تو آپ گھبرانے لگے حکم ہوا کہ مکہ کی طرف جاؤ آپ چلے جہاں جہاں آپ کا قدم پڑا وہاں آبادی ہوئی اللہ تعالیٰ نے یہاں ایک یاقوت جنت سے اتارا اور بیت اللہ کی جگہ رکھا اور اسے اپنا گھر قرار دیا' حضرت آدم علیہ السلام یہاں طواف کرنے لگے اور مانوس ہوئے گھبراہٹ جاتی رہی حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کے زمانہ میں یہ پھر اٹھ گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں پھر اللہ تعالیٰ نے بنوایا حضرت آدم علیہ السلام نے یہ گھر حرا طور زیتا جبل لبنان طور سینا اور جودی ان پانچ پہاڑوں سے بنایا تھا لیکن ان تمام روایتوں میں تفاوت ہے واللہ اعلم۔ بعض روایتوں میں ہے کہ زمین کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے بیت اللہ بنایا گیا تھا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بیت اللہ کے نشان بتانے کے لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام چلے تھے اس وقت یہاں جنگلی درختوں کے سوا کچھ نہ تھا دور عمالیق کی آبادی تھی یہاں آپ حضرت ام اسماعیل رضی اللہ عنہا کو اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ایک چھپر تلے بٹھا گئے ایک اور روایت میں ہے کہ بیت اللہ کے چار ارکان ہیں اور ساتویں زمین تک وہ نیچے ہوتے ہیں ایک اور روایت میں ہے کہ ذوالقرنین جب یہاں پہنچے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ بناتے ہوئے دیکھا تو پوچھا یہ کیا کر رہے ہو؟ تو انہوں نے کہا اللہ کے حکم سے اس کا گھر بنا رہے ہیں پوچھا کیا دلیل؟ کہا یہ بھیڑیں گواہی دیں گی پانچ بھیڑوں نے کہا ہم گواہی دیتی ہیں کہ یہ دونوں اللہ کے مامور ہیں' ذوالقرنین خوش ہوگئے اور کہنے لگے میں نے مان لیا ازرقی کی تاریخ مکہ میں ہے کہ ذوالقرنین نے خلیل اللہ علیہ السلام اور ذبیح اللہ علیہ السلام کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کیا واللہ اعلم۔ صحیح بخاری میں ہے قواعد بنیان اور اساس کو کہتے ہیں یہ قَاعِدَۃٌ کی جمع ہے قرآن میں اور جگہ ﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ﴾ [1] بھی آیا اس کا مفرد بھی قَاعِدَۃٌ ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کیا تم نہیں دیکھتیں کہ تمہاری قوم نے جب بیت اللہ بنایا تو قواعد ابراہیم سے گھٹا دیا میں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ اسے بڑھا کر اصلی بنا پر کردیں فرمایا کہ اگر تیری قوم کا اسلام تازہ اور ان کا زمانہ کفر قریب نہ ہوتا تو میں ایسا کر لیتا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو جب یہ حدیث پہنچی تو فرمانے لگے شاید یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجر اسود کے پاس کے دوستونوں کو چھوتے نہ تھے [2] صحیح مسلم شریف میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اے عائشہ رضی اللہ عنہا اگر تیری قوم کا جاہلیت کا زمانہ نہ ہوتا تو میں کعبہ کے خزانہ کو اللہ کی راہ میں خیرات کرڈالتا اور دروازے کو زمین دوز کردیتا اور حطیم کو بیت اللہ میں داخل کردیتا [3] صحیح بخاری میں

---

[1] [سورۃ النور : آیت ٦٠]

[2] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب التفسیر سورۃ البقرہ : باب اذا یرفع ابراھیم القواعد (٤٤٨٤) صحیح مسلم : کتاب الحج : باب نقض الکعبه (١٣٣٣)]

[3] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الحج : باب نقض الکعبة (١٣٣٣)]

یہ بھی ہے کہ میں اس کا دوسرا دروازہ بھی بنا دیتا ایک آنے کے لیے اور دوسرا جانے کے لیے چنانچہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے زمانہ خلافت میں ایسا ہی کیا[1] اور ایک روایت میں ہے کہ اسے میں دوبارہ بناءِ ابراہیمی پر بناتا۔[2] دوسری روایت میں ہے کہ ایک دروازہ مشرق رخ کرتا اور ایک دوسرا مغرب رخ اور چھ ہاتھ حطیم کو اس میں داخل کر لیتا جسے قریش نے باہر کر دیا ہے۔[3]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پانچ سال پہلے قریش نے نئے سرے سے کعبہ بنایا تھا اس کا مفصل ذکر ملاحظہ ہو اس بناء میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پینتیس سال کی تھی اور پتھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اٹھاتے تھے محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک پینتیس سال کی ہوئی اس وقت قریش نے کعبۃ اللہ کو نئے سرے سے بنانے کا ارادہ کیا ایک تو اس لیے کہ اس کی دیواریں بہت چھوٹی تھیں چھت نہ تھی دوسرے اس لیے بھی کہ بیت اللہ کا خزانہ چوری ہو گیا تھا جو بیت اللہ کے بیچ میں ایک گہرے گڑھے میں رکھا ہوا تھا یہ مال ''دویک'' کے پاس ملا تھا جو خزائمہ کے قبیلے بنی ملیح بن عمرو کا مولی تھا ممکن ہے چوروں نے یہاں لا رکھا ہو لیکن اس کے ہاتھ اس چوری کی وجہ سے کاٹے گئے ایک اور قدرتی سہولت بھی ان کے لیے ہو گئی تھی کہ روم کے تاجروں کی ایک کشتی جس میں بہت اعلیٰ درجہ کی لکڑیاں تھیں وہ طوفان کی وجہ سے جدہ کے کنارے آ لگی تھیں یہ لکڑیاں چھت میں کام آ سکتی تھیں اس لیے قریشیوں نے انہیں خرید لیا اور مکہ کے ایک بڑھئی جو قبطی قبیلہ میں سے تھا کو چھت کا کام سونپا۔

یہ سب تیاریاں تو ہو رہی تھیں لیکن بیت اللہ کو گرانے کی ہمت نہ پڑتی تھی اس کے قدرتی اسباب بھی مہیا ہو گئے بیت اللہ کے خزانہ میں ایک بڑا اژدھا تھا جب کبھی لوگ اس کے قریب بھی جاتے تو وہ منہ پھاڑ کر ان کی طرف لپکتا تھا یہ سانپ ہر روز اس کنویں سے نکل کر بیت اللہ کی دیواروں پر آ بیٹھتا تھا ایک روز وہ بیٹھا ہوا تھا جو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا پرندہ بھیجا وہ اسے پکڑ کر لے اڑا قریشیوں نے سمجھ لیا کہ ہمارا ارادہ مرضی ومولا کے مطابق ہے لکڑیاں بھی ہمیں مل گئیں بڑھئی بھی ہمارے پاس موجود ہے سانپ کو بھی اللہ تعالیٰ نے دفع کیا۔

اب انہوں نے مستقل ارادہ کر لیا کہ کعبۃ اللہ کو گرا کر نئے سرے سے بنائیں۔ سب سے پہلے ابو وهب بن عمرو کھڑا ہوا اور ایک پتھر کعبۃ اللہ کو گرا کر اتارا جو اس کے ہاتھ سے اڑ کر پھر وہیں جا کر نصب ہو گیا اس نے تمام قریشیوں سے خطاب کر کے کہا سنو بیت اللہ کے بنانے میں ہر شخص اپنا طیب اور پاک مال خرچ کرے۔ اس میں زناکاری کا روپیہ سودی بیوپار کا روپیہ ظلم سے حاصل کیا ہوا مال نہ لگانا' بعض لوگ کہتے ہیں یہ مشورہ ولید بن مغیرہ نے

---

[1] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب العلم : باب من ترك بعض الاختيار مخافة (١٢٦) مسلم (١٣٣٣) ترمذی (٨٧٥) ابن ماجه (٢٩٥٥)]

[2] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الحج : باب نقض الكعبة (١٣٣٣ ـ ٣٩٨)]

[3] [صحیح : صحیح مسلم (١٣٣٣ ـ ٤٠١) مسند احمد (١٧٩/٦) صحیح ابن حبان (٣٨١٨)]

دیا تھا [1] اب بیت اللہ کے حصے بانٹ لیے گئے دروازہ کا حصہ بنوعبد مناف اور زہرہ بنائیں حجر اسود اور رکن یمانی کا حصہ بنی مخزوم بنائیں۔ قریش کے اور قبائل بھی ان کا ساتھ دیں۔ کعبہ کا پچھلا حصہ بنوجمح اور سہم بنائیں۔ حطیم کے پاس کا حصہ بنوعبد الدار بن قصی اور بنو اسد بن عبد العزی اور بنوعدی بن کعب بنائیں۔ یہ مقرر کر کے اب بنی ہوئی عمارت کو ڈھانے کے لیے چلے لیکن کسی کو ہمت نہ پڑتی کہ اسے مسمار کرنا شروع کرے۔

آخر ولید بن مغیرہ نے کہا لو میں شروع کرتا ہوں کدال لے کر اوپر چڑھ گئے اور کہنے لگے اے اللہ تجھے خوب علم ہے کہ ہمارا ارادہ برا نہیں ہم تیرے گھر کو اجاڑنا نہیں چاہتے بلکہ اس کے آباد کرنے کی فکر میں ہیں۔ یہ کہہ کر کچھ حصہ دونوں رکن کے کناروں کا گرایا قریشیوں نے کہا بس اب چھوڑ دو اور رات بھر کا انتظار کرو اگر اس شخص پر کوئی وبال آجائے تو یہ پتھر اسی جگہ پر لگا دینا اور خاموش ہو جانا اور اگر کوئی عذاب نہ آئے تو سمجھ لینا کہ اس کا گرانا اللہ کو ناپسند نہیں پھر کل سب مل کر اپنے اپنے کام میں لگ جانا چنانچہ صبح ہوئی اور ہر طرح خیریت رہی اب سب آگئے اور بیت اللہ کی اگلی عمارت کو گرا دیا یہاں تک کہ اصلی نیو یعنی بناء ابراہیمی تک پہنچ گئے یہاں سبز رنگ کے پتھر تھے اور ایک دوسرے میں گویا پیوست تھے' ایک شخص نے دو پتھروں کو الگ کرنا چاہا اس میں کدال ڈال کر زور لگایا تو پتھر کے ہلنے کے ساتھ ہی تمام مکہ کی زمین ہلنے لگی تو انہوں نے سمجھ لیا کہ انہیں جدا کر کے اور پتھر ان کی جگہ لگانا اللہ کو منظور نہیں اس لیے ہمارے بس کی بات نہیں اس ارادے سے باز رہے اور ان پتھروں کو اسی طرح رہنے دیا۔ [2]

پھر ہر قبیلہ نے اپنے اپنے حصہ کے مطابق علیحدہ علیحدہ پتھر جمع کیے اور عمارت بننی شروع ہوئی یہاں تک کہ حجر اسود رکھنے کی جگہ تک پہنچے۔ اب ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ یہ شرف اسے ملے۔ آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے یہاں تک کہ باقاعدہ جنگ کی نوبت آ گئی فرقے آپس میں کھچ گئے اور لڑائی کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے بنوعبد دار اور بنوعدی نے ایک طشتری میں خون بھر کر اس میں ہاتھ ڈبو کر حلف اٹھایا کہ سب کٹ مریں گے لیکن حجر اسود کسی کو نہیں رکھنے دیں گے اسی طرح چار پانچ دن گذر گئے پھر قریش مسجد میں جمع ہوئے کہ آپس میں مشورہ اور انصاف کریں تو ابوامیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر اور عقلمند تھے کہا سنو لوگو تم اپنا منصف کسی کو بنا لو وہ جو فیصلہ کرے سب منظور کر لو۔ لیکن پھر منصف بنانے میں بھی اختلاف ہوگا اس لیے ایسا کرو کہ اب جو سب سے پہلے یہاں مسجد میں آئے وہی ہمارا منصف۔ اس رائے پر سب نے اتفاق کر لیا۔ اب منتظر ہیں کہ دیکھیں سب سے پہلے کون آتا ہے؟

پس سب سے پہلے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ آئے۔ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی یہ لوگ خوش ہو گئے اور کہنے لگے ہمیں آپ کا فیصلہ منظور ہے ہم آپ کے حکم پر رضامند ہیں یہ تو امین ہیں یہ تو محمد (ﷺ) ہیں۔ پھر سب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ آپ ﷺ کو کہہ سنایا آپ ﷺ نے فرمایا جاؤ کوئی موٹی اور بڑی سی چادر لاؤ وہ لے آئے۔ آپ ﷺ نے حجر اسود اٹھا کر اپنے دست مبارک سے اس میں رکھا پھر فرمایا ہر قبیلہ کا سردار آئے اور اس کپڑے کا کونہ پکڑ لے اور اس طرح ہر ایک حجر اسود کے اٹھانے کا حصہ دار بنے اس پر سب لوگ

---

[1] [سیرت ابن هشام (۱/۲۰٤)] [2] [سیرت ابن هشام (۱/۲۰۷)]

بہت ہی خوش ہوئے اور تمام سرداروں نے اسے تھام کر اٹھا لیا۔ جب اس کے رکھنے کی جگہ تک پہنچے تو اللہ کے نبی ﷺ نے اسے لے کر اپنے ہاتھ سے اسی جگہ رکھ دیا اور وہ نزاع واختلاف بلکہ جدال وقتال دفع ہو گیا اور اسی طرح اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے ہاتھ اپنے گھر میں اس مبارک پتھر کو نصب کرایا۔ حضور ﷺ پر وحی نازل ہونے سے پہلے قریش آپ ﷺ کو امین کہا کرتے تھے۔ اب پھر اوپر کا حصہ بنا اور کعبۃ اللہ کی عمارت تمام ہوئی ابن اسحاق مورخ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں کعبہ اٹھارہ ہاتھ کا تھا۔ پہلے قباطی کا پردہ چڑھایا جاتا تھا پھر چادر کا پردہ چڑھنے لگا۔ ریشمی پردہ سب سے پہلے حجاج بن یوسف نے چڑھایا۔ [1]

کعبہ کی یہی عمارت رہی یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں ساٹھ سال کے بعد یہاں آگ لگی اور کعبہ جل گیا۔ یہ یزید بن معاویہ کی ولایت کا آخری زمانہ تھا اور اس نے ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا مکہ میں محاصرہ کر رکھا تھا۔ ان دنوں میں خلیفہ مکہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنی خالہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جو حدیث سنی تھی اسی کے مطابق حضور ﷺ کی تمنا پر بیت اللہ کو گرا کر ابراہیمی قواعد پر بنایا حطیم اندر شامل کر لیا' مشرق ومغرب دو دروازے رکھے ایک اندر آنے کا دوسرا باہر جانے کا دروازوں کو زمین کے برابر رکھا آپ کی امارت کے زمانہ تک کعبۃ اللہ یونہی رہا یہاں تک کہ ظالم حجاج کے ہاتھوں آپ شہید ہوئے۔ اب حجاج نے عبدالملک بن مروان کے حکم سے کعبہ کو پھر توڑ کر پہلے کی طرح بنالیا۔

صحیح مسلم شریف میں ہے یزید بن معاویہ کے زمانہ میں جب کہ شامیوں نے مکہ شریف پر چڑھائی کی اور جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اس وقت حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیت اللہ کو یونہی چھوڑ دیا۔ موسم حج کے موقع پر لوگ جمع ہوئے انہوں نے یہ سب کچھ دیکھا ازاں بعد آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے مشورہ لیا کہ کیا کعبۃ اللہ سارے کو گرا کر نئے سرے سے بنائیں یا جو ٹوٹا ہوا ہے اس کی اصلاح کر لیں؟ تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا میری رائے ہے کہ آپ جو ٹوٹا ہوا ہے اسی کی مرمت کر دیں باقی سب پرانا ہی رہنے دیں۔ آپ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کا گھر جل جاتا وہ تو خوش نہ ہوتا جب تک اسے نئے سرے سے نہ بناتا پھر تم اپنے رب عزوجل کے گھر کی نسبت اتنی کمزور رائے کیوں رکھتے ہو؟ اچھا میں تین دن تک اپنے رب سے استخارہ کروں گا پھر جو سمجھ میں آئے گا وہ کروں گا۔ تین دن کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کی رائے یہی ہوئی کہ باقی ماندہ دیواریں بھی توڑی جائیں اور از سر نو کعبہ کی تعمیر کی جائے چنانچہ یہ حکم دے دیا لیکن کعبے کو توڑنے کی کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ڈر تھا کہ جو پہلے توڑنے کے لیے چڑھے گا اس پر عذاب نازل ہوگا لیکن ایک باہمت شخص چڑھ گیا اور اس نے ایک پتھر توڑا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ اسے کچھ ایذاء نہیں پہنچی تو اب ڈھانا شروع کیا اور زمین تک برابر یکساں صاف کر دیا اس وقت چاروں طرف ستون کھڑے کر دیئے تھے اور ایک کپڑا تان دیا تھا۔

اب بناء بیت اللہ شروع ہوئی۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سنا وہ

---

[1] [سیرت ابن ھشام (۱/ ۲۱۱)]

کہتی تھیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اگر لوگوں کا کفر کا زمانہ قریب نہ ہوتا اور میرے پاس خرچ بھی ہوتا جس سے میں بنا سکوں تو حطیم میں سے پانچ ہاتھ بیت اللہ میں لے لیتا اور کعبہ کے دو دروازے کرتا ایک آنے کا اور ایک جانے کا حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے یہ روایت بیان کر کے فرمایا اب لوگوں کے کفر کا زمانہ قریب کا نہیں رہا ان سے خوف جاتا رہا اور خزانہ بھی معمور ہے میرے پاس کافی روپیہ ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ میں حضور ﷺ کی تمنا پوری نہ کروں چنانچہ پانچ ہاتھ حطیم اندر لے لیا اور اب جو دیوار کھڑی کی تو ٹھیک ابراہیمی بنیاد نظر آنے لگے جو لوگوں نے اپنی آنکھوں دیکھ لی اور اسی پر دیوار کھڑی کی بیت اللہ کا طول اٹھارہ ہاتھ تھا اب جو اس میں پانچ ہاتھ اور بڑھ گیا تو چھوٹا ہو گیا اس لیے طول میں دس ہاتھ اور بڑھایا گیا اور دو دروازے بنائے گئے ایک اندر آنے کا دوسرا باہر جانے کا۔ ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی شہادت کے بعد حجاج نے عبدالملک کو لکھا اور ان سے مشورہ لیا کہ اب کیا کیا جائے؟ یہ بھی لکھ بھیجا کہ مکہ شریف کے عادلوں نے دیکھا ہے ٹھیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نیو پر کعبہ تیار ہوا ہے لیکن عبدالملک نے جواب دیا کہ طول کو تو باقی رہنے دو اور حطیم کو باہر کر دو اور دوسرا دروازہ بند کر دو۔ حجاج نے اس حکم کے مطابق کعبہ کو تڑوا کر پھر اسی بناء پر بنا دیا [1] لیکن سنت طریقہ یہی تھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی بناء کو باقی رکھا جاتا اس لیے کہ حضور علیہ السلام کی چاہت یہی تھی لیکن اس وقت آپ کو یہ خوف تھا کہ لوگ بدگمانی نہ کریں ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ لیکن یہ حدیث عبدالملک بن مروان کو نہیں پہنچی تھی اس لیے انہوں نے اسے تڑوا دیا جب انہیں حدیث پہنچی تو رنج کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کاش کہ ہم یونہی رہنے دیتے اور نہ تڑواتے۔

چنانچہ صحیح مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حارث بن عبید اللہ رحمہ اللہ جب ایک وفد میں عبدالملک بن مروان کے پاس پہنچے تو عبدالملک نے کہا میرا خیال ہے کہ ابو حبیب یعنی عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے (اپنی خالہ) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث سنی ہو گی حارث نے کہا ضرور سنی تھی خود میں نے بھی ام المومنین رضی اللہ عنہا سے سنا ہے پوچھا تم نے کیا سنا ہے؟ کہا میں نے سنا ہے آپ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ عائشہ تیری قوم نے بیت اللہ کو تنگ کر دیا۔ اگر تیری قوم کا زمانہ شرک قریب نہ ہوتا تو میں نئے سرے سے ان کی کمی کو پورا کر دیتا لیکن آؤ میں تجھے اصلی نیو بتا دوں شاید کسی وقت تیری قوم پھر اسے اس کی اصلیت پر بنانا چاہے تو آپ ﷺ نے حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کو حطیم سے قریباً سات ہاتھ اندر داخل کرنے کو فرمایا اور فرمایا میں اس کے دو دروازے بنا دیتا ایک آنے کے لیے اور دوسرا جانے کا اور دونوں دروازے زمین کے برابر رکھتا ایک مشرق رخ رکھتا دوسرا مغرب رخ جانتی بھی ہو کہ تمہاری قوم نے دروازے کو اتنا اونچا کیوں رکھا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا حضور ﷺ مجھے خبر نہیں فرمایا محض اپنی اونچائی اور بڑائی کے لیے کہ جسے چاہے اندر جانے دیں اور جسے چاہیں داخل نہ ہونے دیں جب کوئی شخص اندر جانا چاہتا تو اسے اوپر سے دھکا دے دیتے وہ گر پڑتا اور جسے داخل کرنا چاہتے اسے ہاتھ تھام کر اندر لے لیتے۔ عبدالملک نے کہا اسے حارث نے خود سنا ہے تو تھوڑی دیر تک تو عبدالملک اپنی لکڑی ٹکائے

---

[1] [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الحج : باب نقض الكعبة (۱۳۳۳)]

سوچتے رہے پھر کہنے لگے کاش کہ میں اسے یونہی چھوڑ دیتا۔ (۱) صحیح مسلم شریف کی ایک اور حدیث میں ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ایک مرتبہ طواف کرتے ہوئے حضرت عبداللہ کو کوس کر کہا کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر اس حدیث کا بہتان باندھتا تھا تو حضرت حارث رحمہ اللہ نے روکا اور شہادت دی کہ وہ سچے تھے میں نے بھی حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ سنا ہے اب عبدالملک افسوس کرنے لگے اور کہنے لگے اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو میں ہرگز اسے نہ توڑتا۔ (۲) قاضی عیاض اور امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا تھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں پھر کعبہ کو حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے بنائے ہوئے کے مطابق بنا دوں' امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا آپ ایسا نہ کیجیے ایسا نہ ہو کہ کعبہ بادشاہوں کا ایک کھلونا بن جائے جو آئے اپنی طبیعت کے مطابق توڑ پھوڑ کرتا رہے چنانچہ خلیفہ اپنے ارادے سے باز رہے یہی بات ٹھیک بھی معلوم ہوتی ہے کہ کعبہ کو بار بار چھیڑنا ٹھیک نہیں۔

بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کعبہ کو دو چھوٹی پنڈلیوں والا ایک حبشی پھر خراب کرے گا۔ (۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں گویا میں اسے دیکھ رہا ہوں وہ سیاہ فام ایک ایک پتھر الگ الگ کر دے گا (۴) اس کا غلاف لے جائے گا اور اس کا خزانہ بھی۔ وہ ٹیڑھے ہاتھ پاؤں والا اور گنجا ہوگا میں دیکھ رہا ہوں کہ گویا وہ کدال بجا رہا ہے اور برابر ٹکڑے کر رہا ہے (۵) غالباً یہ ناشدنی واقعہ (جس کے دیکھنے سے ہمیں محفوظ رکھے) یاجوج ماجوج کے نکل چکنے کے بعد ہوگا۔

صحیح بخاری شریف کی ایک حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تم یاجوج ماجوج کے نکلنے کے بعد بھی بیت اللہ شریف کا حج وعمرہ کرو گے۔ (۶)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی دعا میں کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمان بنا لے یعنی مخلص بنا لے مطیع بنا لے موحد بنا' شرک سے بچا۔ ریاکاری سے محفوظ رکھ خشوع وخضوع عطا فرما۔ حضرت سلام بن ابی مطیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں مسلمان تو تھے ہی لیکن اسلام کی ثابت قدمی طلب کرتے ہیں جس کے جواب میں ارشاد باری ہوا ﴿قَدْ فَعَلْتُ﴾ میں نے تمہاری یہ دعا قبول فرمائی پھر اپنی اولاد کے لیے بھی یہی دعا کرتے ہیں جو قبول ہوتی ہے بنی اسرائیل بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں ہیں اور عرب بھی قرآن میں ہے ﴿وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ﴾ (الاعراف ۱۵۹) یعنی موسیٰ کی قوم میں ایک جماعت حق وعدل پر تھی لیکن روانی عبارت سے معلوم ہوتا

---

(۱) [صحیح : مسلم (أیضا) مسند احمد (٦/٢٥٣-٢٦٢)]

(۲) [صحیح : صحیح مسلم : کتاب الحج : باب نقض الکعبة (١٣٣٣)]

(۳) [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الحج : باب هدم الکعبة (١٥٩١) صحیح مسلم : کتاب الفتن : باب لا تقوم الساعة حتی یمرا لرجل (٢٩٠٩)]

(۴) [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الحج : باب هدم الکعبة (١٥٩٥)]

(۵) [صحیح بالشواهد : مسند احمد (٢/٢٢٠)، (٧٠٥٣)]

(۶) [صحیح : صحیح بخاری : کتاب الحج : باب قول الله تعالی جعل الله الکعبة البیت الحرام (١٥٩٣) مسند احمد (٣/٢٧-٦٤)]

ہے کہ عرب کے لیے یہ دعا ہے گو عام طور پر دوسروں پر بھی مشتمل ہو اس لیے کہ اس کے بعد دوسری دعا میں ہے کہ ان میں ایک رسول بھیج اور اس رسول سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں چنانچہ یہ دعا بھی پوری ہوئی جیسے فرمایا ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (الجمعة/ ٢) لیکن اس سے آپ ﷺ کی رسالت خاص نہیں ہوتی بلکہ آپ ﷺ کی رسالت عام ہے عرب عجم سب کے لیے جیسے ﴿قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾ (اعراف/ ١٥٨) کہہ دو کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

ان دونوں نبیوں کی یہ دعا جیسی ہے ایسی ہی ہر متقی کی دعا ہونی چاہیے۔ جیسے قرآنی تعلیم ہے کہ مسلمان یہ دعا کریں ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا﴾ (فرقان/ ٧٤) اے ہمارے رب ہمیں، ہماری بیویوں اور اولادوں سے ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کی دلیل ہے کہ انسان یہ چاہے کہ میری اولاد میرے بعد بھی اللہ کی عابد رہے۔ اور جگہ اس دعا کے الفاظ یہ ہیں ﴿وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ (ابراهیم/ ٣٥) اے اللہ مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں انسان کے مرتے ہی اس کے اعمال ختم ہو جاتے ہیں مگر تین کام جاری رہتے ہیں صدقہ، علم جس سے نفع حاصل کیا جائے اور نیک اولاد جو دعا کرتی رہے (مسلم) [1] پھر آپ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں مناسک دکھا یعنی احکام حج و ذبح وغیرہ سکھا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کو لے کر کعبہ کی عمارت پوری ہو جانے کے بعد صفا پر آتے ہیں پھر مروہ پر جاتے ہیں اور فرماتے ہیں یہ شعائر اللہ ہیں پھر منیٰ کی طرف لے چلے عقبہ پر شیطان درخت کے پاس کھڑا ہوا ملا تو فرمایا تکبیر پڑھ کر اسے کنکر مارو۔ ابلیس یہاں سے بھاگ کر جمرہ وسطیٰ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں بھی اسے کنکریاں ماریں تو یہ خبیث ناامید ہو کر چلا گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ حج کے احکام میں کچھ دخل دے لیکن موقع نہ ملا اور مایوس ہو گیا یہاں سے آپ ﷺ کو مشعر الحرام میں لائے پھر عرفات میں پہنچایا پھر تین مرتبہ پوچھا کہو سمجھ لیا۔ آپ نے فرمایا ہاں [2] دوسری روایت میں تین جگہ شیطان کو کنکریاں مارنی مروی ہیں اور ہر شیطان کو سات سات کنکریاں ماری ہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿١٢٩﴾ ع ١٥

اے ہمارے رب ان میں انہی میں سے رسول بھیج جو ان کے پاس تیری آیتیں پڑھے انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے۔ یقیناً تو غلبہ والا اور حکمت والا ہے ○

بعثت محمد ﷺ دعائے ابراہیم علیہ السلام کا نتیجہ: اہل حرم کے لیے یہ دعا بھی ہے کہ آپ کی اولاد میں سے ہی رسول ان

---

[1] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الوصیة: باب ما یلحق الانسان من الثواب بعد وفاته (١٦٣١) نسائی: کتاب الوصایا: باب فضل الصدقة عن المیت (٣٦٨١) ترمذی: کتاب الاحکام: باب ما جاء فی الوقف (١٣٧٦) مسند احمد (٣٧٢/٢)]

[2] [تفسیر ابن ابی حاتم (٣٨٧/١)]

میں آئے چنانچہ یہ بھی پوری ہوئی۔ مسند احمد ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ”میں اللہ جل شانہ کے نزدیک آخری نبی اس وقت سے ہوں جبکہ آدم ابھی مٹی کی صورت میں تھے“ میں تمہیں اپنا ابتدائی امر بتاؤں ”میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں اور اپنی ماں کا خواب ہوں۔“ انبیاء علیہم السلام کی والدہ کو ایسے ہی خواب آتے ہیں۔[1] ابوامامہ رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ یارسول اللہ ﷺ اپنی نبوت کا شروع تو ہمیں بتایئے آپ نے فرمایا ”میرے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور میری خوشخبری جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی اور میری ماں نے دیکھا کہ گویا ان میں سے ایک نور نکلا' جس نے شام کے محل چمکا دیئے۔“[2] مطلب یہ ہے کہ دنیا میں شہرت کا ذریعہ یہ چیزیں ہوئیں۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا خواب بھی عرب میں پہلے ہی مشہور ہو گیا تھا اور وہ کہتے تھے کہ بطن آمنہ سے کوئی بڑا شخص پیدا ہوگا بنی اسرائیل کے نبیوں کے ختم کرنے والے حضرت روح اللہ علیہ السلام نے تو بنی اسرائیل میں خطبہ پڑھتے ہوئے آپ ﷺ کا صاف نام بھی لے دیا اور فرمایا لوگو میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں' مجھ سے پہلے کی کتاب توراۃ کی میں تصدیق کرتا ہوں اور میرے بعد آنے والے نبی کی میں تمہیں بشارت دیتا ہوں جن کا نام احمد ہے[3] (ﷺ) اسی کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے' خواب میں نور سے شام کے محلات کا چمک اٹھنا اشارہ ہے' اس امر کی طرف کہ دین وہاں جم جائے گا۔

بلکہ روایتوں سے ثابت ہے کہ آخر زمانہ میں شام اسلام اور اہل اسلام کا مرکز بن جائے گا۔ شام کے مشہور شہر دمشق ہی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرقی سفید مینارہ پر نازل ہوں گے۔ بخاری و مسلم میں ہے ”میری امت کی ایک جماعت حق پر قائم رہے گی' ان کے مخالفین انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں گے یہاں تک کہ امر اللہ آجائے۔“[4] صحیح بخاری میں اتنی زیادتی اور ہے کہ ”وہ شام میں ہوں گے۔“[5] ابوالعالیہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ یہ بھی اسی مقبول دعا کا ایک حصہ ہے کہ اور یہ پیغمبر ﷺ آخر زمانہ میں مبعوث ہوں گے۔ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت و حدیث ہے۔

---

[1] [ضعیف : مسند احمد (٤/١٢٧۔ ١٢٨) طبرانی کبیر (٢٥٢/١٨) مستدرك حاكم (٢/ ٦٠٠)] امام ابن حبان، امام حاکم اور امام ذہبی نے اسے صحیح کہا ہے۔ شیخ البانی اسے ضعیف کہتے ہیں۔ [ضعيف الجامع الصغير (٢٠٩١)] شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس نے اسے ضعیف کہا ہے۔ تاہم حافظ زبیر علی زئی اس کی سند کو حسن کہتے ہیں اور مولانا مبشر احمد ربانی نے اسے صحیح کہا ہے۔]

[2] [صحيح لغيره : طيالسی (١١٤٠) مسند احمد (٢٦٢/٥) ابن سعد (١٠٢/١) طبرانی (٧٧٢٩)] امام ہیثمی نے فرمایا ہے کہ احمد کی سند حسن ہے اور اس کے شواہد بھی ہیں جو اسے تقویت پہنچاتے ہیں۔ [مجمع الزوائد (٢٢٢/٨)] شیخ شعیب ارناؤوط نے اسے صحیح لغیرہ کہا ہے۔ [مسند احمد محقق (١٧١٦٣)] حافظ زبیر علی زئی نے اسے سابقہ شاہد کی وجہ سے حسن کہا ہے۔ شیخ مصطفیٰ السید، شیخ رشاد، شیخ عجماوی، شیخ علی احمد اور شیخ حسن عباس فرماتے ہیں کہ اس کی سند فرج بن فضالہ راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔]

[3] [سورة الصف : آيت ٦]

[4] [صحيح : صحيح بخاری : كتاب التوحيد : باب انما قولنا لشيء اذا اردنه (٧٤٦٠) صحيح مسلم : كتاب الطهارة : باب لا تزال طائفة (١٠٣٧)]

[5] [صحيح : صحيح بخاری : كتاب المناقب (٣٦٤١)]

حسن اور قتادہ اور مقاتل بن حیان اور ابو مالک رحمہم اللہ وغیرہ کا یہی فرمان ہے [1] اور حکمت سے مراد دین کی سمجھ بوجھ بھی ہے۔ پاک کرنا۔ یعنی طاعت واخلاص سکھانا' بھلائیاں کرانا' برائیوں سے بچانا' اطاعت الٰہی کر کے رضائے رب حاصل کرنا' نافرمانی سے بچ کر ناراضگی سے محفوظ رہنا۔ اللہ عزیز ہے جسے کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی جو ہر چیز پر غالب ہے وہ حکیم ہے یعنی اس کا کوئی قول وفعل حکمت سے خالی نہیں' وہ ہر چیز کو اپنے محل پر ہی حکمت وعدل وعلم کے ساتھ رکھتا ہے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ
وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ
الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾

دین ابراہیمی سے وہی بے رغبتی کرے گا جو محض بیوقوف ہو۔ ہم نے تو اسے دنیا میں بھی برگزیدہ کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ نیک کاروں سے تھا○ جب کبھی انہیں ان کے رب نے کہا مان لے انہوں نے کہا میں نے رب العالمین کی مان لی○ اسی کی وصیت ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو کی کہ اے ہمارے بچو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند فرما لیا ہے۔ خبردار تم مسلمان ہی مرنا○

مشرکین کی تردید: ان آیتوں میں بھی مشرکین کی تردید ہے کہ جو اپنے آپ کو دین ابراہیمی پر بتاتے تھے حالانکہ کامل مشرک تھے جبکہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام تو موحدوں کے امام تھے۔ توحید کو شرک سے ممتاز کرنے والے تھے عمر بھر میں ایک آنکھ جھپکنے کے برابر بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا بلکہ ہر مشرک سے اور ہر قسم کے شرک سے اور ہر غیر اللہ سے جو اللہ مانا جاتا ہو وہ دل سے نفرت کرتے تھے اور ان سب سے بیزار تھے۔ اسی بنا پر قوم سے الگ ہوئے وطن چھوڑا بلکہ باپ تک کی مخالفت کی پرواہ نہ کی اور صاف کہہ دیا کہ ﴿اِنِّىْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ﴾ (الانعام/۷۸-۷۹) میں بیزار ہوں' اس چیز سے جسے تم شریک کرتے ہو میں نے تو یکسو ہو کر اپنی تمام تر توجہ اس پاک ذات کی طرف کر دی ہے' جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے' میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں۔ اور فرمایا کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے معبودوں سے بری ہوں میں تو اپنے خالق ہی کا گرویدہ ہوں' وہی مجھے راہ راست دکھائے گا۔ [2] اور جگہ ہے ﴿مَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ﴾ [3] الخ ابراہیم نے اپنے والد کے لیے بھی صرف ایک وعدے کی بنا پر استغفار کی تھی لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے۔ ابراہیم بڑے ہی رجوع کرنے والے اور بردبار تھے۔

اور جگہ ہے ابراہیم مخلص اور مطیع امت تھے مشرک ہرگز نہ تھے رب کی نعمتوں کے شکر گزار تھے' اللہ رب کعبہ کے پسندیدہ تھے اور راہ راست پر لگے ہوئے تھے' دنیا کے بھلے لوگوں میں سے تھے اور آخرت میں بھی صالح لوگوں

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۹۰)]
[2] [سورۃ الزخرف : آیت ۲۶-۲۷]
[3] [سورہ توبہ : آیت ۱۱۴]

میں ہوں گے۔ [1] ان آیتوں کی طرح یہاں بھی فرمایا کہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بے تدبیر اور گمراہ لوگ ہی ملت ابراہیمی کو ترک کرتے ہیں کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ نے ہدایت کے لیے چن لیا تھا اور بچپن سے ہی توفیق حق دے رکھی تھی، خلیل جیسا معزز خطاب انہی کو دیا گیا۔ وہ آخرت میں بھی سعید بخت لوگوں میں ہیں۔ ان کے مسلک وملت کو چھوڑ کر ضلالت وگمراہی میں پڑنے والے سے زیادہ بیوقوف اور ظالم اور کون ہوگا؟'' اس آیت میں یہودیوں کا بھی رد ہے۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا﴾ (ال عمران / ٦٧-٦٨) الخ ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی، نہ مشرک بلکہ موحد مسلمان اور مخلص تھے ان سے دوستی رکھنے والے صرف وہی ہیں جو ان کے فرماں بردار ہوئے اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان دار اللہ بھی مومنوں کا ولی ہے، جب کبھی اللہ فرماتا کہ یہ مان لو وہ جواب دیتے کہ اے رب العالمین میں نے مان لیا، اسی ملت وحدانیت کی وصیت ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو بھی کی۔ "ھا" کی ضمیر کا مرجع یا تو ملت ہے یا کلمہ۔

ملت سے مراد اسلام اور کلمہ سے مراد ﴿اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ہے۔ دیکھئے ان کے دل میں اسلام کی کس قدر محبت وعزت تھی کہ خود بھی اس پر مدت العمر عامل رہے، اپنی اولاد کو بھی اسی کی وصیت کی۔ اور جگہ ہے ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ﴾ (الزخرف / ٢٨) ہم نے اس کلمہ کو ان کی اولاد میں بھی باقی رکھا' بعض سلف نے "وَيَعْقُوْبَ" بھی پڑھا تو "بَنِيْهِ" پر عطف ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ خلیل اللہ نے اپنی اولاد کو اور اولاد کی اولاد میں سے حضرت یعقوب علیہ السلام کو جو اس وقت موجود تھے دین اسلام کی استقامت کی وصیت کی۔ قشیری رحمہ اللہ کہتے ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے تھے، لیکن یہ مجرد دعویٰ ہے، جس پر کوئی صحیح دلیل نہیں۔ واللہ اعلم۔ بلکہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں پیدا ہوئے تھے کیونکہ قرآن پاک کی آیت میں ﴿فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ (ھود / ٧١) یعنی ہم نے انہیں اسحاق کی اور اسحاق کے پیچھے یعقوب کی خوشخبری دی۔ اور اس کا نصب خفض کو ہٹا کر بھی پڑھا گیا ہے پس اگر حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں موجود نہ ہوں تو پھر ان کا نام لینے میں کوئی زبردست فائدہ باقی نہیں رہتا۔ سورۂ عنکبوت میں بھی ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق و یعقوب علیہما السلام عطا فرمایا اور اس کی اولاد میں ہم نے نبوت وکتاب دی [2] اور آیت میں ہے ہم نے اسے اسحاق دیا اور یعقوب زائد عطا فرمایا۔ [3] ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب حضرت ابراہیم کی زندگی میں ہی تھے اگلی کتابوں میں بھی ہے کہ وہ بیت المقدس میں آئیں گے۔

ابوذر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ پوچھتے ہیں یارسول اللہ کون سی مسجد پہلے تعمیر کی گئی؟ آپ نے فرمایا مسجد حرام پوچھا پھر فرمایا مسجد بیت المقدس میں نے کہا دونوں کے درمیان کس قدر مدت تھی؟ فرمایا چالیس سال الخ۔ [4] ابن حبان

---

[1] [سورۃ النحل : آیت ١٢٠ ـ ١٢٢] [2] [سورۃ العنکبوت : آیت ٢٧] [3] [سورۃ الانبیآء : آیت ٧٢]

[4] [صحیح : صحیح بخاری : کتاب احادیث الانبیاء (٣٣٦٦) ، (٣٤٢٥) صحیح مسلم : کتاب المساجد ومواضع الصلوۃ (٥٢٠) نسائی : کتاب المساجد (٦٩١) ابن ماجہ : کتاب المساجد (٧٥٣) مسند احمد (٥/ ١٥٠)]

نے کہا کہ ”حضرت ابراہیم اور حضرت سلیمان ﷺ کی درمیانی مدت سے متعلق یہ بیان ہے“ حالانکہ قول بالکل الٹ ہے۔ ان دونوں نبیوں کے درمیان تو ہزاروں سال کی مدت تھی بلکہ مطلب حدیث کا کچھ اور ہی ہے اور شاہ زماں حضرت سلیمان علیہ السلام تو اس مسجد کے مجدد نہ تھے موجد نہ تھے۔ اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی وصیت کی تھی، جیسے عنقریب ذکر آئے گا۔ وصیت اس امر کی ہوتی ہے جب تک زندہ رہو مسلمان ہو کر رہو تا کہ موت بھی اسی پر آئے۔

جن اعمال پر زندگی انہی پر موت: عموماً انسان زندگی میں جن اعمال پر رہتا ہے، اسی پر موت بھی آتی ہے اور جس پر مرتا ہے، اس پر اٹھے گا بھی۔ یہی اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ بھلائی کے قصد کرنے والے کو بھلائی کی توفیق بھی دی جاتی ہے۔ بھلائی اس پر آسان بھی کر دی جاتی ہے اور اسے ثابت قدم بھی رکھا جاتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ حدیث میں یہ بھی ہے کہ انسان جنتیوں کے کام کرتے کرتے جنت میں ایک ہاتھ دور رہ جاتا ہے کہ اس کی تقدیر اس پر غالب آتی ہے اور وہ جہنمیوں کے کام کر کے جہنمی بن جاتا ہے اور کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہے [1] لیکن اس سے مطلب یہ ہے کہ یہ کام اچھے برے ظاہری ہوتے ہیں، حقیقی نہیں ہوتے۔ چنانچہ بعض روایات میں یہ لفظ بھی ہیں [2] قرآن کہتا ہے سخاوت، تقویٰ اور ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ کی تصدیق کرنے والے کو ہم آسانی کا راستہ آسان کر دیتے ہیں اور بخل و بے پرواہی اور بھلی بات کی تکذیب کرنے والوں کے لیے ہم سختی کی راہ آسان کر دیتے ہیں۔ [3]

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ
بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ښ
وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا
تُسْــَٔـلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

کیا حضرت یعقوب کے انتقال کے وقت تم موجود تھے جب انہوں نے اپنی اولاد کو کہا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ تو سب نے جواب دیا کہ آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادوں ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی جو معبود ایک ہی ہے ہم اسی کے فرمانبردار رہیں گے ○ یہ جماعت تو گذر چکی جو انہوں نے کیا وہ ان کے لیے ہے اور جو تم کرو گے تمہارے لیے ہے، ان کے اعمال سے نہ پوچھے جاؤ گے ○

عبادت کا اکیلا حقدار اللہ عزوجل: مشرکین عرب پر جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے اور کفار بنی اسرائیل پر جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد تھے دلیل لاتے ہوئے اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے تو اپنی اولاد کو اپنے آخری وقت میں بھی اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کی وصیت کی تھی ان سے پہلے تو پوچھا کہ تم

---

[1] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب القدر (٦٥٩٤) و کتاب التوحید (٧٤٥٤) صحیح مسلم: کتاب القدر: باب کیفیة خلق الآدمی (٢٦٤٣) مسند احمد (١/٣٨٢)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب الجهاد: باب لا یقال فلان شهید (٢٨٩٨) صحیح مسلم: کتاب الایمان: باب بیان غلظ تحریم قتل الانسان (١١٢) مسند احمد (٥/٣٣٥)]

[3] [سورة اللیل: آیت ٥۔١٠]

میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ سب نے جواب دیا کہ آپ کے اور آپ کے بزرگوں کے معبود برحق کی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام کے لڑکے اور حضرت اسحاق علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا نام باپ دادوں کے ذکر میں بطور تغلیب کے آ گیا ہے کیونکہ آپ چچا ہوتے ہیں اور یہ بھی واضح رہے کہ عرب میں چچا کو بھی باپ کہہ دیتے ہیں۔ [1]

اس آیت سے استدلال کر کے دادا کو بھی باپ کے حکم میں رکھ کر دادا کی موجودگی میں بہن بھائی کو ورثہ سے محروم کیا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہی ہے جیسے کہ صحیح بخاری شریف میں موجود ہے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مذہب بھی یہی ہے۔ حسن بصری طاؤس اور عطا رحمہم اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بہت سے سلف وخلف رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ اور ایک مشہور روایت میں امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ وہ بھائیوں بہنوں کو بھی وارث قرار دیتے ہیں۔ حضرت عمر حضرت عثمان حضرت علی حضرت ابن مسعود حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور سلف وخلف رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا مذہب بھی یہی ہے۔ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ اور محمد بن حسن رحمہ اللہ بھی یہی کہتے ہیں اور یہ دونوں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد رشید ہیں اس مسئلہ کی صفائی کا یہ مقام نہیں اور نہ تفسیر کا یہ موضوع ہے۔

ان سب بچوں نے اقرار کیا کہ ہم ایک ہی معبود کی عبادت کریں گے یعنی اس اللہ کی الوہیت میں کسی کو شریک نہ کریں گے اور ہم اس کی اطاعت گزاری فرمانبرداری اور خشوع وخضوع میں مشغول رہا کریں گے۔ جیسے اور جگہ ہے ﴿وَلَهُ أَسْلَمَ﴾ (ال عمران / ۸۳) الخ زمین وآسمان کی ہر چیز خوشی اور ناخوشی سے اس کی مطیع ہے اس کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین یہی اسلام رہا ہے اگرچہ احکام میں اختلاف رہا ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿وَمَآ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا نُوْحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیاء / ۲۵) یعنی تجھ سے پہلے جتنے رسول ہم نے بھیجے سب کی طرف وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تم سب میری ہی عبادت کرتے رہو۔ اور آیتیں بھی اس مضمون کی بہت سی ہیں اور احادیث میں بھی یہ مضمون بکثرت وارد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "ہم علاتی بھائی ہیں ہمارا دین ایک ہے" [2] پھر فرماتا ہے یہ امت جو گذر چکی تمہیں ان کی طرف نسبت نفع نہ دے گی ہاں اگر عمل ہوں تو اور بات ہے ان کے اعمال ان کے ساتھ اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ تم ان کے افعال کے بارے میں نہیں پوچھے جاؤ گے۔ حدیث شریف میں ہے جس کا عمل اچھا نہ ہوگا اس کا نسب اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ [3]

---

[1] [تفسیر قرطبی (۲/۱۳۸)]

[2] [صحیح: صحیح بخاری: کتاب احادیث الانبیاء: باب قول اللہ تعالی ﴿واذکر فی الکتاب مریم﴾ (۳۴۴۳) صحیح مسلم: کتاب الفضائل (۲۳۶۵) مسند احمد (۲/۳۱۹)]

[3] [صحیح: صحیح مسلم: کتاب الذکر والدعاء: باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن (۲۶۹۹) مسند احمد (۲/۲۵۲)]

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

یہ کہتے ہیں یہود ونصاریٰ بن جاؤ تو راہ پاؤ گے تم کہو بلکہ ملت ابراہیمی والے ہیں اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) مشرک نہ تھے ○

عبداللہ بن صوریا اعور نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ ہدایت پر ہم ہیں تم ہماری مانو تو تمہیں بھی ہدایت ملے گی۔ نصرانیوں نے بھی یہی کہا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی (۱) کہ ہم تو ابراہیم حنیف علیہ السلام کے متبع ہیں جو استقامت والے اخلاص والے حج والے بیت اللہ کی طرف منہ کرنے والے استطاعت کے وقت حج کو فرض جاننے والے اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے تمام رسولوں پر ایمان لانے والے لَآ اِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ کی شہادت دینے والے ماں بیٹی خالہ پھوپھی کو حرام جاننے والے اور تمام حرام کاریوں سے بچنے والے تھے۔ حنیف کے یہ سب معانی مختلف حضرات نے بیان کیے ہیں۔ (۲)

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

(اے مسلمانو) تم سب کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر بھی جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو چیز ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور جو کچھ اللہ کی جانب سے موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے انبیاء دیئے گئے۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان جدائی نہیں ڈالتے ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں

اہل کتاب کی تصدیق یا تکذیب: اللہ تعالیٰ اپنے ایماندار بندوں کو ارشاد فرماتا ہے کہ جو کچھ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر اترا اس پر تو وہ تفصیل وار ایمان لائیں اور جو آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام پر اترا' اس پر بھی اجمالاً ایمان لائیں۔ ان اگلے انبیاء علیہم السلام میں سے بعض کے نام بھی لے دیئے اور باقی نبیوں کا مجمل ذکر کر دیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ یہ کسی نبی کے درمیان تفریق نہ کریں کہ ایک کو مانیں اور دوسرے سے انکار کر جائیں جو عادت اوروں کی تھی کہ وہ انبیاء علیہم السلام میں تفریق کرتے تھے' کسی کو مانتے تھے' کسی سے انکاری تھے' یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور نصرانی محمد ﷺ کو' حجازی عرب موسیٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام اور محمد ﷺ تینوں کو نہیں مانتے تھے۔ ان سب کو فتویٰ ملا کہ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ (۳) یہ لوگ بالیقین کافر ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''اہل کتاب توراۃ کو عبرانی میں پڑھتے تھے اور عربی میں تفسیر کر کے اہل اسلام کو سناتے تھے۔'' نبی ﷺ نے فرمایا کہ اہل کتاب کی سچائی یا

(۱) [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۹۶)] (۲) [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۳۹۷)]

(۳) [سورہ النساء: آیت ۱۵۱]

تکذیب نہ کرو۔ کہہ دیا کرو (۱) اللہ پر اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ہمارا ایمان ہے۔ (۲) نبی ﷺ صبح کی دو سنتوں میں پہلی رکعت میں یہ آیت ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ پوری آیت اور دوسری رکعت میں آیت ﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ (ال عمران / ۵۲) پڑھا کرتے تھے۔ (۳)

﴿اَسْبَــــاط﴾ حضرت یعقوب کے بیٹوں کو کہتے ہیں، جو بارہ تھے، جن میں سے ہر ایک کی نسل میں بہت سے انسان ہوئے، بنی اسماعیل کو قبائل کہتے تھے، اور بنی اسرائیل کو اسباط کہتے تھے۔ (۴) زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پوتے تھے جو ان کے بارہ لڑکوں کی اولاد تھی۔ بخاری میں ہے کہ مراد قبائل بنی اسرائیل ہیں۔ ان میں بھی نبی ہوئے تھے جن پر وحی نازل ہوئی تھی۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ﴿اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ﴾ (المائدہ / ۲۰) الخ اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء علیہم السلام اور بادشاہ بنائے۔ اور جگہ ہے ﴿وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا﴾ (الاعراف / ۱۶۰) ہم نے ان کے بارہ گروہ کر دیئے۔ ”سَبْط“ کہتے ہیں تابع کو، یہ بھی ایک کے پیچھے ایک تھے، بعض کہتے ہیں یہ ماخوذ ہے سَبَطَ سے۔ سَبَطَ کہتے ہیں درخت کو یعنی یہ مثل درخت کے ہیں، جس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کل انبیاء علیہم السلام بنی اسرائیل میں سے ہی ہوئے ہیں سوائے دس کے نوح، ہود، صالح، شعیب، ابراہیم، لوط، اسحاق، یعقوب، اسماعیل، محمد علیہم السلام۔ ”سبــط“ کہتے ہیں اس جماعت اور قبیلہ کو جن کا مورث اعلیٰ اوپر جا کر ایک ہو۔ (۵) ابن ابی حاتم میں ہے ہمیں توراۃ وانجیل پر ایمان رکھنا ضروری ہے لیکن عمل کے لیے صرف قرآن وحدیث ہی ہے۔ ابن ابی حاتم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں توراۃ زبور انجیل پر ایمان رکھو لیکن (عمل کے لیے) صرف قرآن وحدیث کافی ہے۔ (۶)

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ
فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ
صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اگر وہ تم جیسا ایمان لائیں تو راہ پائیں اور اگر منہ موڑیں تو خلاف میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے تجھ کو عنقریب کفایت کرے گا۔ وہ خوب سننے جاننے والا ہے ○ رنگ دیا اللہ نے اپنے رنگ میں اور اللہ سے زیادہ اچھا رنگ کس کا ہوگا۔ ہم تو اسی کی عبادت کرنے والے ہیں ○

---

(۱) [صحیح: صحیح بخاری: کتاب التفسیر سورۃ البقرۃ: باب قولوا آمنا باللہ (۴۴۸۵)]

(۲)(۳) [صحیح مسلم: کتاب صلوۃ المسافرین وقصرھا: باب استحباب رکعتی سنة الفجر (۷۲۷) نسائی: کتاب الافتتاح: باب القراءة فی رکعتی الفجر (۹۴۵) ابو داؤد: کتاب التطوع: باب فی تخفیفھا (۱۲۵۹)]

(۴) [تفسیر ابن ابی حاتم (۳۹۹/۱)] (۵) تفسیر قرطبی (۱۴۱/۲)]

(۶) [ضعیف: تفسیر ابن ابی حاتم (۴۰۰/۱)] اس میں عبداللہ بن ابی حمید راوی منکر الحدیث ہے۔ [میزان (۴۳۰۵)]

صحابہ معیارِ ہدایت: یعنی اپنے ایمان دار صحابیو! اگر یہ کفار بھی تم جیسا ایمان لائیں یعنی تمام کتابوں اور رسولوں کو مان لیں تو حق ورشد ہدایت ونجات پائیں گے اور اگر باوجود قیام حجت کے باز رہیں تو یقیناً حق کے خلاف ہیں۔ اللہ تعالیٰ تجھے ان پر غالب کر کے تمہارے لیے کافی ہوگا' وہ سننے جاننے والا ہے۔ نافع بن ابی نعیم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کسی خلیفہ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن بھیجا گیا زیاد نے یہ سن کر کہا کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے شہید کیا اس وقت یہ کلام اللہ ان کی گود میں تھا اور آپ رضی اللہ عنہ کا خون ٹھیک ان الفاظ پر پڑھا تھا ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ کیا یہ صحیح ہے؟ حضرت نافع رحمہ اللہ نے کہا بالکل ٹھیک ہے میں نے خود اس آیت پر ذوالنورین (رضی اللہ عنہ) کا خون دیکھا تھا [1] رنگ سے مراد دین ہے اور اس کا زبر بطور اغراء کے ہے۔ [2] جیسے "فِطْرَتَ اللّٰهِ" میں۔ [3] مطلب یہ ہے کہ اللہ کے دین کو لازم پکڑ لو اس پر چمٹ جاؤ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ بدل ہے ﴿مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ﴾ سے جو اس سے پہلے موجود ہے۔ سیبویہ کہتے ہیں یہ مصدر موکد ہے۔ ﴿آمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ کی وجہ سے منصوب ہے جیسے ﴿وَعْدَ اللّٰهِ﴾ [4] ایک مرفوع حدیث ہے "بنی اسرائیل نے کہا اے رسول اللہ کیا ہمارا رب رنگ بھی کرتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے ڈرو آواز آئی ان سے کہہ دو کہ تمام رنگ میں ہی تو پیدا کرتا ہوں۔" [5] یہی مطلب اس آیت کا بھی ہے لیکن اس روایت کا موقوف ہونا ہی صحیح ہے اور یہ بھی اس وقت جب کہ اس کی اسناد صحیح ہوں۔

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ ﴿١٣٩﴾ أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٠﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

رکوع

کہہ دو کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو جو ہمارا اور تمہارا رب ہے ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہم تو اسی کے لیے خلوص کرنے والے ہیں۔ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ کہہ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ تعالیٰ؟ اللہ کے پاس کی شہادت چھپانے والے زیادہ ظالم اور کون ہے؟ اللہ تمہارے کاموں سے غافل نہیں۔ یہ امت ہے جو گذر چکی جو انہوں نے کیا ان کے لیے ہے اور جو تم نے کیا تمہارے لیے۔ تم ان کے اعمال سے سوال نہ کیے جاؤ گے۔

مشرکوں سے بیزاری: مشرکوں کے جھگڑے کو دفع کرنے کا حکم رب العالمین اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دے رہا ہے کہ

---

[1] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۴۰۲)] [2] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱/۴۰۲)]
[3] [سورۃ الروم: آیت ۳۰] [4] [سورۃ الروم: آیت ۶]
[5] [تفسیر ابن ابی حاتم (۱۳۲۳)، (۱/۴۰۳) ابو نعیم فی الحلیۃ (۴/۲۷۶)]

''تم ہم سے اللہ کی توحید' اخلاص' اطاعت وغیرہ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ وہ صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ تمہارا رب بھی تو ہے' ہم پر اور تم پر قابض و متصرف بھی وہی اکیلا ہے۔ ہمارے عمل ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے عمل تمہیں کام آئیں گے' ہم تم سے اور تمہارے شرک سے بیزار ہیں۔'' اور جگہ فرمایا ﴿وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ﴾ (یونس / ٤١) الخ یعنی ''اگر یہ تجھے جھٹلائیں تو تو کہہ دے کہ میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے تم میرے (نیک) کام سے اور میں تمہارے اعمال سے بیزار ہوں۔'' اور جگہ ارشاد ہے ﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ﴾ (آل عمران / ٢٠) الخ ''اگر یہ تجھ سے جھگڑیں تو تو کہہ دے میں نے اور میرے ماننے والوں نے اپنے منہ اللہ کی طرف کر دیئے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا ﴿اَتُحَآجُّوْنِّىْ فِى اللّٰهِ﴾ (الانعام / ٨٠) الخ کیا تم اللہ کے بارے میں مجھ سے اختلاف کرتے ہو؟ اور جگہ ہے ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ﴾ (البقرہ / ٢٥٨) تو نے اسے بھی دیکھا جو ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ پس یہاں ان جھگڑالو لوگوں سے کہا گیا کہ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہم تم سے بیزار تم ہم سے الگ۔ ہم عبادت اور توجہ میں اخلاص اور یک سوئی کرنے والے لوگ ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دعوے کی تردید ہو رہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی' نہ نصرانی' تم اے یہودیو اور نصرانیو کیوں یہ باتیں بنا رہے ہو؟ کیا تمہارا علم اللہ سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اللہ نے تو صاف فرما دیا ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (آل عمران / ٦٧) ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے' نہ نصرانی' نہ مشرک' بلکہ خالص مسلمان تھے۔ ان کا حق کی شہادت کو چھپا کر بڑا ظلم کرنا یہ تھا کہ اللہ کی کتاب جو ان کے پاس آئی اس میں انہوں نے پڑھا کہ حقیقی دین اسلام ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سچے رسول ہیں۔ ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب علیہم السلام وغیرہ یہودیت اور نصرانیت سے الگ تھے لیکن پھر نہ مانا اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس بات کو بھی چھپا دیا۔ پھر فرمایا تمہارے اعمال اللہ سے پوشیدہ نہیں' اس کا محیط علم سب چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے' وہ ہر بھلائی اور برائی کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہ دھمکی دے کر پھر فرمایا کہ یہ پاکباز جماعت تو اللہ کے پاس پہنچ چکی۔ تم جب تک ان کے نقش قدم پر نہ چلو گے تو صرف ان کی اولاد میں سے ہونا تمہیں اللہ کے ہاں کوئی عزت اور نفع نہیں دے سکتا ہے۔ ان کے نیک اعمال میں تمہارا کوئی حصہ نہیں اور تمہاری بد اعمالیوں کا ان پر کوئی بوجھ نہیں ''جو کرے سو بھرے'' تم نے جب ایک نبی کو جھٹلایا تو گویا تمام انبیاء علیہم السلام کو جھٹلایا بالخصوص اے وہ لوگو! جو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک زمانہ میں ہو۔ تم تو بڑے ہی وبال میں آ گئے' تم نے اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا جو سید الانبیاء ہیں جو ختم المرسلین ہیں' جو رسول رب العالمین ہیں جن کی رسالت تمام انسانوں اور جنوں کی طرف ہے۔ جن کی رسالت کے ماننے کا ہر ایک شخص مکلّف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بے شمار درود وسلام آپ پر نازل ہوں اور آپ کے سوا تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر بھی۔

الحمدللہ تفسیر ابن کثیر اردو کا پہلا پارہ مکمل ہوا۔